طلسمِ حیات

ماہر القادری

جسے ملک دین محمدؐ نے باہتمام عبد المجید خاں پرنٹر زفیروز پرنٹنگ ورکس ۱۱۹ سرکلر روڈ
میں طبع کرا کر کشمیری بازار لاہور سے شائع کیا۔

بار اول

قیمت دو(۲) روپے آٹھ(۸) آنے (عہ)

پبلشرز

ملک دین محمد اینڈ سنز پبلشرز تاجران کتب

مالکان کتب خانہ دین محمدی و دین محمدی الیکٹرک پریس

لاہور

فہرستِ مضامین

صفحہ نمبر	مضامین	نمبر شمار
۹	دیوانہ ہو گیا ہوں کہ دیوانہ کر دیا"	۱
۳۱	"نظر فریب چہرے"	۲
۵۳	"گھبراہٹ"	۳
۸۱	"گاؤں کی دُنیا"	۴
۱۲۳	"خوش مزاج افتخار"	۵
۱۸۹	"ارکان خمسہ"	۶
۲۲۷	"شہیدِ محبت"	۷
۲۴۹	"افسانوں کی تلاش"	۸
۲۸۳	"عاشقی سے توبہ"	۹
۳۱۱	"فریبِ تفریح"	۱۰
۳۴۱	"شرافت"	۱۱
۳۸۷	"سچائی کا ایک دن"	۱۲

تعارف

حضرت ماہر القادری کی ادبی حیثیت کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے، اردو دنیا میں وہ غیر فانی شہرت کے مالک ہیں، میری یہ چند سطریں ان کی شہرت میں کوئی اضافہ نہیں کر سکتیں، اور نہ ان سے اس کتاب کی قدر و منزلت کچھ بڑھ جاتی ہے، ان سطور کے لکھنے سے ماہر صاحب کی تحریر کی ان خصوصیات کی طرف اشارہ کرنا میرا مقصد ہے، جو ان کے تخیل اور آرٹ کا محور اصلی ہیں، اور جن کے بغیر غالباً وہ خود اپنی ہر تحریر کو نامکمل اور تشنہ سمجھینگے۔

جناب ماہر القادری اُن شاعروں اور ادیبوں میں نہیں ہیں، جن کا آرٹ صرف آرٹ کے لئے ہی ہوتا ہے، اور لکھنے سے پہلے اپنے ذہن میں کوئی مفہوم یا مقصد متعین نہیں کر لیتے، آپ کو اس مجموعے میں ادبی، سماجی، اخلاقی سبھی طرح کے افسانے ملینگے، اور ہر افسانے میں کوئی نہ کوئی پیام یا مقصد پنہاں نظر آئیگا، اگر آپ ان کے افسانوں کا اور انکے کرداروں کا نفسیاتی تجزیہ کریں، تو آپ کو معلوم ہوگا، کہ ان میں کچھ اس قسم کا تاثر ہے، کہ پڑھنے والے کی رُوح غیر شعوری طور پر ان کے مرکزی تخیل سے ہم آہنگ ہو جاتی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ ماہر صاحب کہیں کہیں لکھتے وقت تخیل کے دھارے کو بالکل آزاد چھوڑ دیتے ہیں، اور فن کی بندشوں کو اس میں مزاحم ہونے نہیں دیتے، لیکن اُن کی یہی آزاد نگاری نگارش کا کمال ہے، ممکن ہے کہ بعض سخت نقاد اس کو فنِ افسانہ نویسی

کی فروگزاشتوں میں شمار کریں، اور تخیل کی اس پرواز کو جو کبھی کبھی افسانے کے مرکزی تخیل کو پس پشت ڈال دیتی ہے، ناجائز قرار دیں، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس قسم کا اعتراض کرنا آرٹسٹ کی طبیعت پر ظلم کرنا ہے، آپ جانتے ہیں کہ جہاں سچے تاثرات اور جذبات ہوتے ہیں وہاں ضابطوں کا یا منطق کا گزر نہیں ہوتا، بہر حال یہ افسانے ہمارے ادب میں ایک قابلِ قدر اضافہ ہیں، اور ان میں ہماری معاشرت اور ہمارے اخلاق کی بہبود کے بہت سامان ہیں۔

اقوام کی تعمیر حیات میں افسانوی ادب کا کیا درجہ ہوتا ہے اور اس سے کیا کیا کام لئے جاتے ہیں، ان کی تشریح کا یہاں موقع نہیں ہے، مختصر یہ ہے کہ دنیا کی اکثر انقلابی تحریکوں کی بنیادیں افسانوی ادب پر رکھی گئی ہیں، انقلاب فرانس اور انقلاب روس میں پوری قوم کے رجحان کو بدل دینے میں افسانوں سے بیش بہا مدد ملی ہے لیکن ہمیشہ میکسم گورکی کو اپنا دستِ راست تصور کرتا تھا، اور حقیقت یہ ہے کہ انسانوں کا غریب طبقہ اپنے احساس بیداری کیلئے ہمیشہ اس بے مثل افسانہ نگار کا ممنون منت رہے گا۔

ہم جناب ماہر القادری کے شکر گزار ہیں، کہ انہوں نے اپنے شگفتہ اسلوب نگارش میں ہمارے معاشرے کی ایک بڑی ضرورت کی طرف توجہ کی اور ایسے افسانے لکھے جو ہر طرح تعمیری کہلائے جانے کے مستحق ہیں، ان مختصر سطور میں ان کے پورے محاسن پر روشنی ڈالنا میرے امکان سے باہر ہے، اس لئے میں اس کو ناظرین کے ذوق پر چھوڑتا ہوں +

عبدالرحمٰن شوق امرتسری

مدیر عارف لاہور

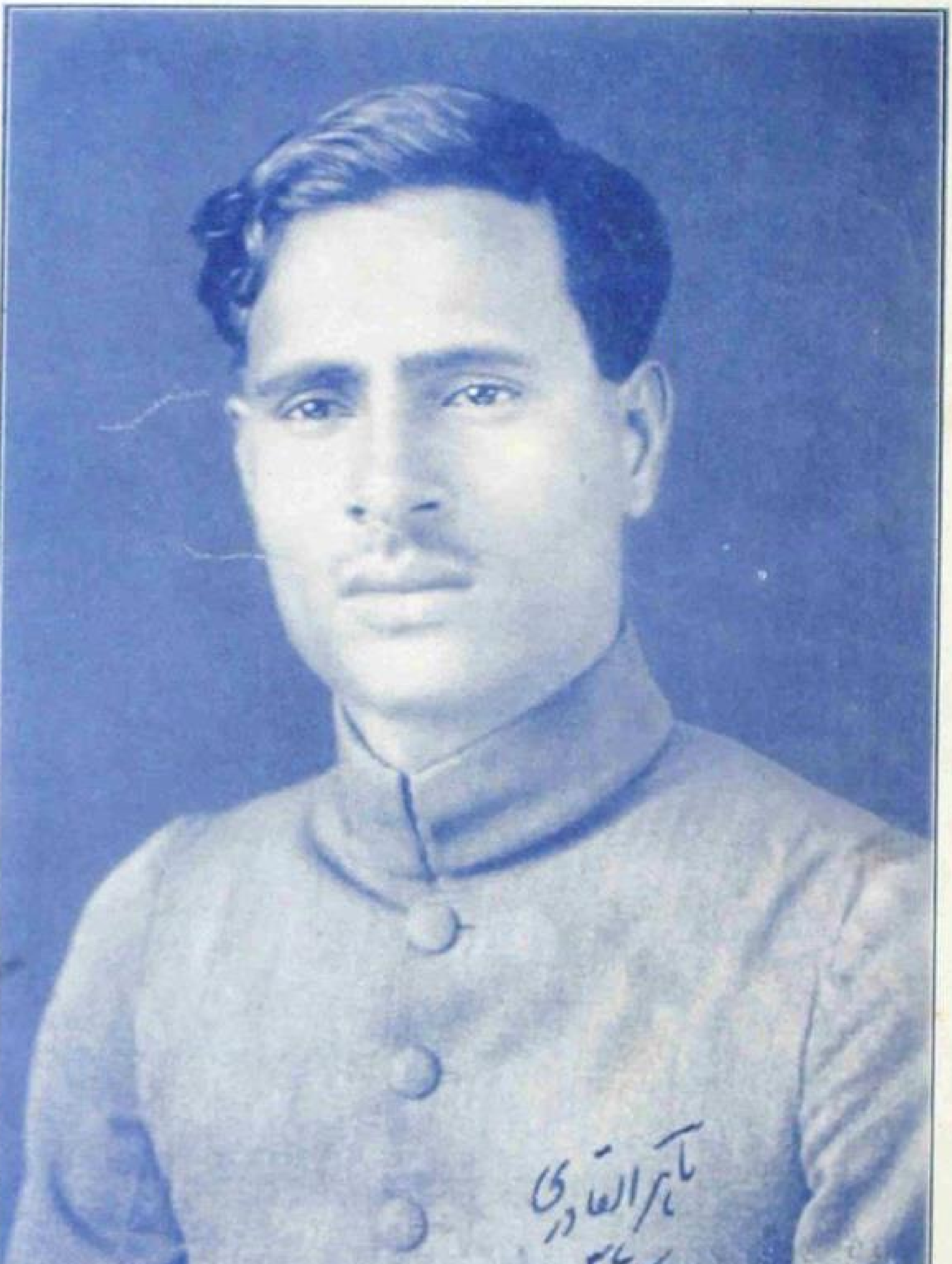
ماہر القادری

دیوانہ ہو گیا ہوں کہ دیوانہ کر دیا

حورِ جنت جلوہ بر زاہد کند در راہِ دوست
اندک اندک عشق در کار آورد دیوانہ را

دیوانگی کے جراثیم ہر شخص میں موجود ہوتے ہیں،
اور ہر دماغ غیر متوازن بننے کی صلاحیت
رکھتا ہے۔

مگر دُنیا
خود نگر اور خود پرست واقع ہوئی ہے۔

وہ اپنی
کمزوری کا اعتراف مشکل ہی سے کرتی ہے۔

دیوانہ ہوگیا ہوں کہ دیوانہ کردیا

"تم کو پینلٹی (PENALTY) کے ساتھ کرایہ
دینا ہوگا" ——— ٹکٹ چیکر نے جھلا کر کہا۔

"پینلٹی تو میں قیامت تک نہیں دوں گا، میں کہہ رہا ہوں کہ آپ گارڈ سے دریافت کر لیجیے۔ اس کو میں نے ٹرین پر سوار ہوتے ہوئے مطلع کر دیا تھا" ——— حکیم نے ترش روئی کے ساتھ جواب دیا۔

"تو ——— پھر ——— اچھا ——— دیکھ ——— لوں ——— گا" ٹکٹ چیکر آہستہ آہستہ کہنے لگا۔

"بابو صاحب! شریف آدمیوں سے ایسی باتیں نہیں کیا کرتے! ذرا ہوش میں آیئے!" کلیم عتاب آمیز نگاہوں کے ساتھ بولا۔

دو تین اسٹیشنوں کے بعد جنکشن آگیا۔ ٹکٹ چیکر، کلیم کو لیکر گارڈ کے پاس پہنچا۔

"کیا ان صاحب (کلیم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) نے آپ کو"

"ٹرین میں سوار ہوتے وقت اطلاع دی تھی ——" ٹکٹ چیکر نے گارڈ سے پوچھا۔

"ایک صاحب نے اطلاع دی تو تھی، لیکن میں"

"یہ یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا، کہ یہی صاحب تھے۔"

"ہاں! اُن کا چہرہ ان سے ملتا جلتا تھا ——" گارڈ نے نہایت سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا۔

"یہ ملتا جلتا چہرہ" کیا بات ہوئی صاف بات"

"کیوں نہیں کہتے۔ گارڈ صاحب! مسافروں سے مذاق"

"اچھا نہیں، ——————" کلیم نے خشمگیں لہجہ میں کہا

"مجھے جو کہنا تھا کہہ چکا، آپ کی خاطر میں جھوٹ"

"نہیں بول سکتا، میں پھر کہتا ہوں کہ"

"آپ ہی جیسے آدمی نے اطلاع دی تھی، لیکن میں"

"قطعیت کے ساتھ یہ نہیں کہہ سکتا، کہ وہ آپ ہی"

"تھے ——————" گارڈ نے جھنڈی کا کپڑا لپیٹتے ہوئے جواب دیا

اس "تو تو میں میں" کو سُن کر بہت سے مسافر اکٹھا ہو گئے، اُن کے تنقیدی فقرے، کتنے دلچسپ تھے

"جب جیب میں پیسہ نہیں تھا، تو ریل میں کیوں بیٹھے تھے"

"بھئی! آجکل کے جنٹلمین، اچھے خاصے اُٹھائی گیرے ہوتے ہیں"

"اجی جب سرکار کی چوری کی ہے تو ڈنڈ بھی بھگتو"

" اُجلے پوشوں سے خدا بچاتا ہی رکھے "

مسافروں کی باتیں سن کر کلیم کے تن بدن میں آگ لگ گئی، ایک آدمی کس کس سے لڑتا، اس نے چپکے سے ٹکٹ چیکر کو کرایہ، معہ جرمانہ کے ادا کر دیا۔

ہاں ہم اتنی سی بات کہنا بھول گئے، کہ ٹرین سے اُترتے وقت، کلیم نے اپنا اسباب قلی کے حوالے کر دیا تھا۔ قلی اسباب لیکر باہر چلا گیا، کلیم کرایہ کے جھگڑے کو چکانے کے بعد، باہر آیا۔ قلی اسباب لئے بیٹھا تھا کلیم نے تانگہ کرایہ کیا، اور قلی سے اسباب رکھنے کے لئے کہا۔ قلی کچھ کسمسانے لگا۔

" تانگہ میں، اسباب کیوں نہیں رکھتے، یہ تم "

" سوچ کیا رہے ہو ——— کلیم نے ڈانٹ کر کہا۔

" ہجور آپ ہی ہیں کیا ——— ؟ ——— " قلی نے ہچکچاتے ہوئے جواب دیا۔

" یہ تم کو ہو کیا گیا ہے۔ آخر کیا کہنا چاہتے ہو " کلیم نے تانگے سے اُترتے ہوئے کہا۔

" کیا یہ آپ ہی کا سامان ہے، اور کیا آپ ہی "

" نے مجھ سے اسباب لیجانے کے لئے کہا تھا ——— " قلی ڈرتے ہوئے بولا۔

" ارے! کیا تو نے بھنگ پی لی ہے، ہیں "

" نے نہیں کہا تھا، تو کیا میرے ہمزاد نے کہا تھا، یہ "

" تجھے مغالطہ کیوں ہو رہا ہے ؟ ——— " کلیم نے اسباب کی طرف دیکھکر کہا۔

" سرکار، دودھ کا جلا چھاچھ پھونک پھونک کر پیتا ہے "

"اسی مہینہ میں ایک ایسا واقعہ ہو چکا ہے کہ اسباب تھا "

"کسی کا، اور لے گیا کوئی اور، وہ تو ہمارے اسٹیشن "

"ماسٹر صاحب اچھے ہیں، جو انہوں نے معاملہ رفع دفع کرا دیا"

"نہیں تو میرے ہاتھوں میں جھنجھنے پڑ گئے تھے ——" قلی نے جواب دیا۔

"ہوا ہو گا، تو مجھے خوب غور سے دیکھ، کیا میں نے ہی "

"تجھ کو ٹرین سے اُتر کر آواز نہیں دی تھی؟ ——" کلیم قلی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔

"حضور! آپ ہی کی صورت کے مسافر نے مجھے آواز "

"دی تھی" وہ آدمی بالکل آپ ہی جیسا تھا۔ یہی قد، یہی "

"ناک نقشہ، مگر دِل کو اطمینان نہیں ہوتا، جب تک "

"ریل گاڑی کے تمام مسافر نہ اُتر لیں، اُس وقت تک میں "

"اسباب لئے بیٹھا رہوں گا، سرکار! میں غریب "

"آدمی ہوں، کوئی جو کھم آ کر پڑی تو میرا تو کہیں ٹھکانا "

"نہیں رہیگا" —— قلی نے سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا۔

کلیم غصہ کے مارے تلملا اُٹھا، اس کی آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے، مگر مصلحت کا خیال کر کے، وہ خاموش کھڑا رہا، ابھی پلیٹ فارم پر اس کا مذاق اڑ چکا تھا۔ قلی سے جھگڑا کر کے، وہ خود کو تماشا

بنانا نہیں چاہتا تھا۔ کوئی ایک گھنٹہ کے بعد قلی کرتہ کا دامن جھاڑ کر کھڑا ہوگیا، اس کے کھڑے ہوتے ہی کلیم نے کہا:۔

"اب تو تمہارا اطمینان ہوگیا"

قلی نے جواب دیا۔

"ہاں! سب اطمینان ہی ہے، لیجئے میں اسباب رکھے

"دیتا ہوں، خدا مالک ہے ——"

قلی نے اسباب، تانگہ میں رکھ دیا۔ کلیم نے اس کو مزدوری دی، ادھر کلیم نے قلی کے ہاتھ میں پیسے دئے اور ادھر تانگہ والے نے گھوڑے کے چابک رسید کر دیا۔ اور تانگہ روانہ ہوگیا۔

"صاحب! ایک بات پوچھتا ہوں، آپ برا تو نہ مانیں گے" تانگہ والے نے تھوڑی دور جا کر کلیم سے پوچھا۔

"ڈھنگ کی بات کہوگے، تو برا کیوں مانوں گا، ——" کلیم نے ہتھیلی کو سہلاتے ہوئے جواب دیا۔

"آپ کبھی اس شہر میں اس سے پہلے آئے ہیں —— تانگہ والے نے دریافت کیا،

"میں تو یہاں اکثر آتا رہتا ہوں، کہو تمہارا مطلب کیا ہے؟ ——" کلیم، تانگہ کے گدّے پر کہنی ٹیکتے ہوئے بولا۔

"کیا آپ چھوٹ گئے ——" تانگہ والے نے ذرا جھجکتے ہوئے پوچھا۔

"چھوٹ گئے ؟ میاں تانگہ والے، تم کیا کہہ رہے ہو ـــــــ" کلیم نے مضطربانہ انداز میں کہا۔

"کوئی تین مہینہ کی بات ہے ، بالکل آپ ہی کی شکل"

"کے ایک آدمی کو پولس کے سپاہی پکڑ کر"

"لائے تھے ، وہ آدمی جو آپ سے ملتا جلتا تھا ، اس نے"

"کسی صراف کو دھوکا دیا تھا ، میں تو کہتا ہوں وہ "عین بین"

"آپ ہی جیسا تھا ' اور ہاں جیسے آپ کی ٹھوڑی پر تِل ہے"

"اُس کی ٹھوڑی پر بھی تِل تھا ، ممکن ہے میری آنکھوں سے چُوک"

"ہو رہی ہو" اور "وہ آدمی" آپ نہ ہوں ، مگر یہ تو میں ضرور"

"کہوں گا ، کہ اتنے ملتے جلتے حُلیہ کے دو آدمی میں نے کبھی"

"نہیں دیکھے ـــــــ" تانگہ والے نے سنجیدگی کے ساتھ

جواب دیا۔

"میں "وہ آدمی" ہرگز نہیں ہو سکتا - مجھ سے اور صراف کے"

"لین دین اور جھگڑے سے کیا واسطہ ، ـــــــ" کلیم نے گھبرا کر کہا۔

تانگہ والا اس پر چُپ ہو گیا - مگر کلیم کا بُرا حال تھا ، عتاب اور ندامت کی شدّت سے اُسے پسینہ آگیا ، اُس نے تانگہ کے آئینے میں کئی دفعہ گھبرا کر اپنے چہرے کو دیکھا کہ کوئی تبدیلی تو نہیں ہو گئی ہے - وہ غصّہ کے مارے بے قابو ہوا جا رہا تھا - اس کی سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا - کہ یہ ہو کیا رہا ہے۔

اور اس کی صورت لوگوں کو دھوکے میں کیوں ڈال رہی ہے؟

چند میل چلنے کے بعد ہوٹل آگیا۔ ہوٹل کے دروازے پر تانگہ رکا، فٹ پاتھ پر کھڑے ہوئے قلی نے جھپٹ کر اسباب اتارا۔ کلیم نے تانگے والے کو کرایہ دیا، اور قلی کے سر پر اسباب رکھوا کر ہوٹل میں پہنچا ہوٹل کا منیجر درخت کے نیچے کرسی پر بیٹھا ہوا اخبار پڑھ رہا تھا۔

"جناب جب تک آپ پچھلا حساب بیباق نہ کرینگے۔ ہوٹل میں ٹھہر نہیں سکتے"، —————— ہوٹل کے منیجر نے کلیم کو دیکھتے ہی کہا۔

"کیسا حساب، آپ کس سے کہہ رہے ہیں؟ ارے ——" کلیم نے گھبرا کر جواب دیا۔

"آپ سے کہہ رہا ہوں، اور کس سے کہہ رہا ہوں، اُلٹا چور کوتوال کو ڈانٹے!"

"ہوٹل میں ٹھہر کر، حساب بیباق کئے بغیر، چپ چاپ چلے جانا"

"شریفوں کا شیوہ نہیں —————" منیجر عینک کو چھوتے ہوئے بولا۔

"کون اُلو کا پٹھا آپ کے ہوٹل میں ٹھہرا تھا، اس"

"ہوٹل میں تو میں آج پہلی مرتبہ آیا ہوں، قرآن شریف"

"کی مار پڑے، مرتے دم ایمان نصیب نہ ہو۔ جنت کی ہوا اُس پر"

"حرام ہو جائے۔ جس نے آپ کے ہوٹل میں آج سے پہلے کبھی قدم"

"رکھا ہو —————" کلیم پیشانی کا پسینہ پونچھتے ہوئے بولا۔

"معاف فرمایئے یہ قسموں کا منتر کسی اور پر جا کر پڑھنا، مجھ پر"

"یہ فریب نہیں چل سکتا۔ اپنا حساب آپ کو بیباق کرنا ہوگا" منیجر صاحب رجسٹر کے اوراق الٹتے ہوئے بولا

کلیم کی سخت مشکل میں جان تھی، دو چار مسافر بھی منیجر کی گرجتی ہوئی آواز کو سنکر اکٹھے ہو گئے۔
کلیم نے اسی میں مصلحت سمجھی کہ حساب بیباق کر دیا جائے۔ منیجر نے جو کہا، کلیم نے دے دیا
کلیم کو اس ہوٹل میں ٹھیرنا نہیں چاہیئے تھا۔ مگر وہ کچھ ایسا بوکھلا سا گیا۔ کہ وہ اسی ہوٹل میں ٹھیرا۔ اور ٹھیرا
کیا۔ ہوٹل کے در و دیوار اُسے گھومتے ہوئے معلوم ہوتے تھے، اس کا دماغ چکرا رہا تھا۔ اور اس کا
خیال کسی ایک مرکز پر قائم نہ رہ سکتا تھا وہ غور کرنیکے بعد بھی یہ بھید معلوم نہ کر سکا۔ کہ اس شہر کے رہنے
والوں کو ہو کیا گیا ہے اور اس کے لئے ہر زمین، آسمان کیوں بن جاتی ہے؟ اسی حالت میں اس پر غنودگی
طاری ہوئی اور وہ کئی گھنٹہ تک ہوٹل کے کمرے میں، آرام کرسی پر سویا کیا جب اس کی آنکھ کھلی ہے تو
دوپہر اچھی طرح ڈھل چکی تھی۔ اس نے غسل کیا، کپڑے بدلے اور ہوٹل کے ملازم کو آواز دے کر چائے
منگائی، چائے پی کر اس نے سگار سلگایا۔ اور سگار کو ہونٹوں میں دبائے ہوئے کمرے سے باہر نکلا، اس
کے کمرے کے قریب ہی ایک طوائف ٹھیری ہوئی تھی، جب کلیم طوائف کے کمرے کے قریب سے گذرا ہے
تو طوائف نے اس کو دیکھتے ہی کہا:۔

"خوب راہ دکھائی، بڑے چالباز نکلے تم تو ـــــ!"

کلیم اس جملہ کو سن کر ششدر رہ گیا۔ اس نے اپنے بید کو کئی مرتبہ گھمایا، سگار اس کے ہونٹوں
سے گر پڑا، وہ نیم دیوانگی اور شدت حیرت کے عالم میں انگلیاں چٹخانے لگا۔

" ایسی بھی کیا بے رخی، کہ بات کا جواب تک نہیں "

" دیتے ـــــــــــــــ " طوائف کلیم کے قریب آ کر بولی۔

"تم کو دھوکا ہو رہا ہے یہ تم کس سے باتیں کر رہی ہو ———— کلیم نے رُک رُک کر جواب دیا

"مجھے دھوکا ہو رہا ہے یا تم مجھے دھوکا دے رہے ہو"

"میاں! آنکھوں میں خاک جھونکنے کی کوشش نہ کرو"

"کوئی چھ مہینے کی بات ہے کہ میں فیض گنج کے چھوٹے بازار"

"میں مقیم تھی، وہاں تم نے کئی رات میرا گانا سُنا"

"بہت سے روپے دئیے، اپنے نام کی انگوٹھی بھی دی تھی"

"جسے میری چھوٹی بہن نے کہیں گم کر دیا" طوائف ساری کے پلو کو سر سے ڈھلکاتے ہوئے بولی۔

"یہ تم باتیں کر رہی ہو، یا طلسم ہوشربا پڑھ رہی ہو، خدا کی"

"بندی، میں آج تک فیض گنج نہیں گیا، اور میں قسم"

"کھا کر کہتا ہوں کہ شادی، بیاہ میں"

"ایک آدھ مرتبہ میں نے ضرور طوائف کا گانا سُنا ہے لیکن"

"طوائف کے مکان پر تو میں نے قدم بھی نہیں رکھا" کلیم نے بیچارگی کے انداز میں جواب دیا

"تم بڑے بھولنے والے ہو، لو میں تمہیں یاد دلاتی ہوں"

"سُنو تم اکثر غالب کی اس غزل کی فرمایش کیا کرتے تھے کہ"

"ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا"

"اور ہاں میر کی یہ غزل تم نے مجھے خود لکھ کر دی تھی" ————

"———— " اک موج ہوا پیچاں اے میر نظر آئی"

"جب میں یہ چیز گا رہی تھی ————"

" ———— "بلاؤ سیاں کو ہیں مدہ کی بھری رے، ————"

"تو تم نے روپے دیتے وقت میری ٹھوڑی کو ٹھوکا دیا تھا اور"

"اس پر میری اماں نے کہا تھا:۔

"میاں! اتنے نہ بڑھئے ۔ ! ————"

"اور ہاں! تم نے کئی غزلوں میں مجھے ٹوکا تھا۔ اور کہا تھا کہ میرا آنا"

"جانا رہا، تو تمہاری سب غلطیاں دُور ہو جائینگی ۔ ————"

"اور یہ بات تو تم بھولنا چاہو، تو بھی نہیں بھول سکتے"

"کہ میری چھوٹی بہن کے ہاتھ سے تمہارے کپڑوں پر اگالدان"

"گر پڑا تھا، تمہارے کپڑے پان کی پیک میں تربتر ہو گئے تھے!"

"تم نے اپنے ملازم کو بھیجکر ہوٹل سے جوڑا منگایا تھا۔ "

"تم نے ہمارے مکان کے غسل خانے میں نہا کر، جوڑا بدلا تھا ————"

"اور ہاں! خوب یاد آیا، ایک رات کو تمہاری، ایک فضائی سے جو ہمارے"

"یہاں آیا جایا کرتا تھا گشت مشت ہو گئی تھی، فضائی"

"کو تم نے کسی بات پر سخت سُست کہا تھا، اس پر وہ تم سے"

" لپٹ گیا تھا۔ وہ تو استاد جی اور اماں آڑے آ گئیں "

" نہیں تو کچھ سے کچھ ہو جاتا، مجھے خوب یاد ہے کہ اس پکڑ دھکڑ میں "

" تمہاری اچکن کے کئی بٹن ٹوٹ گئے تھے، ـــــــــ " طوالف نے مسکرا مسکرا کر کہا۔

طوالف کی بات چیت سنکر، کلیم کو پسینہ آ گیا۔ حیرت و عتاب کی شدت سے اس کے بدن میں تھرتھری پیدا ہو گئی۔ اس کا دماغ حیرت و استعجاب کے دریا میں غوطے کھا رہا تھا، اسی عالم میں وہ ہوٹل سے روانہ ہو گیا۔ کلیم پر دیوانگی سی طاری تھی، اسکے ہوش و حواس مختل ہو چلے تھے۔ وہ شہر کی گلیوں میں دیوانہ وار گھوم رہا تھا، راہ میں راہ گیروں سے اس کی ٹکر ہو گئی۔ اور بازار کے نکڑ پر، وہ تو موٹر ڈرائیور نے بڑی پھرتی دکھائی کہ موٹر فوراً روک لیا' نہیں تو کلیم ختم ہی ہو گیا تھا۔ اس کا دماغ چکرا رہا تھا، شہر کے بازار اُسے بھیانک نظر آتے تھے، لوگ بازار میں کسی کام کے لئے چلتے پھرتے ہیں، اور کلیم بازار میں صرف "چلنے" کے لئے چل رہا تھا۔ وہ پھرتے پھرتے تھک گیا تھا، مگر پھر بھی بدستور چل رہا تھا۔ یہاں تک کہ وہ گھومتے گھومتے بالکل چور ہو گیا، اور چوراہہ کی مسجد کی سیڑھیوں پر سستانے کے لئے بیٹھ گیا، اُس نے سیڑھیوں پر بیٹھ کر، جیب سے رومال نکالا، اور ابھی نصف پیشانی کا پسینہ بھی نہ پونچھا تھا۔ کہ ایک ادھیڑ عمر کے آدمی نے اس کے سر کو ٹھوکا دیا،

" ارے ـــــــ کون ـــــــ یہ ! " کلیم گھبرا کر بولا۔

" اجی جناب! ایک عرصہ کی تلاش کے بعد آپ ہاتھ "

" آئے ہیں ـــــــــ " نووارد نے چھڑی گھماتے ہوئے جواب دیا۔

"جان نہ پہچان بڑی خالہ السلام! میں نے آپ کو اس سے"

"پہلے کبھی نہیں دیکھا" ——————— "کلیم نے نو وارد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں! اپنے مطلب کے لئے ایسے ہی انجان بن جاتے ہیں"

"شریف آدمیوں کو دھوکا دیتے ہوئے شرم نہیں آتی —— " نو وارد نے سخت لہجہ میں جواب دیا۔

"ارے بھئی! تم کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہے ہو! میری تو"

"تم سے آج تک ملاقات ہی نہیں ہوئی، ——————"کلیم نے گھبرا کر کہا۔

"ملاقات نہیں ہوئی" کی بھی ایک ہی رہی، اجی حضرت!"

"دروغ گو را بروئے تو" شرم نہیں آتی" آپ کی دی ہوئی"

"عینک کوڑی کام کی بھی نہ نکلی، میری آنکھیں الٹی خراب ہو گئیں۔ ——" نو وارد نے جواب دیا۔

"مجھ سے اور عینک سے کیا واسطہ، یہ تم کیا کہہ رہے ہو اور"

"کس سے کہہ رہے ہو۔ کچھ ہوش بھی ہے! ———————— کلیم نے کھڑے ہو کر جواب دیا۔

"تم سے کہہ رہا ہوں"۔ اور کس سے کہہ رہا ہوں، لوگوں کی جیبوں پر ڈاکہ ڈال کر"

"انجان بننا خوب آتا ہے ۔یاد نہیں ہے۔ شب برات کی صبح"

"کو بڑے ہوٹل میں، تم نے میرے ہاتھ عینک بیچی تھی، تم نے اطمینان"

"دلایا تھا۔ کہ عینک بہترین قسم کی ہے، اور آنکھوں کے لیے بہت مفید ثابت"

"ہو گی، لیکن خدا گواہ ہے کہ ایک ہفتہ میں میری آنکھیں ورم کر آئیں، میں نے"

"شہر کے عینک ساز کو، تمہاری دی ہوئی عینک دکھائی، تو اس نے کہا"

"کہ یہ تو کانچ کے ٹکڑے ہیں، پتھر نہیں ہے جب اُسے یہ معلوم ہوُا"۔

"کہ میں نے چالیس روپیہ میں عینک مول لی ہے۔ تو وہ غش غش کرنے لگا"۔

"اور بولا کہ یہ عینک بیچنے والا، ڈاکو ہے ڈاکو! جناب میں سیدھے"

"طریقہ سے کہتا ہوں، کہ اپنا چشمہ واپس لیجیے، اور میرے روپے مجھے لوٹا"

"دیجیے"۔ ——————— نووارد نے سنجیدہ ہو کر کہا۔

نووارد اور کلیم میں تیز گفتگو ہونے لگی، جس کو سن کر دو چار آدمی اکھٹے ہو گئے، اتنے میں ایک شخص ہاتھ میں پنجرہ لئے ہوئے آیا۔ اور کلیم کے قریب کھڑا ہو گیا،

"ارے تم خوب ملے، بہت دن سے تمہاری تلاش تھی"۔ پنجرے والا، کلیم کی طرف دیکھتے ہوئے بولا

"میری تلاش ——— اور آپ کو ——— واہ! ———" کلیم نے جھنجلا کر جواب دیا

"جی ہاں! آپ ہی کی تلاش تھی، آپ کی دی ہوئی"

"دو مرغیاں تو دوسرے دن ہی مر گئیں اور جو"

"رہ گئی ہیں وہ انڈے نہیں دیتیں ——————— پنجرے والا بولا۔

"مرغیاں انڈے نہیں دیتیں نہ دیں، مرغیاں کیا، مرغے بھی"

"خدا کرے مرجائیں، لیکن مجھ کو اس سے کیا واسطہ! ———— کلیم نے مجنونانہ انداز میں جواب دیا۔

"چوری اور سرزوری! تم نے تو مرغی بیچتے وقت یہ کہا"

"تھا کہ یہ مرغیاں بڑی اچھی نسل کی ہیں، مہینہ میں کم سے کم"

"بیس دن انڈے دیتی ہیں، مگر ان میں سے دو تو دوسرے"

"دن ہی چل بسیں، باقی تین مرغیاں"

"دو دو چار چار انڈے دے کر کُڑک ہو گئیں، میرا یقین ہے کہ"

"تم نے بیمار مرغیوں کو بیچا تھا، نہیں تو دوسرے دن مرغیوں کا"

"یکایک مرجانا کیا معنی رکھتا ہے؟ تمہاری تین"

"مرغیاں ہیں ابھی گھر سے جا کر لائے دیتا ہوں، اُن کی اور مری ہوئی"

"مرغیوں کی قیمت واپس کر دیجئے، میاں! ایسی دھوکے"

"کی تجارت نہیں کیا کرتے! یہ بیوپار کیا ہوا، ڈکیتی"

"ہوئی! پنجرے والے نے پنجرے کو ہلاتے ہوئے کہا۔

کلیم کے دماغ پر صبح سے پے در پے ہتھوڑے پڑ رہے تھے۔ اس کی قوتِ فہم و ادراک میں اختلال پیدا ہو گیا۔ اس کے ہوش و حواس منتشر ہو گئے۔ اس نے پنجرے والے کو گالیاں دینا شروع کیں، یہانتک

کہ دونوں ایک دوسرے سے لپٹ پڑے، بنجرے والا ذرا پہلوان قسم کا آدمی تھا۔ اُس نے کلیم کو ذرا سی دیر میں پچھاڑ دیا، کلیم تیورا کر زمین پر گر پڑا۔ دیوانہ وار چلانے لگا :۔

"یہ شہر، دیوانوں کا شہر ہے، یہاں دیوانے اور مجنوں بستے ہیں۔ یہاں"

"عنقریب خدا کا قہر نازل ہونے والا ہے۔ زلزلہ آئیگا اور ایسا زلزلہ آئیگا، کہ ایک"

"ایک گھر کی اینٹ سے اینٹ بج جائیگی، یہاں کے بسنے والے پاگل ہیں"

"پاگل، لاحول ولاقوۃ!"

کلیم کا بدن کانپ رہا تھا، منہ سے کف جاری تھا، وہ پاگلوں کی طرح چیخ رہا تھا، پولس کا سپاہی جو قریب کے نکڑ پر کھڑا ہوا تھا۔ اس چیخ پکار کو سن کر آگیا، اس نے دیکھا کہ ایک شخص دیوانگی کی حالت میں اول فول بک رہا ہے، اس کے دیدے پھٹے ہوئے ہیں، اور منہ سے کف بہ رہا ہے۔ سپاہی نے قریب کی چوکی سے تھانہ کو ٹیلیفون دیا، چند سپاہی آئے اور کلیم کو پکڑ کر تھانے لے گئے، کیونکہ ایسے خطرناک اور پاگل آدمی کو شہر میں اس طرح کھلے بندوں چھوڑنا، مفاد عامہ کے لئے مضر ہوتا ہے۔ سپاہیوں نے جو کلیم کو آکر پکڑا ہے تو اس کی حالت اور غیر ہو گئی، اور اس کے رہے سہے حواس بھی جاتے رہے، اب وہ قریب پاگل ہو گیا تھا۔ تھانہ میں پہنچکر وہ خوب چلایا۔ تھانیدار کو سینکڑوں ملاحیاں سنائیں، تھانیدار نے اُسے حوالات میں بند کر دیا۔ وہ رات بھر بکتا رہا، یہاں تک کہ صبح ہو گئی۔

صبح کے وقت کلیم کی دماغی حالت میں توازن پیدا ہو چلا تھا، مگر جب اُسے سپاہی پکڑ کر کچہری لیجانے لگے، تو اُس پر پھر پاگل پن طاری ہو گیا، مجسٹریٹ کے سامنے پہنچکر تو اس نے آسمان سر پر اٹھالیا، ڈاکٹر نے

اس کا معائنہ کیا، اور معائنہ کرنے کے بعد تجویز کی کہ:۔

"کسی غیر معمولی صدمہ کے باعث، اس شخص کا دماغ متاثر ہوگیا ہے"۔

"اس کو چند دن پاگل خانے میں رکھنا چاہیئے یقین ہے کہ دو تین"

"ہفتہ میں دماغی حالت میں توازن پیدا ہو جائے گا"

کلیم نے اس پر مجسٹریٹ اور ڈاکٹر کو بے نقط گالیاں سُنائیں، اس نے چلّا چلّا کر کہا:۔

"میں پاگل ہوں! ارے! تم سب کے سب پاگل ہو، اور تم سب کے سب کیا"

"یہ سارا شہر کا شہر پاگل ہے، ٹکٹ چیکر پاگل، قلی پاگل، تانگہ"

"والا پاگل، ہوٹل کا منیجر پاگل، یہاں کی رنڈیاں اور سپاہی"

"بھی پاگل، ڈاکٹر اور مجسٹریٹ بھی پاگل، اے میرے خدا، میں کہاں"

"آ گیا ——————"

کلیم کی باتیں سن کر سب لوگ ہنسنے لگے، باتیں سچی تھیں، مگر لوگ تو حقیقت سے بے خبر تھے، اُن کو تو ہر بات اٹکل اور بے جوڑ معلوم ہوتی تھی، سب لوگوں کو یقین ہو گیا کہ یہ شخص واقعی پاگل ہے،

"کلیم پاگل خانہ میں لیجایا گیا، اور وہاں اُس کو ایک ایسی کوٹھری میں رکھا گیا۔ جو پاگل خانہ کے چمن سے ملی ہوئی تھی، پاگلوں نے کلیم کو دیکھ کر مسرت کا اظہار کیا، پاگلوں نے خوب تالیاں بجائیں۔ اور "ہپ ہپ ہرّے" کے شور سے پاگل خانہ کو لندن کا "وہائٹ ہال" بنا دیا۔ پاگل خانہ حقیقت میں کلیم کے لئے امن کی جگہ تھی، وہاں پہنچکر اُس کو پرسکون فضا ملی اور اس کے دماغ کا اختلال دور ہو گیا۔ ڈاکٹر اسکا ایک دن آڑے سے معائنہ کرتا تھا۔

کلیم کی دماغی حالت بہت اچھی تھی، وہ سمجھ بوجھ کی باتیں کرتا تھا۔ وہ ڈاکٹر سے روز کہتا تھا کہ "مجھے رہا کر دیجئے میں پاگل نہیں ہوں"۔ مگر پاگل خانہ میں جب کوئی پاگل یہ کہتا ہے کہ "میں پاگل نہیں ہوں" تو عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے۔ کہ ابھی اسکا پاگل پن دُور نہیں ہوا۔ کلیم کو بہت سے پاگلوں سے ملنے کا اتفاق ہوا اور اُن کی باتوں اور حرکتوں سے وہ خوب لطف اندوز ہوا، پاگل خانہ میں جن پاگلوں کی دماغی حالت سدھرنے لگتی ہے۔ اُن کو صحن میں ٹہلنے کی اجازت ہوتی ہے، اور ایسے پاگل آپس میں بات چیت بھی کر سکتے ہیں، کلیم کا بھی ایسے ہی پاگلوں میں شمار ہونے لگا۔ اور اُس کو صحن اور باغیچہ میں ٹہلنے کی اجازت ملنے لگی اُن ہی پاگلوں میں ایک ادھیڑ عمر کا پاگل بھی تھا، جسے یہاں آئے ہوئے ایک سال کا عرصہ ہوا تھا۔ کلیم کی اور اسکی خوب گھٹتی تھی۔ پہلے تو کلیم اس سے ملتے ہوئے ہچکچاتا تھا، لیکن بعد میں جا کر اسکا خوف دور ہو گیا۔ ایک دن اس پاگل نے کلیم کو بہت سے اشعار گا کر سنائے۔ اور بڑی ہی سمجھ کی باتیں کیں، کلیم اسکی باتوں سے بہت خوش ہوا، دوسرے پاگل بھی وہیں جمع ہو گئے کلیم گلاب کے پودے کی شاخوں کو جھکا کر پھول توڑ رہا تھا کہ اتنے میں وہی پاگل کلیم کے سر پہ زور سے چپت رسید کرتے ہوئے بولا۔

"ابے گدھے کچھ سمجھا بھی، فاختہ کی اولاد، "

"نامعقول کہیں کے ——— !

وہ جو کسی نے کہا ہے کہ "دیوانہ را ہوئے بس است" دوسرے پاگل بھی بہکنے لگے، اور انہوں نے بھی کلیم کی چپت سے تواضع کرنی شروع کی۔ کلیم بے تحاشا بھاگا، اور تمام پاگلوں نے اس کا پیچھا کیا۔ وہ تو سپاہیوں اور ملازموں نے پاگلوں کو جلدی سے قابو میں کر لیا۔ نہیں تو بیچارے کلیم کی بُری گت بنجاتی

کلیم یہاں پاگل خانے میں پڑا ہوا تھا، اور وہاں اس کے گھر والے، اسکے واپس نہ آنے سے پریشان ومتفکر تھے، پریشانی کی ایک وجہ یہ بھی تھی، کہ کلیم کا چچا زاد بھائی شاکر اسکا جانی دشمن تھا، وہ ایک دفعہ کلیم پر قاتلانہ حملہ بھی کرا چکا تھا، وہ کلیم کی جائداد کو اپنے قبضہ میں کرنا چاہتا تھا۔ اور اسکی کمبخت فطرت ہر خوفناک سے خوفناک سازش کے لئے تیار تھی۔ کلیم کے گھر والوں نے پولیس کو بھی اطلاع دے دی تھی۔ پولیس کی کوشش نے ایک خط برآمد کیا، جس نے اسرار کے چہرے سے تمام پردے اٹھا دئے، یہ خط شاکر کے ایک دوست نے اس کو لکھا تھا۔

"شاکر صاحب!

"آپ کے مشورے کے مطابق میں نے تمام انتظامات کر دئے ہیں، آپ یقین جانئے"

"کہ کلیم کا اس پھندے سے نکلنا ناممکن ہے، آپ کا خیال بالکل صحیح ہے"

"کہ کلیم کو پاگل بنا دینے کے بعد، تمام دشواریاں دور ہو جائینگی، یقین"

"رکھئے کہ کلیم ایک دن کے اندر پاگل ہو جائیگا، میں نے جو تدابیر سوچی ہیں، وہ"

"اس کو ضرور پاگل بنا کر رہیں گی، کلیم فطرتاً حساس اور بہت زیادہ حساس"

"واقع ہوا ہے، اور حساس آدمی کو پاگل بنا دینا، کچھ زیادہ مشکل نہیں ہے، بشرطیکہ"

"ایسے اسباب جمع کئے جائیں، جو اس کے دل و دماغ کو حیرت و استعجاب"

"میں غرق کر دیں، اور اس کے ہوش وحواس کو قدم قدم پر ٹھوکر لگے"

"طوائف کو بھی ہوٹل میں ٹھیرا دیا گیا ہے۔ وہ ایک ہزار سے کم پر راضی نہیں"

"ہوئی، آپ کے بھیجے ہوئے روپیوں میں سے کوئی پچاس روپیہ"

"باقی رہ گئے ہیں، ایک ہزار روپیہ کم سے کم اور بھیجد یجئے۔ پھر بیڑا پار ہے"

"روپیہ تار سے بھیجئے"

اس خط کی رہنمائی میں، پولیس نے بہت جلد کھوج لگا لیا۔ کلیم کے پاگل خانہ سے چھوٹنے میں ابھی پانچ دن باقی تھے، کہ اس کے گھر والے، مجسٹریٹ کا حکم لیکر، پاگل خانے پہنچے، کلیم، پاگل خانہ کی کوٹھری میں اُونگھ رہا تھا، پاگل خانہ کے داروغہ نے کوٹھری کا دروازہ کھولا، اور کلیم کا شانہ ہلا کر کہا:۔

"اُٹھیے مولوی صاحب! آپ کے گھر والے آ گئے۔"

کلیم نے چونک کر آنکھیں کھول دیں، اور کوٹھری سے باہر آیا۔ جہاں اس کے دوست احباب کھڑے ہوئے تھے، کلیم نے جھینپ کر نگاہیں جھکا لیں، دوستوں نے کہا:۔

"آپ شرمندہ کیوں ہوتے ہیں یہ آپ خود ——————— نہیں"

"بلکہ آپ کو ——————— بنایا گیا ہے"

کلیم خوشی خوشی گھر پہنچا۔ اور سب لوگوں نے اس کا پُر جوش خیر مقدم کیا۔

کلیم کی بیوی جب اس مصرعہ کو:۔

"دیوانہ ہو گیا ہوں کہ دیوانہ کر دیا"

گنگناتی تھی، تو کلیم جھینپ کر مسکرا دیتا تھا۔

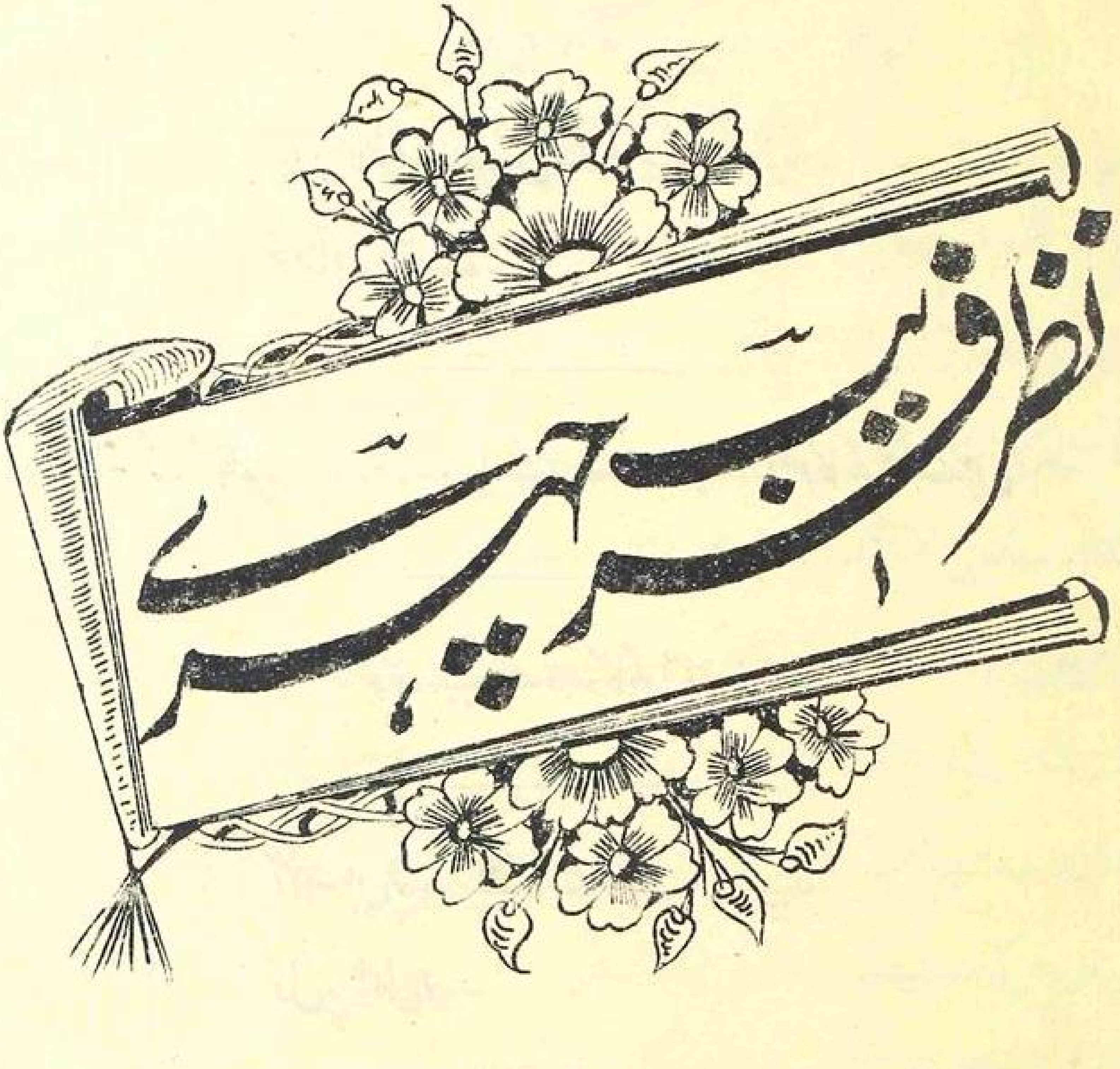

باتوں کا فریب، چہروں کے فریب سے زیادہ
خوفناک ہوتا ہے۔

بگلے کے اُجلے پروں کو دیکھ کر دریا کے بہت سے جاندار دھوکا کھا جاتے ہیں

دھوکا دینے سے دھوکا کھانا بہتر ہے!

آئینہ میں چہرہ دیکھتے وقت، ایک نظر اپنے
دل پر ڈال لو۔

نظر فریب چہرے

عام طور پر بھائیوں کی شکل وصورت میں کسی نہ کسی حد تک مشابہت پائی جاتی ہے، مگر نسیم اور علیم کی صورتیں تو کچھ اتنی زیادہ ملتی جلتی تھیں، کہ دیکھنے والوں کو ہمیشہ دھوکا ہوا، اور لوگوں نے بارہا نسیم کو علیم اور علیم کو نسیم سمجھا۔ نسیم اور علیم میں چند گھنٹوں کی چھوٹائی، بڑائی تھی، نسیم علیم سے عمر میں کوئی تین گھنٹے بڑا تھا، دونوں کے چہرے کتابی تھے۔ رنگ گندمی، چوڑی پیشانی، ستواں ناک، دہانہ متوسط، مشابہت کی انتہا ہے کہ دونوں کی کنپٹیوں پر سیاہ نشان تھے۔ نسیم اور علیم کی شکل، صورت میں اگر کوئی چیز مابہ الامتیاز تھی تو وہ علیم کی ٹھوڑی کا تل تھا لیکن مشابہت کی اتنی بہت سی ظاہر نشانیوں کے ہوتے ہوئے، اک ذرا سا تل کس گنتی میں تھا۔ باہر کے لوگوں کا ذکر کیا ہے، نسیم اور علیم کے بچپن میں خود اُنکے گھر والوں کو دھوکا ہو جاتا تھا، ایک مرتبہ نسیم نے کوئی شرارت کی، نسیم کی ماں اس کو سزا دینے کے لئے اٹھی، نسیم بھاگا، ماں نے اس کا پیچھا کیا، بوڑھی عورت، تیز و طرار بچے کو کیا پکڑ سکتی تھی، نسیم دالان اور ڈیوڑھی سے ہوتا ہوا، گلی پار جا پہنچا، دالان کے بازو میں ایک کوٹھری تھی۔ علیم وہاں چوکی پر بیٹھا ہوا تھا، نسیم و علیم کی ماں، نسیم کو ڈھونڈتی ہوئی کوٹھری میں پہنچی، علیم بالکل انجان بیٹھا تھا۔ وہ ماں کی گھبراہٹ کو دیکھ کر مسکرا دیا۔ ماں سمجھی کہ یہ نسیم یہاں آکر چھپ گیا ہے، اس نے علیم کے دونوں کان اس زور سے کھینچے کہ غریب تلملا اٹھا۔

"اماں جان! میں نے کیا قصور کیا ہے، "

"ہائے! میرے کان ——————— میں مر گیا ——————— ! علیم نے گھبرا کے کہا۔

ادب کی زبان میں "عذرِ گناہ" کو "بدتر از گناہ" بتایا گیا ہے اور نسیم و علیم کی ماں کے خیال میں تو یہ جملہ انکارِ گناہ کا مظہر تھا۔ علیم کے انکار نے بوڑھی عورت کے غصّہ کو اور زیادہ تیز کر دیا۔ اس کے کمزور ہاتھوں کی جھریاں عتاب کی شدّت سے رونگٹے کی طرح کھڑی ہو گئیں، اس نے علیم کو بے تحاشا مارنا شروع کیا، علیم نے ہاتھوں اور باہوں سے سر اور چہرے کو بہت کچھ چھپانے کی کوشش کی، مگر بوڑھی عورت نے معصوم علیم کے سر اور رخساروں کی اچھی طرح خبر لی

"نسیم! آج کی مار یاد رکھنا ———————"

"بے غیرت کہیں کا ——————— !" بوڑھی عورت نے پیشانی سے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا۔

" اماں! میں نسیم نہیں ہوں علیم ہوں دیکھئے تو "

"خطا کی ہے بھائی جان نے اور اس کی سزا "

" مجھے دی جا رہی ہے ——————— علیم نے بھرّائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

بوڑھی عورت کو جب اپنی غلطی کا احساس ہوا تو وہ پشیمان سی ہو گئی علیم کی سُرخ آنکھوں سے آنسوؤں کے قطرے ٹپ ٹپ گر رہے تھے، پشیمانی اور مامتا نے بوڑھی عورت کے نازک دل کو اس قدر متاثر کیا کہ اس کی پلکیں بے اختیار نم آلود ہو گئیں بیٹے کی بیگناہی اسکی نگاہوں کے سامنے مجسم بنکر کھڑی تھی ایسے مواقع عموماً بڑے نازک ہوتے ہیں! وہ سنجیدہ سے سنجیدہ اور مفکّر سے مفکّر انسان بھی گھبرا جاتے ہیں،

ایک طرف پشیمانی تھی، دوسری طرف ماں کی مامتا، بوڑھی عورت نے اسی محبت آمیز کشمکش کے عالم میں گھبرا کر کہا:-

" علیم! مجھ سے چوک ہوگئی، اور رہاں! تم اور نسیم ایک ہو"

" کوئی دو تھوڑی ہو۔ بیٹا! تم اپنا جی تھوڑا نہ کرنا، اور"

" ہاں! علیم! تمہارے ابا سے میں نے کہہ دیا ہے کہ وہ تم کو نمائش"

" دکھلانے کے لئے، علیگڈھ ضرور لے جائیں۔ تنخواہ ملنے پر تمہاری اچکن"

" کے لئے کپڑا ابھی منگا دونگی، پرسوں چاند کی دوسری کو قاضی جی کے"

" منجھلے لڑکے کی شادی ہے، تم میرے ساتھ ڈولی میں بیٹھ کر چلنا"

" نسیم اپنے ابا کے ساتھ آجائیگا۔ ——————"

" علیم جاؤ ہنسی خوشی منہ دھو ڈالو، تمہارا چہرہ بے رونق"

" سا ہو رہا ہے ——————"

یا تو علیم کی آنکھوں سے آنسو گر رہے تھے، اور اب ماں کی محبت بھری باتیں سنکر دہ بے اختیار ہنس پڑا، اسکے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی، اور اسکی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا رہے تھے۔

بچپن کی مسرت کتنی معصوم ہوتی ہے؟

" اماں! میں اس دفعہ نمائش ضرور جاؤنگا، پچھلی دفعہ"

" ابا جان کو کوئی کام لگ گیا تھا۔ اور اماں! اچکن کا"

"کپڑا بھی خود پسند کر کے لاؤنگا، ماموں جان کہتے تھے کہ اس"

"دفعہ بازار میں اچھے اچھے میل کے تھان آئے ہیں، قاضی جی"

"کے یہاں میں آپ ہی کے ساتھ چلونگا، ابا جان کا کیا ٹھیک ہے"

"وہ گئے بھی تو ٹھیک وقت پر پہنچیں گے ——————" علیم نے جواب دیا۔

جن بچوں کی ماں کو شکل و صورت کی مشابہت دھوکے میں ڈالتی ہو تو غیر لوگ اگر دھوکا کھا جائیں تو کوئی اچنبھے کی بات نہیں!

نسیم اور علیم کو ایک ہی اسکول میں، اور ایک ہی جماعت میں داخل کرایا گیا۔ شروع میں تو دونوں بھائی تماشا بن گئے تھے، اسکول کے بچوں کو تو کوئی نئی بات چاہیئے نسیم اور علیم کو کھیل سے بہت دلچسپی تھی، بات یہ تھی کہ ان کے ماموں، اپنے زمانہ کے بہترین کھلاڑی تھے، اُن کے گھر میں کھیل کا بہت چرچا تھا۔ نسیم اور علیم کا وہاں آنا جانا رہتا تھا، اس لئے یہ دونوں کرکٹ، بیڈمنٹن اور ہاکی میں اچھے خاصے مشتاق ہو گئے۔ اسکول میں پہنچکر تین چار سال کی مشق میں، کچھ سے کچھ حالت ہو گئی علیم اور نسیم کا شمار اسکول کے بہترین کھلاڑیوں میں تھا، کوئی میچ ایسا نہ ہوتا جس میں ان دونوں کو شامل نہ کیا جاتا۔ اسکول میں "یہ کھلاڑی بھائی" کے نام سے مشہور تھے، نسیم اور علیم کھلاڑی بھی بلا کے تھے، اور ذہین بھی اوّل درجہ کے تھے، نویں جماعت کے امتحان سے پہلے علیم بیمار ہو گیا، ذہین لڑکے عام طور پر امتحان سے کچھ دن پہلے تیاری کیا کرتے ہیں، تیاری کے دن بیماری کی نذر ہو گئے، علیم کو افاقہ تو ہو گیا تھا۔ مگر کمزوری باقی تھی، اسی حالت میں وہ امتحان میں شریک ہو گیا۔ کوئی شک نہیں کہ علیم بلا کا ذہین تھا۔ اور اس نے اپنی ذہانت کے زور سے بہت سے پرچوں

کو بہترین انداز میں حل کیا۔ مگر جو نصاب اسکی نظروں سے گذرا ہی نہ تھا، اسکے سوالات، صرف ذہانت کی امداد سے کسطرح حل ہو سکتے تھے، ذہانت شہروں اور دریاؤں کے نام، تاریخ کے سن اور مصنفین کے سوانح حیات تو تصنیف نہیں کر سکتی، نتیجہ یہ نکلا کہ علیم ناکامیاب ہو گیا، اور نسیم انٹرنس کلاس میں پہنچ گیا۔ علیم کو ناکامیابی کا قلق ضرور تھا۔ مگر اس کا قلب بہر حال مطمئن تھا۔

اسکول کھلنے پر اسکول کی کمیٹی کے صدر کی طرف سے چاندی کا کپ، ہاکی میں جیتنے والی ٹولی کے لئے پیش کیا گیا۔ یہ مقابلہ چھٹی جماعت سے لیکر دسویں جماعت کے طلباء کے مابین تھا۔ مختلف جماعتوں کے مابین مقابلہ ہوا۔ یہاں تک کہ نویں اور دسویں جماعتیں فائنل میں آ گئیں، آخری مقابلہ کے لئے تاریخ مقرر کی گئی۔ اور مقابلہ کی شام کو کھیل کا میدان تماشائیوں سے بھر گیا۔ کھیل شروع ہوا، اور بڑے جوش و خروش کیساتھ شروع ہوا۔ نسیم اور علیم دونوں ایک دوسرے کے مخالف تھے، بھائی کا رشتہ خون کے رشتوں میں سب سے زیادہ قریبی ہے۔ مگر آج دونوں بھائی ایک دوسرے کی مخالفت پر تلے ہوئے تھے، جماعت کی تفریق کے تصور نے ایک دوسرے میں مقابلہ کی اتنی سرگرمی پیدا کر دی تھی، کہ بھائی چارہ کا تصور تھوڑی دیر کے لئے باقی ہی نہیں رہا تھا۔ وقفہ تک دونوں ٹولیاں برابر رہیں، وقفہ کے بعد تو اس قدر طوفانی کھیل شروع ہوا کہ خدا کی پناہ! کئی کھلاڑیوں کی تو اسٹکیں چور چور ہو گئیں، تماشائی بھی جی کھول کے داد دے رہے تھے:۔

"شاباش! منوہر، تمہارے ہی ہاتھ میدان ہے۔"

"بھئی! ہر پرشاد کتنی تیز گیند روکی ہے، واہ!"

"نسیم بڑھے جاؤ، میدان صاف ہے"

"ارے! شریف تمہارے پیچھے آدمی ہے ——————"

"نویں کلاس کے بہادرو تمہاری جے! ——————"

"پنڈت جی، علیم کو گیند پاس کر دیجئے، خدا کے لئے کیری (Carry -)"

"نہ کیجئے ——————"

"خاں صاحب! بڑا نازک موقعہ ہے۔ دیکھو کہیں فاؤل (Foul)"

"نہ ہو جائے ——————"

دفعۃً کوئی دس منٹ بعد نویں جماعت کی ٹولی نے ایک گول کر دیا، عجیب بات ہے کہ تمام چھوٹی جماعتوں کو نویں جماعت سے ہمدردی تھی، گول کا ہونا تھا کہ طلباء نے تالیاں بجا کر کھیل کے میدان کو سر پر اٹھا لیا۔ کھیل شروع ہوا اور دسویں جماعت کی ٹولی بڑے احتیاط سے کھیلی، نویں جماعت کی ٹولی کی ہمتیں بڑھ چکی تھیں اور اس ٹولی کے کھلاڑیوں میں غیر معمولی جوش پیدا ہو گیا تھا، مگر جوشِ مسرت نے اُن کو غیر محتاط بنا دیا تھا نتیجہ یہ ہوا کہ چند ہی منٹ میں دسویں جماعت کی ٹولی نے گول کر دیا۔ اور دسویں جماعت کے تماشائی طلباء نے پُرزور چیئرز دئے۔ اب کھیل کا وقت ختم ہونے میں چند منٹ رہ گئے تھے۔ اس لئے کھلاڑیوں نے غیر معمولی سرگرمی دکھانا شروع کی، برابر کی ٹکر تھی، کھلاڑیوں کے جوش کا عالم نہ پوچھئے ایک طوفان سا بپا تھا۔ پانی پت کی لڑائی کا سماں نظر آ رہا تھا، ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ دونوں ٹولیوں کے کھلاڑی میدان کو پسینہ میں تر کر کے واپس ہونگے، اب صرف پانچ منٹ باقی رہ گئے تھے، کہ نویں جماعت کے کھلاڑی، گیند لیکر مقابل کی طرف بڑھے، بیچ کے کھلاڑی نے کونے کے کھلاڑی کو گیند پہنچائی، اتنے میں نویں جماعت کے سامنے کے کھلاڑی

(forward) گول کے قریب پہنچ گئے، نویں جماعت کے ایک کھلاڑی نے گول کی سمت گیند کو پھینکا، گول پر کھڑے ہوئے آدمی نے گیند کو پھرتی کے ساتھ روکا، اتنے میں علیم گول کے دائرے میں پہنچ چکا تھا، نسیم دسویں جماعت کی طرف سے کھیل رہا تھا، گول پر کھڑے ہوئے لڑکے نے علیم کو نسیم سمجھ کر گیند اسکو دیدی، علیم کے لئے بہترین موقع تھا، اس نے گیند کو آہستہ سے ٹھوکا دیا اور گیند فریق مقابل کے گول کے ستونوں میں سے گذر گئی، ایک شور اٹھا۔

"گول ہوگیا، گول ہوگیا ——————"

کھیل پھر شروع ہوا، اور کوئی دو تین منٹ کے بعد ریفری کی سیٹی نے کھیل کے اختتام کا اعلان کردیا۔ نویں جماعت کے کھلاڑیوں نے اپنی اسٹکیں اچھالنی شروع کیں، دسویں جماعت کے طلباء نے گول کیپر کو نرغے میں لیکر کہا:۔

"کامنا! یہ سارا تیرا قصور ہے، تو نے علیم"
"کو گیند کیوں دیدی، ابے! کیا بوکھلا گیا تھا"

کامنا نے جواب دیا:۔

"بھائیو! میں نے علیم کو نسیم سمجھا تھا۔ ورنہ میں"
"کوئی ایسا بیوقوف تھا، کہ دشمن کو گیند دے دیتا"
"مجھے دھوکا ہوا، اپنی غلطی کا مجھے اقرار ہے، مگر یہ تو آپ سب"
"جانتے ہیں کہ علیم اور نسیم کے ملتے جلتے چہرے ہمیشہ لوگوں کو"

"دھوکے میں ڈال دیا کرتے ہیں، ــــــــــــــــ"

آئندہ سے جب کبھی نسیم اور علیم ایک دوسرے کی مخالف ٹولی میں کھیلتے، تو اُن کو ایسی امتیازی وردی پہنائی جاتی تھی کہ ایک دوسرے میں تمیز ہو سکے،

نسیم کو ادب سے خاص دلچسپی تھی، اور یہ عجیب بات ہے کہ جن طلبا کو ادب سے دلچسپی ہوتی ہے، اُن کا دِل ریاضی میں نہیں لگتا۔ نسیم کا ریاضی سے دِل الجھتا تھا وہ کہا کرتا تھا کہ "ریاضی دماغی ورزش کے لئے وضع کی گئی ہے،" اس کو ریاضی سے اس قدر نفرت تھی کہ وہ اچھا خاصا سمجھدار اور ہوشمند ہو کر، اُسکی افادیت سے دھڑلے کیساتھ انکار کرتا تھا۔ ایک مرتبہ اس نے اسکول کی بزم مباحثہ میں ریاضی کے خلاف جو مقالہ پڑھا۔ اس نے بزم میں دلچسپ مزاح کی ایک فضا پیدا کر دی، ممکن ہے اس نے یہ مقالہ صرف مزاح کے لئے لکھا ہو مگر اسکی طبیعت کو جو ریاضی سے نفرت تھی، اسکو دیکھتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس نے اپنے دل کی ترجمانی کی، یہ دوسری بات ہے کہ اس ترجمانی نے غیر ارادی طور پر مزاح کی صورت اختیار کر لی اس نے کہا:۔

"ریاضی! ایک غیر دلچسپ، بے کیف اور روکھا پھیکا مضمون ہے"

" اور ہاں! غیر دلچسپ ہی نہیں ہے بلکہ اس مضمون کے ذریعہ جھوٹ کی"

" تبلیغ بھی کی جاتی ہے، "

" موہن نے ایک لاکھ روپیہ سوہن کو دیدئے، موہن اور سوہن دو دو گھنٹہ"

" کے فاصلے سے دوڑتے رہے۔ تین کروڑ باسٹھ لاکھ چار سو پانچ روپیہ چھ آنہ "

" پانچ پائی پر دو سال کا سود کتنا ہوا؟ یہ سب جھوٹ باتیں نہیں"

"تو اور کیا ہیں؛ نہ کہیں دینے والے کا وجود ہے، اور نہ لینے والے کا پتہ"

"..... کوئلوں کی دلالی میں ہاتھ کالے! موہن اور سوہن دوڑتے دوڑتے"

"خدا کرے مر جائیں۔ طالب علم کے دماغ سے آخر کیوں ورزش کرائی جاتی ہے۔"

"باغ کا رقبہ نکالو، کمرے کی لمبائی معلوم کرو، منڈیر کی چوڑائی"

"کتنی ہے؟ گھوڑوں اور بکریوں کی تعداد بتاؤ، مردوں اور عورتوں کی"

"روزانہ مزدوری کا فرق دریافت کرو، بھلا ان باتوں سے کوئی"

"فائدہ ہے، زاویوں کی قسمیں، مثلثوں اور مسدسوں کی شکلیں، ا، ب، ج"

"زاویہ برابر ہے، ب، د، ج، زاویہ کے، یہ کوئی عقلمندی کی"

"باتیں ہیں، اجی میں کہتا ہوں تمام زاویے، ایک دوسرے کے برابر ثابت"

"ہو جائیں، تو اس میں کمال کیا ہوا؟ اس پر ستم یہ کہ ایک نقطہ اگر"

"گھٹ بڑھ جائے، تو ساری محنت برباد ہو گئی، میں کہتا ہوں کہ ریاضی"

"ذہانت کی دشمن ہے، یہ تو غبی اور کند ذہن طالب علموں کے لئے وضع"

"کی گئی ہے، ذہانت، کہیں اصولوں کی پابند ہوتی ہے، ذہانت کا طوفان"

"تو اصولوں اور ضابطوں کی دیواروں کو توڑ دیتا ہے میں ریاضی داں کو"

"دماغی پہلوان سمجھتا ہوں ———— "

نسیم کو ریاضی سے دلی نفرت تھی، اور اس نفرت نے اسے انٹرنس میں کامیاب نہ ہونے دیا۔ علیم نویں

جماعت میں کامیاب ہو کر بڑے بھائی کے ساتھ آملا۔ یہ اس زمانے کی باتیں ہیں جب دسویں کلاس (انٹرنس) کے سالانہ امتحان میں انگریزی کا زبانی امتحان بھی ہوا کرتا تھا۔ سالانہ امتحان پر ضلع کے کالج کا انگریز پروفیسر امتحان لینے کے لئے اسکول میں آیا۔ طلباء کے لئے امتحان کیا تھا عید تھی۔ طلباء بہت خوش تھے، اور وہ ایک قسم کا فخر و غرور محسوس کر رہے تھے، طلباء نے کوٹ، پتلون تیار کر لئے، اور انگریزی لب و لہجہ کی مشق کی، امتحان سے پہلے طلباء میں کتنی دلچسپ گفتگو ہوا کرتی تھی:۔

"فیروز! یہ انگریز پان سے بہت چڑتے ہیں، کہیں اس دن پان کھا کر نہ آنا ————"

"سنا ہے کہ سو نمبر تو فقط لباس کے ہوتے ہیں، پچھلے سال ہری دت کو اسی لئے ناکام ہونا پڑا، اس کے پتلون میں بہت سی شکنیں پڑی ہوئی تھیں، صاحب نے پتلون کو دیکھ کر بہت برا مانا"

"جمال! یہ انگریز ہے انگریز، گھر کے ماسٹر نہیں ہیں"

"تجھے دوسروں کی کاپی دیکھنے کی بہت عادت ہے، یہ انگریز بلا کے تاڑنے والے ہوتے ہیں ————"

"میں تو روزانہ اسٹیشن پر جا کر اسٹیشن ماسٹر سے بات چیت کرتا ہوں، اسٹیشن ماسٹر انگریز نہیں ہے مگر ہے تو عیسائی! اسے انگریزوں کی صحبت تو ملی ہے ————"

"صاحب کو ذرا جھک کر سلام کرنا، تھوڑا مسکرانا بھی، اور ذرا"
"تن کر کھڑے ہونا۔ ہر بات میں (sir) کہنا، اور رخصت"
"ہوتے وقت بھی اسی طرح جھک کر سلام کرنا ——————"
"ارے بھائیو! کتاب سے کوئی سوالات تھوڑی کئے جائیں گے؟ وہاں تو"
"عام معلومات کے سوالات ہوتے ہیں، صوبہ کے گورنر کا نام، وائسرائے"
"کے پرائیویٹ سیکرٹری کا نام، ہوائی جہاز کا موجد کون تھا؟ ہندوستان کے"
"سب سے بڑے ریلوے جنکشن کا نام کیا ہے؟"
"موٹر کار کے کسی نئے ماڈل کا نام بتاؤ؟ پتلون کو پاجامے اور دھوتی پر"
"کس لئے ترجیح ہے؟ ایک مرغی مہینہ میں زیادہ سے زیادہ کتنے انڈے"
"دیتی ہے؟ کتوں کی کتنی قسمیں ہیں؟ جنگ عظیم میں تمہارا کوئی"
"رشتہ دار شریک تھا؟ اس قسم کی باتیں زبانی امتحان میں دریافت"
"کی جاتی ہیں، اور ہاں دو سال پہلے تو صاحب نے ایک لڑکے سے پوچھا کہ"
"تمہارے مدرسہ میں کل کتنے دروازے ہیں؟"

بہر حال انگریز پروفیسر امتحان لینے کے لئے آیا، اِملا (Dictation) کے بعد زبانی امتحان شروع ہوا، تین تین لڑکوں کی ٹولیاں بلائی جانے لگیں، سلیم کو دوسری ٹولی میں بلایا گیا، علیم آخری ٹولی سے، ایک نمبر پہلے تھا، علیم انگریز پروفیسر کے سامنے پہنچا تو اس نے علیم کی طرف مخاطب ہو کر کہا۔

"تم دوبارہ کیوں آگئے، کیا مجھے دھوکا دینا

چاہتے ہو ———— "

علیم نے جواب دیا:۔

"میں تو پہلی دفعہ آیا ہوں، میں تو آپ کو دھوکا دینے کا

تصور بھی نہیں کرسکتا ———— "

اس پر پروفیسر کے غصہ کا پارہ کچھ اور چڑھ گیا۔

"تم میری آنکھوں میں خاک ڈالنے کی کوشش کرتے ہو"

"گستاخی، بدتمیزی، دیدہ دلیری۔ امیری زندگی کا"

"یہ پہلا واقعہ ہے ———— پروفیسر نے غصہ میں آکر کہا۔

"صاحب! میں قسم کھا کر عرض کرتا ہوں کہ میں پہلی مرتبہ"

"آیا ہوں، آپ ہیڈ ماسٹر صاحب سے ...... دریافت ... !" علیم نے گھبرائے ہوئے لہجہ میں جواب دیا۔

پروفیسر نے ہیڈ ماسٹر کی طرف مُستفسرانہ نگاہوں سے دیکھا۔ ہیڈ ماسٹر نے پروفیسر کی غلط فہمی رفع کرنے کی بہت کچھ کوشش کی مگر پروفیسر کو اطمینان نہ ہوا۔ آخر کار نسیم کو دوبارہ بلایا گیا جب کہیں جاکر، پروفیسر صاحب مطمئن ہوئے۔ اسکول سے رخصت ہوتے وقت، پروفیسر نے نسیم اور علیم دونوں بھائیوں کو بلایا، اور مسکرا کر کہا:۔

"تم دونوں میں سے ہر بھائی کا چہرہ ایک دلچسپ"

"مغالطہ ہے۔"

"نسیم اور علیم نے انٹرنس میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد، کالج میں داخلہ کی کوشش نہیں کی نسیم وعلیم کے والد شیخ فہیم الدین بہت ہی عقلمند اور زمانہ کی نبض پہچاننے والے انسان تھے، انہوں نے دیکھا کہ بی اے اور ایم اے تیس چالیس کی نوکری کے لئے مارے مارے پھرتے ہیں، انٹرنس کامیاب کو کون پوچھیگا شیخ جی کے بعض دوستوں نے جو بڑے عہدوں پر تھے، علیم اور نسیم کی نوکری کا ذکر بھی نکالا، مگر شیخ جی نے صاف انکار کر دیا۔ کہ میں اپنے بیٹوں کو چالیس پچاس روپیہ پر فروخت نہیں کر سکتا میں نے اپنے بیٹوں کو غلامی کرنے کے لئے تعلیم نہیں دی۔ شیخ فہیم الدین کے یہاں تھوڑی بہت زمینداری تھی، اور کچھ تجارت کا کاروبار بھی ہوتا تھا۔ زمینداری بڑے جھگڑے کی چیز ہے، کسانوں سے لگان کی وصولیابی، نالش، قرقی ضبطی، بندوبست کے محکمے پٹواری کا حق، قانون گو کی خوشامد، پولس کی چاپلوسی، ڈپٹی صاحب کے لئے رسد کا بندوبست، غرض چھوٹے زمیندار کو بڑی مشکل اور دوڑ دھوپ کے بعد لگان وصول ہوتا ہے۔ شیخ فہیم الدین نے اپنی تمام زمینداری بیچکر، شہر میں دوکانیں خریدلیں، شہر کی دوکانوں کی جائداد کا کیا کہنا، ادھر مہینہ ختم ہوا، اور آمدنی شروع ہوگئی۔ دوکانداروں کو تو کرایہ ادا کرنے کی فکر رہتی ہے اور وہ سب سے پہلے کرایہ ادا کرتے ہیں۔ پھر اگر کوئی ضرورت آپڑے تو دوکانداروں سے دو چار ماہ کا پیشگی کرایہ بھی لیا جا سکتا ہے۔ شیخ جی نے نسیم اور علیم کو تجارت کے دھندے میں لگادیا۔ اور جب دونوں بھائیوں کا کام چل نکلا، اور شیخ جی کو اُن کی طرف سے اطمینان ہو گیا، تو تمام کاروبار ان ہی دونوں پر چھوڑ دیا۔

کاروبار کے ایک معاملہ میں نسیم و علیم کو ایک مقدمہ دائر کرنا پڑا۔ مقدمہ کی نوعیت کچھ ایسی تھی۔ کہ نسیم مدعی تھا، اور علیم کا شمار گواہوں میں تھا پہلی پیشی کو نسیم کا بیان ہوا۔ اور فریقِ مخالف کے وکیل نے جرح کی۔ بیچ میں تعطیلات آگئی تھیں، ایک ہفتے کے بعد جا کر کچہری کھلی، اور اسی دن نسیم کے مقدمہ کی دوسری پیشی تھی چپڑاسی نے علیم کا نام لیکر آواز دی، اور علیم دوڑتا ہوا، اجلاس میں داخل ہو گیا۔

"تمہارا نام"

"علیم الدین"

"باپ کا نام"

"شیخ فہیم الدین"

"پیشہ"

"تجارت"

منصف نے سوالات کرنے کے بعد، علیم کو گہری نظروں سے دیکھا، اور پھر جھنجھلا کر بولا۔

"عدالت کو دھوکا دینا چاہتے ہو، خود ہی مدعی ہو اور"

"خود ہی گواہ ہو ——————"

علیم کچھ کہنا ہی چاہتا تھا۔ کہ فریقِ مخالف کے وکیل نے منصف کا یہ رنگ دیکھ کر کہنا شروع کیا۔

"حضور! آپ ہی انصاف فرمائیں کہ مدعی کتنا"

"دھوکہ باز ہے، دھوکے اور فریب کی کوئی انتہا ہے"

" سرکار! یہ مقدمہ بالکل جھوٹا ہے، میرے مؤکل کو پریشان "

" کرنے کے لئے دعویٰ دائر کیا گیا ہے، میرا مؤکل سیدھا سادا "

" آدمی ہے، میں سمجھتا ہوں کہ اب مجھے اس مقدمہ میں کچھ کہنے کی ضرورت "

" ہی نہیں ہے، سرکار پر تمام واقعات خود بخود روشن "

" ہو گئے، میں صرف انصاف چاہتا ہوں، انصاف، بس انصاف "

" ایسا انصاف جو دودھ کو دودھ اور پانی کو پانی کر دے "

اس پر منصف نے درشت لہجہ میں کہا:۔

" میں مدعی کو فوجداری سپرد کر دینے کی رائے دونگا، عدالت کو "

" اس طرح دھوکا دینا کوئی مذاق نہیں ہے۔ "

علیم منصف کی باتیں سنکر کچھ سٹ پٹا سا گیا۔ اس نے اپنے وکیل کی طرف غور سے دیکھا۔ نسیم کا وکیل ایک سنجیدہ ایڈووکیٹ تھا، وہ سمجھ رہا تھا کہ منصف کو علیم کی شباہت دھوکے میں ڈال رہی ہے، وہ کہنے سے قبل مسکرایا، یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ منصف اور فریقِ مخالف کے وکیل کی باتیں ہنسنے ہی کے قابل ہیں، اُن میں کوئی وزن نہیں ہے۔ منصف نے وکیل کی مسکراہٹ کے منشار کو اچھی طرح محسوس کیا۔

" وکیل صاحب! آپ مسکراتے ہیں، ایسے دغا باز "

" مؤکلوں کی آپ وکالت کرتے ہیں ——— " منصف نے زور سے کہا۔

" سرکار! میں کیا کروں کہ ضبط کرنے کے باوجود مجھے ہنسی آرہی ہے "

"اس بے اختیاری کی میں معافی چاہتا ہوں، علیم الدین جس کو"

"عدالت مدعی نسیم احمد سمجھ رہی ہے، گواہ نمبر ا ہے، مدعی"

"تو میرے بستر پر بیٹھا ہوا ہے۔ مجھے افسوس تو اپنے لائق"

"دوست وکیل پر آتا ہے کہ انہوں نے سب کچھ جانتے ہوئے"

"عدالت کو مغالطہ میں ڈالنے کی کوشش کی، اور ایک"

"کھلی ہوئی غلط فہمی سے ناجائز فائدہ اٹھانا چاہا، اس سے صاف"

"ظاہر ہے کہ اُن کا معاملہ کس قدر کمزور بنیاد رکھتا ہے، اور"

"اُن کا مقدمہ بے بنیاد استدلالوں کی پناہ ڈھونڈھ رہا ہے" وکیل نے سنجیدہ انداز میں جواب دیا۔

"وکیل صاحب! آپ یہ کیا فرما رہے ہیں، مجھے"

"مغالطہ ہو رہا ہے، اچھا! آپ مدعی کو بلوائیے ———" مُنصف نے آنکھوں کو ملتے ہوئے کہا۔

اُن کی آن میں نسیم آ گیا، مُنصف نسیم اور علیم کو بہت دیر تک غور سے دیکھتا رہا اور پشیماں تبسم کے ساتھ بولا:۔

"واقعی مجھے مغالطہ ہوا، اتنے ملتے جلتے چہرے! —"

"حیرت ہے، اچھا! ——— ! —"

مُنصف اس واقعہ سے اس قدر متاثر ہوا، کہ اس نے اپنے فیصلہ میں اس کا ذکر کر دیا، اُس نے

تنقیحات سے بحث کرنے کے بعد لکھا:۔

"اس مقدمہ میں مجھ کو سب سے عجیب بات یہ نظر آئی کہ مدعی اور"

"گواہ نمبرا کی صورتیں اتنی ملتی جلتی تھیں، کہ اُن میں امتیاز"

"مشکل تھا۔ اگرچہ یہ دونوں بھائی بھائی ہیں، مگر بھائیوں کے"

"چہروں میں اتنی قریبی مشابہت میرے دیکھنے اور سننے میں نہیں آئی"

"اس چیز کا اظہار ممکن ہے فیصلہ کے موضوع کے خلاف"

"ہو، مگر اس تاثر کا اظہار بہر حال ضروری تھا، اور کیا عجب ہے"

"کسی مقدمہ میں میرے اس تاثر کا اظہار دوسروں کے لئے رہبری کا باعث"

"ہو ———————————————"

خوب جوان ہو کر بھی، نسیم اور علیم کی مشابہت میں کوئی فرق نہ آیا، اور یہ عجیب اتفاق ہے کہ وہ دونو لباس بھی ملتا جلتا پہنتے تھے، بعض لوگوں کا خیال تھا وہ دونوں ارادتاً ایک سا لباس پہنتے ہیں۔ اور اُن کا مقصد لوگوں کو فریب میں مبتلا کرنا ہے۔ میرے خیال میں لوگوں کا یہ خیال درست نہیں تھا۔ دونوں بھائی طبیعت کے اتنے شریف واقع ہوئے تھے، کہ اُن سے اس قسم کی توقع رکھنا، دردناک ظلم تھا۔ شیخ فہیم الدین کی تربیت نے اُنکو انسان بنا دیا تھا، آپ کہینگے۔ کہ ہر آدمی انسان ہوتا ہے لیکن میں کہتا ہوں کہ ہر آدمی انسان نہیں ہوتا۔ اگر اس دنیا میں انسانوں کی کثرت ہو جائے۔ تو دُنیا کی مکروہ فضا، انسانیت اور نیکی سے بھر جائے۔! کہ اس منافق دنیا میں آدمی بہت ہیں! اور انسان بہت ہی کم! نسیم اور علیم واقعی انسان تھے، ایسے انسان

جو کسی کو نقصان پہنچانے کا تصور بھی نہ کرتے ہوں جن کی زندگی منافقت اور تکلف سے پاک ہو، اور جن کا ہر قدم بھلائی کی جانب اٹھتا ہو۔

شیخ فہیم الدین نے حج جانے سے قبل، دونوں کا بیاہ کر دیا۔ شیخ صاحب نے شادی میں سادگی اور کفایت کو ہر طرح سے ملحوظ رکھا، بعض لوگوں نے انگشت نمائی بھی کی، مگر شیخ جی اپنے مضبوط ارادے کو کہیں بدلنے والے تھے، شیخ جی کے ایک عزیز نے تو بھری مجلس میں کہہ دیا۔

"بھائیو! یہ بیاہ تھوڑی ہے۔ یہ

"تو تیجا اور چالیسواں ہے نہ رنڈی، نہ باجا، نہ بھانڈ"

"نہ آتش بازی۔ یہ فہیم الدین تو ملا بن گیا ہے"

شیخ جی نے تمام اعتراضات اس کان سنے، اور اس کان اڑا دئے حقیقت بھی یہ ہے۔ کہ مصلحین کو ہمیشہ طنز و طعن کا نشانہ بننا پڑتا ہے، اصلاح کرنیوالے اس قسم کے اعتراضوں کی پرواہ نہیں کرتے وہ ضبط و وقار کے اعتبار سے چٹان اور عمل کے لحاظ سے پانی کی موج ہوتے ہیں۔

نسیم اور علیم بڑی ہنسی خوشی کی زندگی بسر کرنے لگے، بیویاں بھی ہر لحاظ سے بہتر ملیں، علیم کی بیوی شکیلہ، ذرا منہ زور اور شوخ تھی، ایک دن نسیم کرسی پر بیٹھا ہوا کچھ لکھ رہا تھا، شکیلہ پیچھے سے آئی اور اور یہ سمجھ کر آئی کہ علیم بیٹھا ہوا ہے، اس نے پیچھے سے آکر نسیم کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ دئے، اور بڑے انداز کے ساتھ بولی :۔

"تم کہتے تھے، کہ ہر آدمی کو ستائے جانے میں لطف آتا ہے"

"اب میں دیکھونگی، تم کو کتنا لطف آتا ہے"،

نسیم نے گھبرا کر گردن کو جھٹکا دیا۔ شکیلہ کے نازک ہاتھ آنکھوں سے ہٹ گئے، اب جو نسیم نے پھر کر دیکھا ہے تو شکیلہ گھبرا کر بولی :-

"آپ ہیں بھائی جان! میں تو .... سمجھی تھی۔!"

گھبراہٹ

گھبراہٹ "پشیمانی" کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔

اور

پشیمانی کی شدت خود ایک قسم کی گھبراہٹ ہے۔

زمین کی طرح

انسانی نفسیات

بھی

گول ہے!

"جاں نذر دینی بھول گیا اضطراب میں"

مگر

شاعروں کی گھبراہٹ اور اضطراب، ایک

"رومان"

ہے

گھبراہٹ

بعض لوگ اچھے خاصے سمجھدار اور ہوشمند ہوتے ہیں، مگر اُن میں ایک خاص قسم کی وحشت اور گھبراہٹ پائی جاتی ہے۔ جمیل کا شمار بھی ایسے ہی لوگوں میں تھا، جمیل نے بہت کچھ لکھا پڑھا تھا، اور جو کچھ پڑھا تھا۔ سمجھ کر پڑھا تھا، عام طور پر ذہین لڑکے محنتی نہیں ہوتے، مگر جمیل نے ذہانت کے اس کلیہ میں ایک استثنا کا اضافہ کر دیا۔ وہ ذہین بھی تھا اور محنتی بھی، کتاب کا تو وہ کیڑا تھا، جو کتاب لیتا ختم کر کے چھوڑتا، مطالعہ اس کا سب سے زیادہ دلچسپ مشغلہ تھا۔ وہ ہر فن کی کتابیں پڑھتا، اور اپنی نوٹ بک میں ہر کتاب کے متعلق ضروری اشارات درج کر لیا کرتا، یہی سبب تھا کہ لوگ اس کی معلومات سے مرعوب تھے۔ ایک ہی نشست میں، دوست، احباب مختلف سوالات کرتے اور جمیل ہر سوال کا جواب دیتا۔

" میرے خیال میں فارسی کا پہلا شاعر رودکی تھا، بہرام گور کو میں "

" فارسی کا پہلا شاعر تسلیم نہیں کرتا، بہرام کا شعر جسے اُس کی "

" طرف منسوب کیا جاتا ہے، فارسی کا پہلا شعر نہیں ہو سکتا، کیونکہ یہ "

" شعر بہت مربوط ہے، اور اس سے شاعر کی مشاقی کا پتہ چلتا ہے۔ "

" بو علی سینا کے کمال میں کس کو کلام ہو سکتا ہے، مگر اُس نے جو "

" ارسطو کے فلسفہ کی شرح کی ہے، اس میں جابجا ٹھوکریں کھائی ہیں "
" بعض جگہ تو ایسا ہوا ہے، کہ بوعلی سینا نے ارسطو کا مفہوم ہی غلط سمجھ "
" اس لئے سرے سے شرح ہی اُلٹی ہو گئی - ابن رُشد نے بوعلی سینا کی "
" فلسفیانہ لغزشوں پر بسیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔
" بھائی! میں تمام ائمہ کا احترام کرتا ہوں، لیکن جہاں تک "
" تفقہ کا تعلق ہے، میں حضرت امام بوحنیفہ کو سب پر ترجیح دیتا ہوں "
" اُن کے تفکر و اجتہاد میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی اصابت رائے کی "
" جھلک نظر آتی ہے ——————————— "

" قانون بین الممالک (International Law.) "
" کی رو سے، جب کوئی دریا، دو ریاستوں کے بیچ میں حائل ہو جاتا ہے "
" تو دونوں ریاستیں اپنے اپنے حدود کی سمت دریا کے "
" نصف کی مالک ہوتی ہیں۔
" ہربرٹ اسپنسر واقعی تعلیم کا ماہر تھا، مگر اس نے بچوں کی "
" نفسیات کو زیادہ پھیلا کر بیان نہیں کیا - اور جو کچھ بیان کیا ہے "
" اس سے ہر شخص فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ فلسفہ بہت مشکل مضمون ہے "
" لیکن اس کو آسان بھی بنایا جا سکتا ہے۔

اس فلسفیانہ بحث کے دوران میں کسی نے موٹروں کا ذکر چھیڑ دیا، اس پر جمیل نے کہا:۔

"ماسٹر بیوک، اسٹوڈ بیکر، ایریکن، شیورلیٹ، آرم اسٹرانگ"

"نیش، اے بی آسٹن، میں تمام موٹروں میں بیٹھا ہوں، اور بیٹھا"

"کیا ہوں، میں نے ان کے متعلق بہت سی کتابیں پڑھی ہیں، اور تھوڑا"

"بہت تجربہ بھی کیا ہے میرے خیال میں ۱۹۳۰ء کے نئے ماڈل کی"

"شیورلیٹ سب سے بہتر ہے۔ خوبصورت بھی ہے اور پائدار بھی ہے"

"چڑھائی پر تو اڑتی ہوئی جاتی ہے۔ پٹرول بھی کم صرف"

"ہوتا ہے۔ میرے ایک دوست کے پاس یہی موٹر چالیس ہزار میل چل چکی ہے، مگر"

"انجن ذرا بھی آواز نہیں دیتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ موٹر ابھی حال ہی کی"

"خرید کی ہوئی ہے ——————"

اسی سلسلہ میں پرندوں کا ذکر نکل آیا۔ جمیل کہیں خاموش رہنے والا تھا:۔

"بلبل تو ہندوستان میں پیدا ہی نہیں ہوتی یہ تو ایران کی"

"چڑیا ہے۔ یہاں کی ہوا ایران کی بلبل"

"کو راس نہیں آتی۔ اس کے لئے تو ایسے میدان ہونے"

"چاہئیں جہاں گلاب کے تختے ہی تختے ہوں، ہمارے یہاں گلاب خودرو"

"نہیں ہوتا ...... نیپال کے علاقہ کی قمری سب سے زیادہ حسین"

" ہوتی ہے، اس کے گلے کے طوق کے قریب زردی مائل دھاری سی نظر"

" آتی ہے" ——————————— "

" یہ لوگ بڑی غلطی کرتے ہیں کہ مختلف جنس کے کبوتروں کو"

" ایک ہی جگہ بند کر دیتے ہیں۔ نقا کبوتر تو اپنی جنس کے سوا دوسری"

" قسم کے کبوتر کی معیت گوارا نہیں کرسکتا ——————————— "

جمیل کی معلومات کی وسعت کا اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ اس کو ہر فن میں کس قدر درک حاصل تھا، اور اس نے مختلف علوم و فنون کس قدر سمجھ کر پڑھے تھے۔ کوئی شک نہیں کہ جمیل بہت باتونی تھا، مجمع میں بھلا مجال ہے، جو اس کے ہوتے ہوئے کوئی بول سکے، مگر باتونی لوگ عام طور پر اتھلی معلومات رکھتے ہیں، لیکن جمیل کی معلومات، وسیع اور عمیق تھیں، پھر قدرت نے اسکی زبان کو لوچ اور نرمی عطا فرمائی تھی، گھنٹوں بولتا اور لوگ دلچسپی کے ساتھ سنتے جاتے۔ جمیل بولتا کیا تھا، سامعہ پر دودھ اور شہد کا مینہ برساتا تھا۔

ایک طرف تو اس کی ذہانت کا یہ عالم تھا، اور دوسری طرف اس کی وحشت اور گھبراہٹ اس کو اکثر موقعوں پر نادم و پشیمان کرتی، اور جو لوگ اس سے واقف نہ تھے۔ اُن پر تو اسکی گھبراہٹ کا بہت برا اثر پڑتا اور وہ اسکو سادہ لوح سمجھتے۔ اسکی گھبراہٹ کے چند نمونے یہاں پیش کئے جاتے ہیں۔

ایک مرتبہ آپ ریل گاڑی میں بیٹھے ہوئے کچھ لکھ رہے تھے، لکھتے لکھتے کاغذ جیب میں رکھ لیا پھر کچھ خیال آیا تو کاغذ، جیب سے نکال کر چاک کر دیا، کاغذ کی تہ کیساتھ ریل کا ٹکٹ بھی آگیا۔ گھبراہٹ کی انتہا ہے

کہ کاغذ کے ساتھ ٹکٹ کے بھی پرزے کر دئے، نتیجہ یہ ہوا کہ کرایہ بھی دینا پڑا، اور بیوقوف بھی بننا پڑا۔

ایک دفعہ آپ نے کچھ خطوط لکھ کر نیچے کی جیب میں رکھ لئے، اُسی جیب کے ایک لفافہ میں نوٹ رکھے ہوئے تھے، آپ نے نوٹ والا لفافہ، خطوط کے ساتھ لیٹر بکس میں ڈال دیا۔ بارہ بجے اپنی غلطی کا احساس ہوا تو ڈاکخانہ میں جاکر اطلاع دی، وہ تو ڈاکخانہ کا بابو اچھی طبیعت کا تھا کہ جمیل کو نوٹ مل گئے، کوئی ٹیڑھی طبیعت کا ہوتا تو ڈاک خانہ کے قوانین میں باریکیاں پیدا کر کے، کارروائی کو طول دیکر چھوڑتا۔ خیر نوٹ تو مل گئے، مگر جمیل کا ڈاکخانہ والوں نے خوب مذاق اُڑایا، ڈاک خانہ والوں کے جملے کتنے دلچسپ تھے:۔

"اجی! اس آدمی کے چہرے سے بیوقوفی برستی ہے"

"لانبی ناک والے ہوتے ہی کچھ اول جلول ہیں"

"سُنتے ہیں کہ بمبئی میں کسی سیٹھ نے پرنس آف ویلز کے لئے"

"نوٹ جلا کر چائے بنوائی تھی، وہ سیٹھ ایسا ہی"

"بیوقوف ہوگا ——————"

"ارے! بزبوجی نے کچھ نہ کہا، کہ معاملہ رفع دفع کر دیا"

"ایسے آدمی کو تو کچھ دن پھرانا تھا ——————"

"یہ مسلمان نوجوان ہوتے ہی بفکرے ہیں۔ پیسہ کو کنکری"

"سمجھتے ہیں کنکری! ہمارے محلے میں سید صاحب"

"کے لڑکوں کو دیکھو، ہزاروں روپیہ پانی کی طرح بہا دیا"

"یہ آدمی نہیں ہے پاجامہ ہے پاجامہ! واہ میاں جمیل!"

ایک دن جمیل کا ایک دوست بازار میں ملا، جمیل کے دوست نے اُسے کھانے کی دعوت دی، ابھی یہ دوست بات چیت ہی کر رہا تھا، کہ جمیل کا کوئی دوسرا ملنے والا آگیا، جمیل کے دوست نے چلتے وقت کہا کہ

"میں نے مکان تبدیل کر دیا ہے۔ میں جس مکان میں پہلے"

"رہتا تھا، اسی مکان میں پھر آگیا ہوں ——"

جمیل سے ایک چھوڑ دو آدمی بازار میں باتیں کر رہے تھے، اس کو اپنی عادت کے موافق گھبرا ہی جانا چاہیئے تھا، دوست کے آخری جملے جمیل کی گھبراہٹ کی نذر ہو گئے، چلتے وقت جمیل نے اس سے ہاتھ ملا کر کہا:۔

"بھئی! ضرور آؤنگا، ضرور آؤنگا! بھلا تمہاری"

"دعوت چھوڑ سکتا ہوں، تمہارے یہاں کے شامی کباب کھا کر"

"تو زبان ہفتوں چٹخارے بھرا کرتی ہے۔"

"جمیل دوست کی بتائی ہوئی تاریخ پر گھر سے روانہ ہوا، دوست کے آخری جملے تو اس نے سنے ہی نہ تھے وہ اسی مکان پر پہنچا جس مکان کے متعلق اس کے دوست نے کہا تھا کہ میں نے اب وہ مکان چھوڑ دیا ہے جمیل بے تکلفی کے ساتھ بیٹھک میں جا کر بیٹھ گیا، اور تھوڑی دیر انتظار کے بعد چلّانا شروع کیا

"یار! طاقتِ مہمان نہ داشت، خانہ بہ مہمان گذاشت"

"بھائی اچھی دعوت کی، مہمان حاضر، میزبان غائب! ——"

"ہاں! معلوم ہے۔ بھابی جان بال سنوار رہی ہونگی، اور تم آئینہ"

"لئے کھڑے ہو گے، بھائی! ایسا زن مرید دیکھا نہ سُنا۔"

"تمہارے یہاں تو "ہوم رول" ہے ..... اور ہاں! بھابی جان سے"

"اگر تمہارے "وہاں" جانے کا ذکر کر دوں، تو کیا ہو ——————"

"قاسم جلدی آؤ، میں بہت دیر سے اکیلا بیٹھا ہوا"

"تاپ رہا ہوں۔

اس مکان میں جمیل کے دوست کے چلے جانے کے بعد، پولس کا دیوان آگیا تھا۔گھر میں عورتیں تھیں، دیوان تھانہ میں تھا۔عورتوں نے پردے سے جھانک کر دیکھا تو کوئی نیا شخص بیٹھا ہوا اول فول بک رہا تھا عورتیں گھبرائیں، انہوں نے پڑوس میں خبر کی، وہاں سے ایک مرد آیا۔اس کے آتے ہی جمیل نے چلا کر کہا۔

"یہ قاسم کہاں گیا ہے؟ بھلا یہ کوئی شرافت کی بات ہے"

"کہ ہم اکیلے بیٹھے ہوئے ہیں، اور آپ اپنے مزے اڑا رہے ہیں"

"کیا تم قاسم کے سالے ہو —— !

ہندوستانی کے لئے (صوبہ بمبئی کو چھوڑ کر) "سالا" اتنی بڑی گالی ہے، کہ اس گالی پر خون خرابے ہو جاتے ہیں، برسوں کے تعلقات آن واحد میں کچے دھاگے کی طرح ٹوٹ جاتے ہیں، آنیوالے شخص کے تن بدن میں آگ ہی تو لگ گئی۔

"آپ ہوش میں تو ہیں، میں دیوان جی کا سالا"

"نہیں ہوں، آپ ہی ہونگے! ——————" آنیوالے شخص نے کہا۔

"اچھا بھیّا! غلطی ہوئی، معاف کرو، مگر یہ قاسم ہے کہاں!" جمیل نے گھبرا کر جواب دیا۔

"کون قاسم! کیا آپ پئے ہوئے ہیں، قاسم صاحب"

"کو تو مکان چھوڑے ہوئے، ایک مہینہ سے کچھ اُوپر ہو گیا"

"یہ تو بڑے تھانہ کے دیوان جی کا مکان ہے"———— "آنیوالے نے سنجیدہ انداز میں کہا۔

یہ سُنکر جمیل بہت سٹ پٹایا، عورتیں اس کو پردے سے، غصّہ بھری نگاہوں سے دیکھ رہی تھیں، چوڑیوں کی آواز کا نغمہ بہت ہی دلکش اور جذبات کو چونکا دینے والا ہوتا ہے، مگر جب پس پردہ عورتوں کے ہاتھوں کی چوڑیاں بجتی تھیں، تو جمیل کی پشیمانی کچھ اور بڑھ جاتی تھی۔ بات یہ ہے کہ پشیمانی اور انفعال کے عالم میں جذبات پر اوس پڑ جاتی ہے۔ جمیل پشیمانی دور کرنے کے لئے قاسم کو بُرا بھلا کہتا ہوا، وہاں سے چل دیا

جمیل نہایت ہی حساس اور نازک مزاج واقع ہوا تھا، اسکی گھبراہٹ سے جو ندامت اُس کو اُٹھانی پڑتی، وہ اس کے لئے قلبی اذیت اور روحانی کوفت کا باعث ہوتی، وہ ہر پشیمانی کے بعد چند دن بڑے احتیاط اور رکھ رکھاؤ کے ساتھ گذارتا۔ لوگوں سے بہت کم ملتا، اور جب کسی سے ملنے کا اتفاق ہوتا، تو رُک رُک کر بات چیت کرتا، غرض ہر ندامت کے بعد اُس پر سنجیدگی کا ایک دورہ پڑتا، وہ بھی اتنا شدید، کہ گھر کے لوگ دہائی دینے لگتے۔ اس تازہ ترین گھبراہٹ کے بعد جو وہ سنجیدہ بنا ہے، اُس کا اندازہ، ذیل کی گفتگو سے ہو سکیگا،

دُنیا جانتی ہے کہ بیوی اور شوہر کے تعلقات انتہائی بے تکلفی کے ہوتے ہیں،

بیوی اور شوہر میں غیریت نہیں ہوتی سنجیدہ سے سنجیدہ شوہر کو بھی بیوی کی بارگاہ ناز میں ھلنسوڑ اور بے تکلف بننا پڑتا ہے حقیقت یہ ہے کہ ازدواجی تعلق ہنسی خوشی، اور پیار محبت کا تعلق ہے، اگر اس فضا میں پہنچکر بھی آدمی فلسفی بنا رہے، تو پھر ایسے آدمی اور پتھر کے ٹکڑے میں کیا فرق ہے، کیونکہ جہاں تک جامد سنجیدگی کا تعلق ہے، پتھر کا ٹکڑا اپنا جواب نہیں رکھتا نسیم سحری کے خوشگوار جھونکے ہوں، یا بادِ صرصر کا طوفانی ارتعاش، پتھر کا ٹکڑا اپنی جگہ سے نہیں ہلتا۔ وہ بدستور پڑا رہتا ہے۔ جمیل رنگین مزاج تھا، بیوی سے اس کو بڑی محبت تھی، مگر اس کو کیا کیا جائے، کہ گھبراہٹ کی ندامت اسکو خواہ نخواہ سنجیدہ بننے پر مجبور کرتی تھی

"آپ میرے لئے بازار سے ساری نہیں لائے" ——— بیوی نے دریافت کیا۔

"میں گیا تو تھا، مگر مجھے افسوس ہے کہ راستہ میں"

"ایک دوست سے ملاقات ہوگئی، اور میں بازار"

"نہ جا سکا ——— " ——— جمیل نے جواب دیا۔

"تو پھر آپ بازار کب جائیں گے؟" ——— بیوی نے پوچھا

"میں یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ کب جاؤں گا، میں"

"اپنی ڈائری دیکھ کر صحیح تاریخ بتا سکوں گا۔ ——— جمیل نے کہا

"آپ کیسی روکھی پھیکی باتیں کر رہے ہیں آج ——— !" ——— بیوی نے پوچھا۔

"میں تو اصولی بات چیت کر رہا ہوں، اصول تو عام"

"طور پر رنگین نہیں ہوتا ——— ۔" جمیل نے جواب دیا۔

"اچھا! آپ آج اتنے متفکر کیوں نظر آتے ہیں"

"آپ تو بات کرنے میں ذرا بھی نہیں مسکراتے" بیوی ذرا انداز کیساتھ بولی

"بلا وجہ مسکرانیکی کیا ضرورت ہے، ہنسنے سے دل مردہ"

"ہو جاتا ہے متفکر تو ہر انسان کو ہونا چاہیئے، کائنات"

"کا ہر ذرّہ انسان کو غور و تفکر کی دعوت دیتا ہے ——— جمیل نے جواب دیا۔

جمیل کی سنجیدہ اور بے کیف باتوں نے اسکی بیوی کو اس قدر الجھن میں ڈالا۔ کہ غریب اپنا سا منہ لیکر رہ گئی۔ جمیل کی سنجیدہ مزاجی کو اس بات کا احساس بھی نہ ہوا کہ پھول سے نازک دل پر کیا گزرتی ہے؟ ندامت کے احساس نے اس کو اس قدر سنجیدہ بنا دیا تھا۔ کہ پھولوں کی مسکراہٹ بھی شاید اس کی سنجیدگی کو ناگوار تھی۔

جمیل کی بیوی شمیم اپنے میکے گئی ہوئی تھی، کئی مہینہ میکے میں رہتے ہو گئے تھے، ادھر جمیل مالی مشکلات میں مبتلا ہو گیا، اور اسی سبب وہ زیادہ دن گھر پر نہ رہ سکا، جمیل بیوی کی طرف سے غافل نہ تھا، مگر سفر میں زیادہ دن رہنے کے باعث شمیم کے خطوط کا جواب نہ دے سکا، عام طور پر مرد کہا کرتے ہیں کہ عورتیں بدگمان ہوتی ہیں، میں کہتا ہوں کہ مرد، عورتوں سے کم بدگمان نہیں ہوتے، مگر اس کا کیا علاج کہ اپنی آنکھ کا شہتیر نظر نہیں آتا، اور دوسرے کی آنکھ کا تنکا بھی دکھائی دیتا ہے۔ عورتیں، اگر مردوں کی طرف سے بدگمانی کرتی ہیں۔ تو وہ حق بجانب ہیں۔ عام طور پر مرد، اپنی بیویوں کے سامنے غیر عورتوں کے حسن کے افسانے مزے لیکر بیان کرتے ہیں۔ اپنی ہوسناکی (جس کو وہ محبت کہتے ہیں) کے واقعات سناتے ہیں، غریب عورتیں

مردوں کی خاطر، خندہ پیشانی کے ساتھ سب کچھ سنتی ہیں، ضبط کی انتہا ہے کہ اُن کے نازک دلوں پہ آرے چلتے ہوتے ہیں۔ اور وہ مسکراتی ہوتی ہیں۔ عورت سب کچھ برداشت کر سکتی ہے، مگر رقابت برداشت نہیں کر سکتی۔ اور یہ حُسن پرست مرد اپنی بیویوں کے سامنے ایسے ہی ذکر نکالتے ہیں۔ جو رقابت کے جذبہ کو بیدار کرتے ہوں۔ ہزاروں مرد ایسے نکلیں گے، جن کے پلنگ کے سرہانے حسین عورتوں کی تصویریں لٹکی ہوتی اور جن کی الماریاں حسین عورتوں کی تصویروں کے مرقعوں سے بھری ہوتی ہوں گی۔ ان تمام باتوں کے ہوتے ہوئے اگر بیویاں شوہروں سے بدگمان ہو جاتی ہیں تو اپنے دھڑکتے ہوئے دِل پر ہاتھ رکھ کر بتایئے۔ کہ اُن کی بدگمانی بجا تو نہیں ہے ایک طرف تو مردوں کی یہ روش ہے۔ اور دوسری طرف اُن کا یہ حال ہے کہ راتوں کو گھروں سے غائب! بیویوں کے خطوط کا جواب ندارد! مردوں کی یہی بے پروائیاں بڑھتے بڑھتے تعلقات کی کشیدگی کا باعث بن جاتی ہیں!۔

جمیل کی بیوی شمیم کو پانچ چھ خطوں کا جواب نہیں ملا۔ وہ بُہت متفکر تھی، اور جیسے جیسے دن گذرتے جاتے تھے۔ اُس کی فکر، بدگمانی کی سرحد کے قریب پہنچتی جاتی تھی، جمیل سفر سے واپس آیا، تو اُس کو بیوی کا عتاب نامہ ملا، اُس نے فوراً ہی گھبرا کر خط لکھا:۔

"جانِ جمیل!"

"اس قدر خفگی! میں ابھی ابھی سفر سے واپس آیا ہوں"

"بُہت تھکا ہُوا ہوں، اس لئے تمہارے خط کا مفصل جواب"

" نہ دے سکا۔ تمہاری خفگی سر آنکھوں پر، مگر میں سفر میں"

" تھا، اور بہت پریشان تھا۔ یقین جانو کہ تم مجھ کو"

" دُنیا کی ہر چیز سے زیادہ عزیز ہو، میں تم کو کبھی نہیں"

" بھول سکتا۔ "

" میں عنقریب تمہارے پاس آ رہا ہوں، بہت جلد! یقین ہے"

" کہ اس خط کو پڑھکر تمہاری خفگی دُور ہو جائیگی۔ "

" تکان کے سبب عبارت بے ربط سی ہو گئی ہے، تم کچھ اور"

" نہ سمجھنا، مگر اس بے ربطی میں میرے دل کی دھڑکن تم کو"

" نظر آئیگی ——— تمہارا :- جمیل" اس خط کے بعد ہی اُس نے دوسرا خط کلکتہ کی ایک فرم کو لکھا، جس کا مالک ایک پارسی تھا،

" جناب منیجر صاحب!

" مندرجہ ذیل اشیاء فوراً بذریعہ وی۔پی پارسل روانہ"

" فرما دیجیئے۔ براہ کرم تاخیر نہ کیجیئے مجھے فوراً "

ضرورت ہے۔

" ساری عدد ۳ معہ بلاؤز۔ آویزے ایک جوڑ عدد ۳۵

ماصہ ــــہ

"کلائی کی سُنہری گھڑی A-D۔"

معہ

خط، لکھنے کے بعد اُس نے دو لفافوں پر پتہ لکھا، اور یہ عجیب اتفاق ہے۔ کہ پرچوں کو لفافوں میں بند کرتے وقت اُس پر گھبراہٹ طاری ہوگئی، اُس نے بیوی کے نام کا خط تو کمپنی والے لفافہ میں بند کردیا، اور کمپنی کا خط بیوی کے لفافہ میں! اُس نے ملازم کو آواز دی، ملازم آیا، اور لفافوں کو لیکر لیٹر بکس میں ڈال آیا۔

جس فرم کو جمیل نے خط لکھا تھا، اُس کا مالک ایک پارسی تھا، جس کی لڑکی فیروزہ ذرا رنگین مزاج بھی تھی۔ کلکتہ کی رنگین فضا، بے پردگی، آزادی، روپیہ پیسہ کی بہتات، جوانی حسن، ان سب دلچسپیوں اور لذتوں کے جھرمٹ میں ایک نوجوان لڑکی سے زہد و پاکبازی کی توقع رکھنے کے یہ معنی ہیں کہ آپ اُس سے "معجزہ" طلب کرتے ہیں۔ جو نوجوان لڑکی، نوجوان مردوں سے ہاتھ ملاتی ہو، جس کا کھلا ہوا سینہ قمقموں کی روشنی میں نگاہوں کو دعوتِ نظارہ دیتا ہو، جو نوخیز ہرنی سے زیادہ آزاد اور چنچل ہو، جس کے جذبات کا سفینہ، شباب کے طوفان میں ہچکولے کھا رہا ہو۔ جس کے سانس سے شباب کی گرمی نکلتی ہو، اُس کو رنگین مزاج ہونا ہی چاہیئے، فیروزہ کے باپ نے جب دیکھا۔ کہ اُس کی اکلوتی بیٹی ذرا زیادہ آزاد ہوتی جارہی ہے۔ تو اُس نے فیروزہ کے کردار پر نگرانی شروع کردی، وہ جلسوں میں فیروزہ کو اپنے ساتھ لیکر جاتا، اور اپنے ساتھ لیکر بیٹھتا۔ باپ کی موجودگی ایسے رنگین جلسوں میں، فیروزہ کے لئے بلائے جان تھی، وہ جی بھر کر مسکرا بھی نہ

سکتی تھی۔ اُس کے جذبات انقباض محسوس کرتے تھے، فیروزہ کی اس پیاسے جیسی حالت ہو جاتی تھی۔ جسے آبشاروں اور فواروں کے جھرمٹ میں لب تر کرنے کی بھی اجازت نہ ہو۔

جمیل کا لفافہ پارسی کی فرم میں پہنچا۔ ملازم نے تمام ڈاک پارسی کے سامنے رکھ دی، پارسی نے لفافہ کھول کر جو پڑھا۔ تو اس کا چہرہ غصہ سے تمتما اٹھا۔ فیروزہ کی طرف سے وہ بدگمان تھا ہی، جمیل کے خط نے اُسے سچ مچ یقین دلا دیا کہ ہو نہ ہو یہ فیروزہ کے کسی دوست کا خط ہے۔ آدمی تھا مصلحت شناس، اُس نے خط کو پڑھ کر صندوق میں مقفل کر دیا۔ اور فیروزہ سے ایک لفظ بھی نہ کہا۔ اس طرف تو جمیل کی گھبراہٹ نے یہ گل کھلایا۔ اور اُدھر جمیل کی بیوی شمیم نے جب خط پڑھا۔ تو اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی، جمیل نے کئی مہینہ سے اُس کے خط کا جواب نہیں دیا تھا اس خط میں اُس نے فرم سے بہت سی ایسی چیزیں منگائی تھیں، جن کیلئے شمیم نے جمیل سے فرمائش بھی نہ کی تھی۔ شمیم کی بدگمانی، یقین سے بدل گئی، عورت کا جذبۂ رقابت خدا کی پناہ! اُس کے نتھنوں سے شرارے نکلنے لگے، اس کا چہرہ فرطِ غضب سے لال ہو گیا۔ وہ دیوانہ وار کمرے میں ٹہلنے لگی، اُس کے چہرے پہ ایک رنگ آتا تھا۔ اور ایک رنگ جاتا تھا۔ جمیل کی بہت سی چھوٹی چھوٹی بے عنوانیاں اُس کی نظر میں معصیت اور گناہ سے بدتر نظر آنے لگیں اُس نے اسی عالم بڑبڑانا شروع کیا:۔

"ایک سال سے اُن کا تو یہی رنگ ہے،"

"ایک دفعہ دبی زبان سے اولاد کی خواہش بھی ظاہر کی تھی"

"کتنی دفعہ انہوں نے رضیہ کے لمبے بالوں کی تعریف کی تھی"

"اور ہاں! یہ تو وہ اکثر کہتے تھے، کہ بیوی حسین ہونی چاہیئے"۔

"ایک رات کو وہ ایک البم کی تصویر کو غور سے دیکھ رہے تھے"

"اور ہاں! یہ بھی کہا تھا۔ کہ میں شدید پردے کا قائل نہیں ہوں"

"ایک دفعہ اُنہوں نے مجھ سے یہ بھی تو کہا تھا۔" شمیم! تمہارا دہانہ "

"کچھ بڑا ہے"۔ یہ کہہ کر مسکرائے بھی تھے، میرے چہرے کا"

"مذاق اُڑانے کے لئے!۔"

"اولاد کی خواہش، حسین عورت کی تمنا، آزادی کی ہوس! وہ "

"ضرور مجھ سے بیزار ہو گئے۔ ہمیشہ کے لئے! اب وہ میرے نہیں رہے"

"کسی اور کے ہو گئے۔ ! ہائیں۔!

یہ کہتے کہتے وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی، باہر صحن میں گھر والے بیٹھے ہوئے بات چیت کر رہے تھے، شمیم کے رونے کی آواز سن کر سب دوڑے ہوئے آئے شمیم نے وہ لفافہ اپنے بھائی کو پکڑا دیا۔ اور اپنی بدگمانی کو اس انداز کے ساتھ بڑھا چڑھا کر بیان کیا۔ گھر والوں کو یقین آگیا، کہ جمیل کی آنکھ کہیں لگ گئی ہے، اور وہ شمیم سے بیزار ہو گیا ہے، شمیم کے بھائی نے اپنی ماں سے جھنجھلا کر کہا:۔

"اماں جان! یہ سب آپ کا ہی کیا دھرا ہے، شمیم کے"

"مستقبل کی تباہی کی آپ اور صرف آپ ذمہ دار ہیں، میں نے"

" کہا تھا کہ جمیل کے رنگ ڈھنگ، اچھے نہیں ہیں، اس کے باپ نے بھی"

" دو تین شادیاں کی تھیں، اس کے چچا نے ساری جائداد رنڈیوں"

" کے پیچھے تباہ کردی، مگر آپ نے ایک نہ چلنے دی، آپ تو"

" جمیل کا پیغام آتے ہی، ایسی فریفتہ ہوئیں، جیسے خدا نے کوئی"

" نعمت ہمارے گھر بھیجدی، جس کو ہم ٹھکرائیں گے تو کافر ہو جائیں گے"!

" خیر! آپ جو کرنا تھا۔ کر چکیں، مگر میں جمیل کو بڑا گھر"

" دکھلا کر چھوڑوں گا، شریف عورتوں کے ساتھ ایسا سلوک کرنا،"

" مذاق نہیں ہے، میں اپنی تمام دولت لٹا دوں گا،"

جمیل کی ماں خاموش بیٹھی رہی، یہ رشتہ اُسی کی پسند سے ہوا تھا۔ کوئی ماں، اپنی بیٹی کا برا نہیں چاہتی، مگر تقدیر کے لکھے کو کس نے پڑھا ہے" شمیم کے میکے میں آج سوگ تھا، لوگ ایسا محسوس کرتے تھے، جیسے اس گھر سے ایک دن میں بہت سے جنازے اٹھے ہیں، عورتوں اور مردوں کے مشورے سے جمیل کو خط لکھا گیا ہے جس میں اُسے دھمکی بھی دی گئی تھی۔ اور کچھ ایسے لچکدار فقرے بھی تھے جن میں مصالحت جھلکتی تھی۔ ہندوستان میں بیٹی کا معاملہ بڑا نازک ہوتا ہے بیٹی والے ہمیشہ دبتے رہتے ہیں اور کمینہ فطرت مرد، سسرال کی اس کمزوری سے خوب فائدہ اٹھاتے ہیں۔

جمیل کی سسرال میں خط تو کئی دن میں پہنچتا تھا۔ مگر کلکتہ تو بہت قریب تھا۔ آج خط

لکھا، اور کل پہنچ گیا۔ اور کسی نے خط پہنچتے ہی جواب دیا، تو پھر دوسرے روز کھٹ سے جواب آ گیا دُکاندار نو دن کے دن فرمایش کی تعمیل کرتے ہیں، جمیل نے دو تین دن وی۔پی کا انتظار کیا۔ مگر وی۔پی نہ آنا تھا نہ آیا۔ اسی عرصہ میں اُس کا کلکتہ میں ایک کام نکل آیا۔ اور وہ کلکتہ کے لئے روانہ ہو گیا اپنے کام سے فارغ ہو کر وہ پارسی کی فرم میں پہنچا۔ پارسی کی فرم کے ایک حصّہ میں صابن بنتا تھا اور دوسرے حصّہ میں متفرق اشیاء کی دکان تھی۔ جمیل دکان میں پہنچا، پارسی نے اپنے نوجوان گاہک کا خندہ پیشانی کے ساتھ استقبال کیا۔

"اس دکان کا مالک کون ہے؟" جمیل نے کہا۔

"میں ہی مالک ہوں" پارسی نے جواب دیا۔

"آپ کے یہاں کا انتظام بہت خراب معلوم ہوتا ہے"۔

"کہ فرمایشوں کی تعمیل نہیں ہوتی ———— جمیل میز پر کہنی ٹیکتے ہوئے بولا،

"ہمارے یہاں نو دن کے دن فرمایشوں کی تعمیل"

"ہو جاتی ہے آپ کا نام کیا ہے"۔ پارسی نے جمیل کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"میرا نام جمیل ہے۔ !" جمیل نے جواب دیا۔

پارسی پہلے ہی سے بھرا بیٹھا تھا۔ اُس کے ذہن نے فوراً مقدمات ترتیب دیکر، یہ نتیجہ نکال لیا، کہ جمیل اُس کی بیٹی فیروزہ سے ملنے کے لئے آیا ہے،

جمیل نے خط میں لکھا بھی تو تھا۔ "کہ میں بہت جلد آ رہا ہوں"۔ اس تصوّر نے پارسی کی ٹھنڈی

اور مصلحت اندیش فطرت کو دہکتا ہوُا انگارہ بنادیا۔ جمیل بے پرواہی کے ساتھ دکان میں گھومنے لگا۔
پارسی نے بھی اُس کا پیچھا کیا، اور دونوں میں بات چیت ہونے لگی۔

"اس بڑے سوٹ کیس کی کیا قیمت ہے ——" جمیل نے دریافت کیا۔

"دو سو روپیہ، ———————— "سیٹھ نے جواب دیا۔

"دو سو روپیہ، اس سوٹ کیس کے! سیٹھ صاحب"

"آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں! ———————— جمیل نے متعجب ہو کر کہا

"آپ کے لئے دو سو روپیہ، دوسروں کے لئے مفت! ———— "سیٹھ رُکھائی کے ساتھ بولا۔

"یہ کمبل کہاں کا بنا ہوُا ہے، یہ! سامنے والا، سفید"

"اور کالے رنگ کا، یہی! جو آپ کے سامنے ہے" ———— جمیل نے کمبل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"یہ جہنم کا بنا ہوا ہے ———————— سیٹھ نے جھنجلا کر جواب دیا۔

"بڑے پُر مذاق ہیں آپ، اچھا! یہ چھڑی کتنے کی ہے" —— جمیل نے کہا۔

"اس سے بھی آپ کی تواضع کی جائیگی، اس وقت آپ کو"

"اس کی قیمت معلوم ہو گی ———— "سیٹھ نے نتھنے پھُلا کر جواب دیا۔

"یہ آپ کیسی اکھڑی باتیں کر رہے ہیں جمیل قدرے پریشان

ہو کر بولا۔

"میں اُکھڑی اُکھڑی باتیں کر رہا ہوں، بدمعاش! کہیں کے ———" سیٹھ نے غصّہ کے ساتھ جواب دیا۔

"مجھے آپ بدمعاش کہہ رہے ہیں، ———" جمیل نے تیزی کیساتھ کہا۔

"جی ہاں! آپ کو بدمعاش کہہ رہا ہوں، آپ بدمعاش نہیں، تو کیا"

"نیک معاش ہیں، ذرا ٹھہریئے، آپ کی ساری عاشقی نکالے دیتا ہوں ———" سیٹھ نے جواب دیا۔

جمیل پہلے تو مذاق سمجھا کیا، لیکن پارسی کے تیور بیلے ہوتے چلے جا رہے تھے، جمیل نے بھی سختی کے ساتھ گفتگو کی، اور دونو زور زور سے چلّانے لگے، یہاں تک کہ دونو میں کشت مشت ہو گئی، نوکروں نے جیسے تیسے دونوں کو چھڑایا۔ قریب کی دکان کے لوگ بھی آ گئے۔ پارسی چلّا چلّا کر کہہ رہا تھا۔

"یہ بدمعاش ہے بدمعاش! بہت بڑا بدمعاش!"

فیروزہ صابن کے کارخانے میں کچھ کام کر رہی تھی، وہ بھی گڑبڑ سن کر آ گئی، پارسی اُسے دیکھتے ہی چیخنے لگا۔

"فیروزہ! تم یہاں سے چلی جاؤ، فوراً چلی جاؤ"

"جاؤ، واپس ہو، فرم سے ہی چلی جاؤ"

پارسی غصّہ سے بیتاب تھا، فیروزہ کو دیکھ کر اُس کے عتاب میں اور اضافہ ہو گیا، اُس نے جمیل کو گالیاں دینی شروع کیں، جمیل کی غیرت ان گالیوں کو بھلا کب برداشت کرنیوالی تھی، اُس نے پارسی کے بازو پر اس زور سے گھونسہ رسید کیا۔ کہ اہرمن و یزداں کے پرستار کو چکر آ گیا لوگوں نے بیچ بچاؤ کرایا۔ اور جمیل وہاں سے گھبرایا ہوا سیدھا ہوٹل پہنچا۔ وہ بہت حیران تھا اُس نے اپنے دماغ پر بہت زور ڈالا۔ مگر پارسی کا طرزِ عمل اُس کی سمجھ میں مطلق نہ آیا۔ اُسے کلکتہ کے در و دیوار سے وحشت ہو رہی تھی، وہ پہلی ٹرین سے اپنی سسرال روانہ ہو گیا۔ سسرال والے جمیل کو دیکھ کر باغ باغ ہو جاتے تھے، مگر اس دفعہ جو وہ سسرال پہنچا ہے۔ تو وہاں کے زمین و آسمان بدلے ہوئے نظر آئے، سب لوگ اُس کو عتاب و نفرت کی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے، اُس کے سلام کا جواب بھی مشکل ہی سے کسی ایک آدھ خدا کے بندے نے دیا۔ جمیل سسرال کا مجرم تھا ایسا مجرم جس کا جرم کسی صورت میں بھی بخشا نہیں جاتا۔ جمیل نے اپنے سالے کو سلام کیا۔

"کیا آپ کو میرا خط مِل گیا؟" جمیل کا برادرِ نسبتی اصغر بولا۔

"مجھے آپ کا کوئی خط نہیں ملا، میں تو کلکتہ سے آ رہا ہوں" ــــــ جمیل نے جواب دیا۔

"کلکتہ سے آرہے ہیں آپ! ہاں اد ہیں ——"

"خیر..... ! بہرحال دیکھا جائیگا........" اصغر نے کہا۔

"بھائی جان! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ کیا دیکھا جائیگا" جمیل گھبرا کر بولا۔

"آپ معصوم بننے کی کوشش نہ کیجئے، جمیل صاحب!"

"چھٹی کا دودھ یاد آجائیگا، شریف عورت سے"

"بیوفائی کرنا کوئی ہنسی ٹھٹھا نہیں ہے، اور"

"پھر آپ کی دیدہ دلیری تو دیکھئے کہ کس بے تکلفی کے ساتھ"

"سسرال میں چلے آرہے ہیں، جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔!" اصغر، جمیل کی طرف گھورتے ہوئے بولا۔

جمیل کو ایک تو ویسے ہی گھبرا جانے کی عادت تھی، سالے کی باتوں نے اُسے اور زیادہ بدحواس بنا دیا۔ اتنے میں گھر کے دوسرے لوگ آگئے۔ اور بات چیت شروع ہوگئی۔

"اولاد کی تمنا تھی، تو دو چار سال اور انتظار کیا ہوتا۔"

"ابھی تم دونوں کی ایسی عمر ہی کیا ہے۔

"شمیم تو شریف گھر کی لڑکی ہے، ناز، انداز، چٹک مٹک، تو طوائفوں"

"میں ہوتی ہے۔

"تمہاری صورت تو بڑی بھولی ہے، اور گن ایسے ہیں!"

ہماری شمیم کی تو قسمت پھوٹ گئی،"

"اصغر میاں نے تو جب ہی کہہ دیا تھا۔ کہ یہ پیوند"

"بے جوڑ رہیگا، اس بوڑھی نے کسی کی نہ مانی، اُسے تو"

"بیٹی کا گھر میں رہنا، پہاڑ معلوم ہوتا تھا . . . . ."

جمیل حیرت کے ساتھ سب کا منہ ٹک ٹک دیکھ رہا تھا، اُسے بخار کے مریض کی طرح پسینہ آرہا تھا۔ اُس نے بے اختیار ہو کر کہا:۔

"میں اپنا سر دیوار سے ٹکرادوں گا، قسم خدا کی یہیں آپ سب کے"

"سامنے خودکشی کرونگا، یہ کیا بھید ہے! آپ لوگ کیا"

"کہہ رہے ہیں۔"

جمیل کا برادرِ نسبتی اصغر یہ سن کر اُٹھا، اور جمیل کا خط لاکر، اُس کے سامنے ڈال دیا۔

جمیل نے خط کو دیکھ کر کہا:۔

"ارے! یہ تو میں نے پارسی کی فرم کو لکھا تھا"

"تمہارے پاس کیسے آگیا۔

یہ کہکر، وہ بے اختیار ہنسنے لگا، اور ہنس کر پھر خاموش ہو گیا، تھوڑی دیر خاموش رہا، اور پھر ران پر ہاتھ مار کر بولا:۔

"کلکتہ کا معمہ اب حل ہؤا، واہ ری! میری گھبراہٹ"

"ایک دُنیا کو پریشان کر رکھا ہے"۔

جمیل کے اس جُملے پر سب لوگ حیرت کیساتھ اُس کا مُنہ دیکھنے لگے،

جمیل نے تمام داستان دہرائی، عورتوں کو تو اُسی وقت یقین آگیا، مگر اصغر کا دل صاف نہ ہؤا۔

مزید اطمینان کے لیئے جمیل، اصغر کو لیکر کلکتہ روانہ ہؤا۔ کلکتہ پہنچکر جمیل نے اصغر کو پارسی کی فرم کا پتہ بتلایا، اور کہا کہ میں پیچھے سے آتا ہوں، تم جاکر اُس سے گفتگو کرنا۔

مجھے دیکھ کر پارسی پر پھر جنون سوار ہو جائیگا۔ اصغر پارسی کی فرم میں پہنچا۔

اصغر کو دیکھ کر پارسی نے کہا۔

"آئیے مولوی صاحب! کہئے کیا چاہیئے۔"

اصغر نے کُرسی پر بیٹھتے ہوئے جواب دیا۔

"چاہیئے تو کچھ نہیں! آپ سے ایک ضروری بات کرنی ہے"

پارسی نے گھبرا کر کہا۔

"کہئے! کہئے! شوق سے کہئے!

اصغر نے نہایت سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا۔

"آپ کے یہاں کسی جمیل نامی شخص نے کوئی خط بھیجا تھا"۔

"جمیل کا نام سنتے ہی پارسی آگ بگولا ہو گیا، اور سینکڑوں ملاحیاں سُنانے لگا۔

اصغر نے جب دیکھا کہ پارسی کچھ سے کچھ ہؤا جا رہا ہے، تو اس نے نہایت سنجیدگی کے ساتھ خط

کے بدلے جانے کا حال سُنایا۔ اور وہ لفافہ بھی دکھایا، جو شمیم کے پاس غلطی سے پہنچ گیا تھا۔ فیروزہ یہاں پہلے سے بیٹھی ہوئی تھی، اتنے میں جمیل بھی آگیا۔ جمیل کو دیکھ کر پارسی بُری طرح جھینپ گیا۔

"معاف کیجئے! مسٹر جمیل! مجھے غلط

فہمی ہو گئی" ——— پارسی نے کنجیوں کے گچھے کو گھماتے ہوئے کہا

"میں آپ کے جذبہ کی قدر کرتا ہوں۔ بہرحال میرا

"دل آپ کی طرف سے صاف ہے ——— جمیل نے جواب دیا

فیروزہ، شاید اپنے باپ سے بھی زیادہ پشیمان ہو رہی تھی۔ جمیل کے چہرے کو دیکھ کر وہ ہونٹوں ہی ہونٹوں میں کچھ کہہ رہی تھی۔ جمیل نے آخر رخصت ہوتے وقت، فیروزہ سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہہ ہی دیا :-

"میں ہوں، وہ — اجسے آپ کے والد نے غلط فرض

"کر لیا تھا"

فیروزہ نے شرما کر گردن جھکالی، اس کے کانوں کے آویزے جنبش کرنے لگے، اُس کا چہرہ مجرم ناکردہ گناہ کے چہرے کی طرح معصوم اور پشیمان بن گیا۔

جمیل، اصغر کو لیکر کلکتہ آیا تھا، اور اب اصغر، جمیل کو لیکر مکان پہنچا۔ اصغر کے شگفتہ چہرے کو دیکھ کر ہی سب خوش ہو گئے، جب اصغر نے واقعات دہرائے، تو تمام گھر لوگوں کے قہقہوں سے گونج اُٹھا۔ وہی گھر جس میں ہر طرف سوگ ہی سوگ نظر آتا تھا، مسرت کدہ بن گیا۔——

شمیم کی خوشی کا کیا پوچھنا۔ وہ تو مرکر زندہ ہوئی تھی، اُسے تو پھانسی کے تختہ پر چڑھا کر اُتارا گیا تھا، اس نے جمیل کو دیکھ کر کہا:۔

"یہ فیروزہ سُنا ہے، بہت حسین ہے ۔۔۔۔۔"

جمیل جھینپ کر مسکرا دیا۔

جمیل جب کبھی لفافوں میں خطوط بند کیا کرتا، تو شمیم کہہ دیا کرتی تھی:۔

"دیکھئے! احتیاط کے ساتھ لفافے بند کیجئے! نہیں تو کسی لڑکی کا باپ، اپنی لڑکی کا آپ کو عاشق بنا کر چھوڑ دیگا۔"

جمیل مسکرا کر خاموش ہو جاتا۔

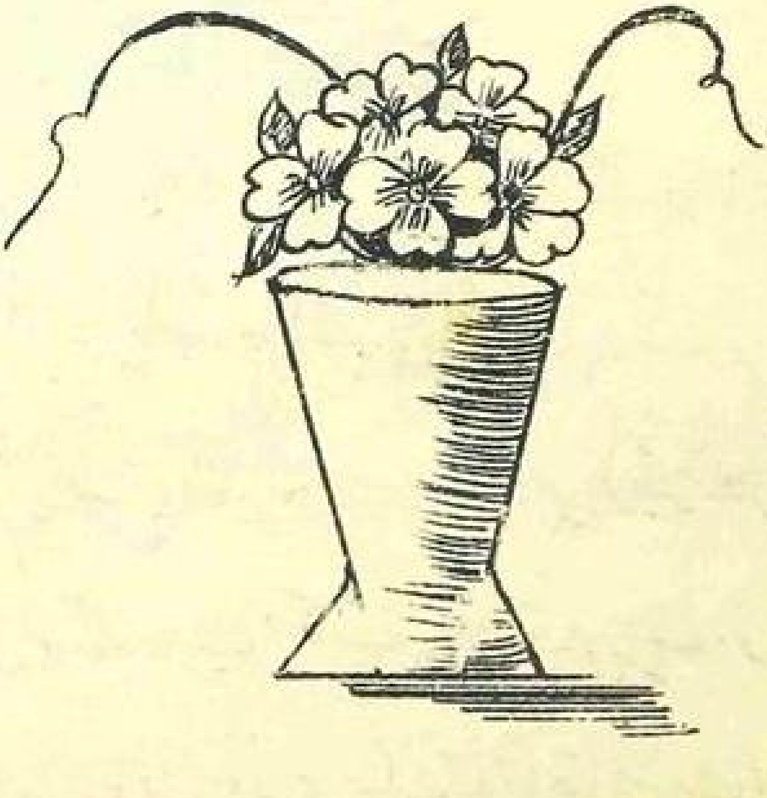

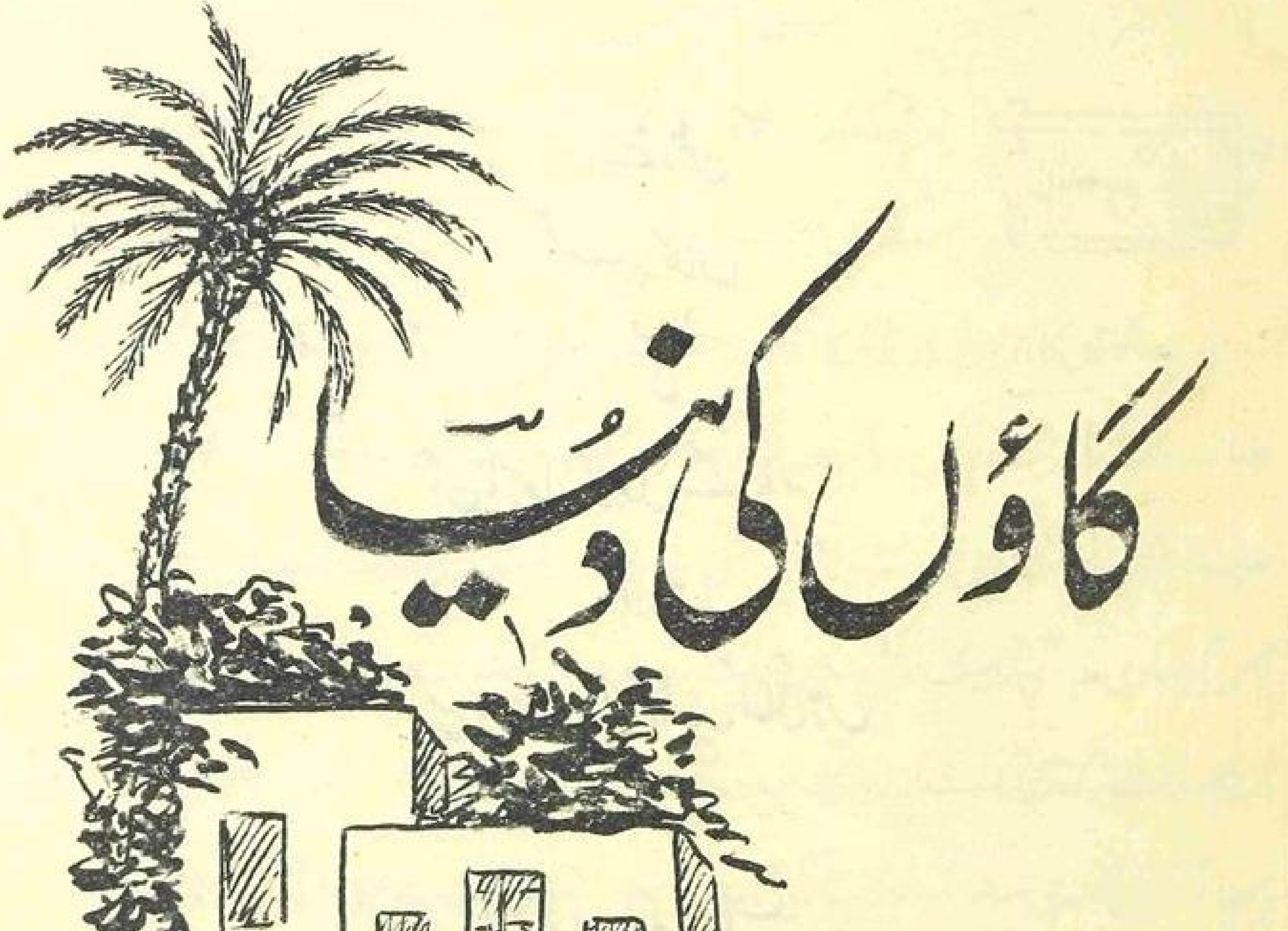
گاؤں کی دنیا

اپنے وطن

کسیبہ کلاں

کی

اُن ناہموار گلیوں کے نام

جن میں

میری جوانی نے ٹھوکریں کھائی ہیں

کاش

تاریخ اپنے کو دہرا سکتی۔

گاؤں کی دنیا

گاؤں کے آدمی جتنے بھولے بھالے ہوتے ہیں، اُس سے زیادہ وہم پرست ہوتے ہیں۔ یہی وہم پرستی اُن کو بعض وقت بہت زیادہ ڈرپوک اور پریشان بنا دیتی ہے۔ گاؤں کا آدمی چور اور ڈاکو کا مقابلہ کر سکتا ہے، اپنی عزت آبرو آن بان کے لئے مر کٹ سکتا ہے بھیانک اور ڈراؤنی راتوں میں وہ کھیتوں کی رکھوالی کرتا ہے۔ یہ سب کچھ ہے، مگر کوئی گاؤں والے سے صرف اتنا کہہ دے کہ فلاں درخت پر چڑیل رہتی ہے، یا فلاں کھنڈر میں بھوت رہتے ہیں۔ تو بس اب اُس کی ساری مردانگی رخصت ہوگئی، اُس درخت کے قریب سے گذرتے ہوئے اُس کا دل دھک دھک کریگا۔ درخت کے قریب سے گذر جانیکے بعد وہ بہت دُور تک مڑ مڑ کر دیکھتا رہیگا۔ کہ کہیں چڑیل اُس کا پیچھا تو نہیں کر رہی ہے۔ اُسے آپ قتل گاہ میں بھیج دیجئے۔ وہ خوشی سے چلا جائیگا لیکن بھوت بسنے والے کھنڈر کی طرف آپ اُس سے چلنے کے لئے کہیں گے، تو وہاں جانے کے لئے وہ شاید ہی راضی ہوگا، گاؤں میں اس قسم کے قصے سینہ بسینہ چلے آتے ہیں، باپ بیٹے سے کہتا ہے، ماں اپنی بیٹی اور نواسی سے بیان کرتی ہے، یہاں تک کہ تمام گاؤں میں بعض قصے اس طرح مشہور ہوتے ہیں۔ کہ نسلیں اُن کو معتبر روایتوں کے طور پر یاد رکھتی ہیں، آپ اُن روایتوں کو جھٹلانے اور غلط ثابت کرنے کی خواہ کتنی

ہی کوشش کیوں نہ کریں۔ آپ کامیاب نہیں ہو سکتے، جن قصّوں کہانیوں اور روایتوں کے نقوش بچپن ہی سے اُن کے قلوب پر مرتسم ہو چکے ہیں۔ اُن کو آپ کی تھوڑی دیر کی فلسفیانہ نصیحت کس طرح مٹا سکتی ہے۔ انسان کو سب سے زیادہ اندیشہ جان و مال کے نقصان کا ہوتا ہے۔ . . . .

. . . . گاؤں میں جان و مال ہی کے نقصان کے قصّے مشہور ہو جاتے ہیں، اور رات کو جب کسان محنت سے چور ہو کر، اپنی بیٹھکوں اور چوپالوں میں الاؤ کے کنارے بیٹھتے ہیں، تو زیادہ تر یہی بھوت پریت کے قصّے اُن کی گفتگو کا موضوع ہوتے ہیں، ان قصّوں میں وہ بڑی دلچسپی لیتے ہیں کچھ باتیں تو اگلے بڑھے بوڑھوں کی بیان کی ہوئی ہوتی ہیں، اور کچھ باتوں کا اضافہ یہ لوگ اپنی طرف سے کر دیتے ہیں، اضافے ہوتے ہوتے، معمولی سا واقعہ طلسم ہوشربا بن کر رہ جاتا ہے۔ گاؤں والوں پر ہی کیا منحصر ہے۔ بہت سے تاریخی واقعات کی جن کو آپ حقائق کہتے ہیں۔ اگر چھان بین کی جائے تو آپ کو معلوم ہو کہ "زیبِ داستان" کے لئے کیا کچھ بڑھایا گیا ہے۔

قوتِ واہمہ کو امورِ طبعی میں بہت دخل ہے، مثال کے طور پر آپ نارنگی کو لیجئے کہ اُس کا تصور کرنے سے مُنہ میں پانی بھر آتا ہے، یہی وہم جب یقین کی حد تک پہنچ جاتا ہے۔ تو نگاہ رسی کے ٹکڑے کو سانپ سمجھنے لگتی ہے جب انسان پر خوف غالب ہوتا ہے تو وہ پتوں کی کھڑکھڑاہٹ کو سن کر سہم جاتا ہے۔ ایسا اکثر ہوا ہے۔ کہ کسی گاؤں میں یہ مشہور ہے۔ کہ فلاں درخت پر بھوت کا سایہ ہے، اب کسی ضرورت سے کوئی شخص درخت کے قریب سے گذرا، اتفاق سے کوئی بلّی، جو چڑیوں کی تلاش میں وہاں آئی تھی، گاؤں والے کی نظر پڑ گئی، بلّی کی چمکیلی آنکھوں کو دیکھ کر وہ سمجھا کہ بھوت آنکھیں

چمکا رہا ہے۔ خوف و دہشت کے مارے، اُس کا دِل دھک دھک کرنے لگا، یہاں تک کہ اس کو پسینہ آکر جاڑا یا بخار چڑھ آیا۔ بس اب سارے گاؤں میں یہ بات مشہور ہوگئی، کہ بھُوت کو دیکھ کر فلاں آدمی کو بخار چڑھ آیا۔ یہی بات افسانہ بن جاتی ہے، اور اسی ایک افسانہ کو ہر شخص ایک نئے عنوان سے بیان کرتا ہے۔ گاؤں والوں کی اِس قسم کی باتیں کتنی دلچسپ ہوتی ہیں:۔

"بھیّا! بڑے کھیت کے پیپل پر جو بھوت رہتا ہے، اُس کا قصّہ"

"میرے پِتا بیان کرتے تھے، کہ ایک رات کو میں پیپل کے نیچے سو رہا تھا، آدھی"

"رات گئے میری آنکھ کھُلی تو کیا دیکھتا ہوں کہ کوئی پیپل کی ڈالیوں کو"

"زور زور سے ہلا رہا ہے، ایک ڈالی میرے اُوپر آکر گری، ڈالی کے گرتے ہی"

"سن سن کی آواز ہوئی، میں وہاں سے بھاگا، تھوڑی دور جاکر، جو میں نے"

"مڑ کر دیکھا تو کوئی لانبا آدمی میرا پیچھا کر رہا تھا۔ میں بھاگتا ہی چلا گیا"

"تھوڑی دُور جاکر، ایک پیڑ کی جڑ سے میری دھوتی"

"اُلجھ گئی، اور میں دھڑام سے دھرتی پہ گر گیا۔ بس اُس دِن جو مجھے"

"بخار آیا ہے، تو وہ مہینہ میں جاکر آرام ہوُا۔"

"اجی مہاراج! میں نے اسی پیڑ پر ایک سانجہ (شام) کو ایک کلنگ کو"

"بیٹھے ہوئے دیکھا، جو "ہوں ہوں" کرکے ناچ رہا تھا۔ میں تو بھیّا! وہاں سے"

"ڈر کے مارے بھاگ کر چلا آیا۔ ہو نہ ہو یہ بھُوت ہی تھا۔"

" اجی! یہ بھوت اور چھلاوے شکلیں بدل لیتے ہیں، ابھی آدمی کے "
" روپ میں ہیں، تو ابھی گھوڑے کی شکل میں ہو گئے، طرح طرح کی "
" بولیاں بولتے ہیں، کبھی ایسا سُنائی دیتا ہے۔ کہ کوئی بچہ بلک بلک کر "
" رو رہا ہے، اور کبھی وہی بچہ مزے مزے کے گیت سُنانے لگتا ہے، یہ گیدڑ بھی "
" بھوتوں سے ملے ہوتے ہیں۔ جوتشی جی کہتے تھے کہ بھوتوں کی اور گیدڑوں "
" کی دوستی ہوتی ہے۔ "
" پوربیوں کے محلے میں جو گمہار ا ہے۔ اُس میں بھیا بڑے "
" بڑے دانتوں والی چڑیل رہتی ہے۔ جمعرات کو اگر کوئی نہا دھو کر، وہاں سے "
" گذر جائے، تو اُس کا پیچھا کرتی ہے، میرے دادا نے اُس کو دیکھا ہے "
" وہ کہتے تھے کہ اُس کے دو دانت باہر کو نکلے ہوئے ہیں، آنکھیں "
" پھٹی ہوئی ہیں، اور چہرہ کالے توے سے بھی زیادہ کالا ہے، اُس کے "
" پیر پیچھے مڑے ہوئے ہیں۔ کنواری چھوریوں کی تو وہ جان کی دشمن "
" ہے، نندلال پنڈت کی چھوری (لڑکی) کیسی سُندر تھی، اس چڑیل ہی کو "
" دیکھ کر اُسے بخار چڑھ آیا۔ اور بیچاری کچھ دن "
" دکھاری (بیمار) رہ کر مر گئی۔ "
" پٹواری جی کہتے تھے کہ اسی چڑیل کی ایک بہن لال کنوئیں کے برگد پر "

" رہتی ہے، اُس کے ایک آنکھ ہے، اور لنگڑی بھی ہے - مگر بھیّا! "
" ایسی ظالم ہے کہ ایشور بس بچائے ہی رکھے، کبھی بڑھیا بن جاتی ہے "
" کبھی نئی نویلی دُلھن، یہ چھٹی رساں کا بڑا بیٹا منوہر کہتا تھا - کہ ایک "
" رات کو وہ کنوئیں پر پانی بھرنے کے لئے گیا - اُس نے کنوئیں میں گڑھی "
" لٹکا دی کہ اتنے میں ایک کنواری چھوری، چھم چھم کرتی ہوئی کنوئیں پر گھڑا "
" لئے ہوئے آگئی، بڑی سُندر چھوری تھی، منوہر تو اُسے دیکھ کر ہکا بکا رہ گیا "
" منوہر نے اس کی طرف دیکھا تو وہ ہنسنے لگی، اس کے ہنسنے سے منوہر کو سہارا "
" ہو گیا، منوہر نے اُس کے پاس جا کر کچھ چھیڑ چھاڑ کی، منوہر کا ہاتھ لگا نا تھا "
" کہ کنوئیں سے زور کی آواز ہوئی، پیڑ کی ڈالیاں ہلنے لگیں - منوہر کی آنکھوں کے تلے "
" اندھیرا آگیا، اب جو منوہر نے دیکھا تو وہ سُندر چھوری غائب تھی، اور "
" اُس جگہ بکری کا بچہ ممیا رہا تھا - منوہر گڑھی اور ڈور چھوڑ کر "
" وہاں سے بھاگا، اور کئی دن تک بیمار رہا - "
" یہ چڑیلیں بھوتوں کی بیویاں ہوتی ہیں، مردوں پر بھی یہ عاشق "
" ہو جاتی ہیں جس مرد پر یہ ریجھ گئیں، بس اُس "
" بیچارے کا جیون تباہ ہو گیا "
" ایک بھوت تو ہمارے نانا کا دوست ہو گیا تھا - وہ ہمارے نانا کے کھیتوں "

" کی رکھوالی کیا کرتا تھا۔ ہمارے نانا کے تکیہ کے نیچے روز "

" صبح کو دو روپے رکھے ہوئے مِلتے تھے، بھوت نے کہہ دیا تھا کہ شام تک "

" دونوں روپیہ اُٹھا دیا کرو، ایک دن ہمارے نانا نے "

" کچھ پیسے رکھ چھوڑے، بس اُس دن سے نہ تو وہ بھوت اُن کو پھر ملا، اور نہ "

" تکیہ کے نیچے روپیہ رکھے ہوئے پائے گئے۔ .... "

" یہ بھوت رات کو بارہ بجے کے پیچھے حلوائیوں کے یہاں سے مٹھائی مول "

" لینے کے لئے آتے ہیں، جب ہی تو یہ حلوائی آدھی رات تک دکانیں "

" کھُلی رکھتے ہیں، یہ بھوت مٹھائی شوق سے کھاتے ہیں "

" ارے بھائیو! میری کسی بھوت سے دوستی ہو جائے، تو بڑا مزہ آئے "

" جھمن حلوائی کے لڈوؤں کے تھال اٹھوا کر منگا لیا کروں "

" اور ہاں! بھوتوں کا بادشاہ اُڑن کھٹولے پر بیٹھ کر "

" سیر کرتا ہوا پھرتا ہے، سینکڑوں مشعلیں اُڑن کھٹولے کے ساتھ ہوتی ہیں "

" مرگھٹ میں اُڑن کھٹولا آکر اترتا ہے، سارے بھوت اکٹھا ہوتے ہیں "

" اور بھوتوں کا بادشاہ ایک ایک بھوت کو حکم دیتا ہے۔ ان بھوتوں کے "

" گاؤں بٹے ہوئے ہیں، اپنے اپنے گاؤں کی سرحد میں ان کا حکم چلتا ہے۔ "

" جب بھوتوں میں لڑائی ہوتی ہے۔ تو بھونچال آتا ہے ——— "

"بڑے گاؤں کے ملاں جی تو بڑے کراماتی ہیں، اُنھوں نے تو کئی بھوتوں کو لوٹے ہیں"

"بند کر کے مجت (مسجد) کے دروازے میں لٹکا دیا ہے۔ ملاں جی بھوت"

"اُتارنے کا سوا روپیہ، ایک مُرغا اور ڈھائی سیر گیہوں لیتے ہیں"

"چھلاوا، بھوت کا چھوٹا بھائی ہوتا ہے۔ دیکھنے والوں نے چھلاوے کے"

"سر کو بادل سے لگا ہوا دیکھا ہے ـــــــــــــــ"

گاؤں والوں کی اس وہم پرستی سے بعض چالاک اور ہوشیار لوگ جی بھر کر ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں۔ سجے گنج ایک چھوٹا سا گاؤں تھا جس میں مشکل سے کوئی دو سو گھر ہونگے، یہاں کے لوگ تمدن تہذیب کی پرچھائیں سے بھی ناواقف تھے، سارے گاؤں میں ایک لالٹین بھی نہ تھی۔ سارے گھروں میں مٹی کے چراغ جلتے تھے، روئی کی بٹی ہوئی بتیاں، سرسوں اور ارنڈی کا تیل، مٹی کے بڑے سے بڑے دیئے بس یہی رات کے اُجالے کی کائنات تھی، گاؤں کے مکھیا کے دوکان کا دروازہ تو ضرور پکی اینٹوں کا بنا ہوا تھا، باقی تمام گاؤں کی ایک دیوار بھی پکی اینٹوں کی نہ تھی، گاؤں کے لوگ ہاتھ کے سلے ہوئے کپڑے پہنتے تھے مشین کا سلا ہوا کپڑا دیکھکر اُنکو اچنبھا ہوتا تھا۔ گاؤں سے کچھ فاصلہ پر ایک چھوٹا سا مندر تھا جسے گاؤں کے زمیندار نے بنوا دیا تھا، گاؤں والے اسی مندر کی دیوی کی پوجا کیا کرتے تھے، گاؤں والوں کا یہ معبد تھا، اور زمیندار کے ٹھہرنے کی جگہ۔ زمیندار جب فصل پر لگان وصول کرتے آتا تھا۔ تو اسی مندر میں ٹھہرا کرتا تھا۔ اسی گاؤں کے برہمنوں کا لڑکا، جو اپنے باپ کے مرنے کے بعد مندر کا پجاری بن گیا تھا، کچھ دن شہر میں جا کر رہا تھا۔ گاؤں کے لڑکے کو جب شہر کی ہوا لگی تو اس کی حالت کچھ سے کچھ ہو گئی۔ گر دھاری کناری دار دھوتی اور مشین کی سلی ہوئی

قمیص پہننا، انگریزی وضع کے ترشے ہوئے بالوں میں تیل ڈالتا۔ گاؤں میں اس ٹھاٹ باٹ کی کھپت کہاں ہو سکتی ہے، وہاں تو موٹے جھوٹے کھانے پہننے کے لئے ہی پورا نہیں پڑتا۔ گردھاری کی شہری زندگی نے اُسے فریب اور دغابازی کے لئے آمادہ کیا، اور اُس ظالم نے بیچارے بھولے بھالے گاؤں والوں کو اپنے فریب کا شکار بنانا شروع کیا۔ سارے گاؤں میں سچ پوچھو تو فرشتے بستے تھے۔ بس یہی ایک شیطان وہاں پیدا ہو گیا تھا، پیدا تو وہ بھی فرشتہ ہؤا تھا۔ شہر کی ہوا نے اُس کو شیطان بنا دیا تھا۔ جب آدمی دھوکے کا کھیل کھیلتا ہے۔ اور اُس میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ تو اُس کو دھوکا دینے کی چاٹ پڑ جاتی ہے۔ اور اُس کا ذہن دھوکے کی نئی نئی ترکیبیں سجھاتا ہے، گردھاری نے بھی گاؤں والوں کو ایسے ایسے دھوکے دیئے، کہ جن کو اگر جمع کیا جائے تو ایک کتاب تیار ہو سکتی ہے۔ گردھاری فطری طور پر ذہین تھا، مگر اُس کی ذہانت فریب و مکاری کی طرف راغب ہو گئی تھی۔ ذہین آدمی کا دھوکا بڑا ہی خوفناک ہوتا ہے۔ اُس سے بچنا ہر شخص کا کام نہیں۔ بیوقوف آدمی کا دھوکا بہت زیادہ گہرا نہیں ہوتا۔ اس لئے اس کے نتائج بھی زیادہ شدید نہیں ہوتے۔

اوپر پھیلا کر بیان کیا جا چکا ہے کہ گاؤں کے لوگ بھوت، پلید سے بہت ڈرتے ہیں، گردھاری نے گاؤں والوں کی اسی کمزوری سے پہلے ناجائز فائدہ اٹھایا۔ وہ رات کو راستہ کے قریب کسی درخت پر آ بیٹھتا۔ اور جب کوئی راہگیر وہاں سے گذرتا، تو طرح طرح کی آوازیں بنا کر بولتا، اور درخت کی شاخوں کو زور زور سے ہلاتا۔ راہگیر سمجھتا کہ کوئی بلا اُس کا پیچھا کر رہی ہے۔ اور وہ ڈر کر بعض وقت بیمار پڑ جاتا

گردھاری، مندر کا پجاری تھا، بھوت، پریت وہی آکر اتارتا تھا، اس کے ڈرائے ہوئے بیمار، اسی کے پاس علاج کے لئے آتے تھے، اور وہ ان سے خوب ٹکے وصول کرتا، بھوت اتارنے کے بارہ آنہ تو اس کے بندھے ہوئے تھے، کوئی ذرا کھاتا پیتا مریض ہاتھ لگ جاتا۔ تو روپیہ دو روپیہ وصول کر کے چھوڑتا۔ چاول، ماش کی دال، لوبان اور ناریل روپیہ کے علاوہ۔! اسے ترکیبیں بھی خوب سوجھتی تھیں، گاؤں کا مکھیا پورن، گاؤں کے سب آدمیوں سے زیادہ عقلمند تھا، وہ پڑھا لکھا بالکل نہ تھا، لیکن اس کی باتوں میں گہرائی، اور سوچ سمجھ پائی جاتی تھی، بھوت، پریت کے بعض بہت ہی بے سر و پا قصوں کو سن کر وہ ہنسا کرتا تھا، اس کے یہاں دو ہل کی کھیتی ہوتی تھی، تین پکے کنوئیں تھے، اور سو بیگھہ سے کچھ اوپر زمین، تین جوان بیٹے تھے، جو خون پسینہ ایک کر کے کمائی کرتے تھے، پورن گاؤں میں سب سے زیادہ مالدار تھا، اس کے کوٹھار میں پچاس سو من غلہ بھرا رہتا تھا، اس کو لوگ ہزار پانسو کی پونجی کا مالک سمجھتے تھے، پورن گاؤں والوں کے لئے "راک فیلر" اور "فورڈ" تھا جس جگہ کے رہنے والوں کو ایک وقت روٹی پیٹ بھر کر نہ ملتی ہو، بدن ڈھانکنے کے لئے کپڑا جن کو میسر نہ آتا ہو، ان کی نگاہ میں، پورن جیسا شخص دولت مند ہونا ہی چاہیئے۔ گاؤں والے پورن کی خوش نصیبی کی قسمیں کھاتے تھے، اور بعض تو اس کو لکشمی دیوی کا اوتار سمجھتے تھے۔ گردھاری نے، پورن کو دو ایک مرتبہ پھانسنے کی کوشش کی، مگر گردھاری اس کے جال سے صاف نکل گیا، وہ چڑی مار ہر بار کامیاب نہیں ہو سکتا، جو کبوتر اور قاز کے پھانسنے کے لئے ایک ہی قسم کا جال لگاتا ہے،

گردھاری نے گاؤں کے عام لوگوں کو جس جال میں پھانسا تھا، وہی جال اس نے پورن پر

پھینکا، یہ اُس کی بھول اور ناتجربہ کاری تھی، آزمودہ کار لوگ ہر شخص کو دیکھ بھال کر داؤں کرتے ہیں۔ پورن گاؤں کا مکھیا تھا اُس کی معمولی سی رپورٹ پر پولس والے گردہاری کو بڑا گھر دکھا کر چھوڑتے، اس لئے گردہاری اُس سے ڈرتا بھی تھا۔ مگر وہ ہر وقت اس موٹی اسامی کو پھانسنے کی فکر میں لگا رہتا تھا۔

گردہاری نے علم الید (Palmistry) کی ایک کتاب بھی نہیں پڑھی تھی، اور وہ اگر اس علم کی تمام کتابیں پڑھ بھی لیتا۔ تو کیا تھا۔ کیونکہ یہ بالکل ناتمام اور قیاسی علم ہے، شہر میں اُس نے بعض لوگوں کو دیکھا تھا۔ کہ وہ لوگوں کے ہاتھ دیکھ کر، ماضی اور مستقبل کی باتیں بتلاتے ہیں، اور خوب روپیہ پیسہ وصول کرتے ہیں، اُس نے بھی گاؤں والوں کے ہاتھ دیکھ کر پیشین گوئیاں شروع کر دیں۔ وہ گاؤں کے ہر آدمی کی حالت سے واقف تھا، لہٰذا گاؤں والوں کے ماضی اور حال کے متعلق وہ ہر چیز تفصیل کے ساتھ بیان کر سکتا تھا۔ اب رہا مستقبل، تو اُس کے متعلق جو چاہا کہہ دیا، اندھے کی لاٹھی، اگر لگ گئی تو لگ گئی۔ نہیں تو اپنے کہے ہوئے کی کوئی دلچسپ سی تاویل بیان کر دی۔ ہاتھ دیکھنے والے عام طور پر مستقبل کے متعلق مبہم باتیں بیان کرتے ہیں، کوئی کنواری لڑکی اُس کو ہاتھ دکھاتی، تو وہ ہاتھ کی لکیروں پر انگلی پھیرتا اور خوب سوچ سوچ کر بیان کرتا۔

"تو بچپن میں دکھیاری (بیمار)"

"رہی ہے، اور دکھیاری کیا رہی ہے، مر کر بچی ہے، تیری"

"ماں تجھ کو بہت چاہتی تھی، تیرے پتا سے زیادہ، تیرے"

"پتا کو تو اپنے بیٹوں سے زیادہ پریم تھا۔ اب تجھے بہت سی"

فکریں گھیرے ہوئے ہیں، مگر دل تھوڑا نہ کر، یہ چکر کوئی ڈیڑھ برس"

" رہیگا، پھر پو بارے ہیں، تیری بارات پورب کی طرف سے"

" آئیگی، کھانا پینا بر ملیگا۔ جو تجھ کو اپنی آنکھ کا تارا سمجھیگا"

" تیرے چھ بچے ہیں، دو بچے شاید زندہ نہ رہ سکیں، تیری عمر بہت ہے"

" ساٹھ سے بھی اوپر، اور ہاں! پچاس برس کی عمر میں تجھے کوئی دُکھ"

" ہوگا، اُس سے نکل گئی تو پھر چین ہی چین ہے ——————"

گردھاری کے بیان کا تجزیہ کرو۔ تو معلوم ہوگا کہ اُس نے صرف ذہانت سے کام لیکر کچھ باتیں کہہ دی ہیں، اہر شخص بچپن میں بیمار رہوتا ہے، ماں عام طور پر بیٹی سے محبت کرتی ہے، دُنیا میں ہر شخص کو ہر وقت افکار گھیرے رہتے ہیں جس لڑکی کا اس نے ہاتھ دیکھا تھا، اُس کے متعلق وہ پہلے معلوم کر چکا تھا کہ اُس کے بیاہ کی بات چیت پورب میں ہو رہی ہے اولاد اور عُمر کی پیشگوئی کے پورا ہونے کے لئے بیسیوں برس چاہئیں، جب تک کسی راجہ کا راج رہنا ہے۔

کوئی جوان آدمی ہاتھ دکھاتا تو عام طور پر گردھاری کہتا۔

" تجھے جس لڑکی سے پریم ہے، وہ بھی تجھ سے پریم کرتی ہے، مگر"

" بھیا اُس کی سگائی تو کہیں آن گاؤں ہونے والی ہے"

" تو چنتا (فکر) نہ کر تجھے استری سے بہت فائدہ ہوگا، دھن"

"ملیگا، اور اتنا دھن ملیگا کہ سب دلدر دور ہو جائیں گے"

"سنیچر کو دیوی پر سوا دو پیسہ کے بتاشے، اور پھول چڑھا دیا کر،"

"جا سب کام سدھ ہو جائیں گے۔"

عام طور پر جوان لڑکوں کو کسی نہ کسی عورت سے دلچسپی ہوتی ہے۔ اب اُس کو آپ تہذیبِ حاضر کی زبان میں محبت اور عشق بھی کہہ سکتے ہیں، گردھاری کے اس فن کا گاؤں گاؤں شہرہ ہو گیا تھا۔

اپنے فن کا لوہا منوانے کے لئے وہ یہ ترکیب کرتا کہ گاؤں کے کسی ایک آدھ کتاب پڑھے ہوئے کو اپنے پاس بٹھا لیتا، اور ہاتھ دیکھنے والے کے سامنے، ہاتھ دیکھنے سے پہلے کاغذ پر کچھ لکھ کر رکھ لیتا، ہاتھ دیکھنے کے بعد وہ اُس آدمی سے جس کا اُس نے ہاتھ دیکھا ہے دریافت کرتا۔

"کسی بادشاہ کا نام بتاؤ"

اس کے بعد پوچھتا

"کسی پھول کا نام لو"

گاؤں کے لوگ مسلمان بادشاہوں میں زیادہ سے زیادہ اکبر اور شاہجہان کا نام جانتے ہیں، ہندو بادشاہوں میں پرتھوی راج، بکرماجیت، اور جے چند کا، پھولوں میں گیندے، گلاب اور چنبیلی کا۔ اس سے آگے وہ کچھ نہیں جانتے۔ گردھاری ان ہی ناموں سے کوئی دو نام لکھ لیتا، اور نوے فیصدی اُس کا لکھا ہؤا پورا ہوتا۔ اگر اس کے لکھے ہوئے سے ہاتھ دکھانیوالے کا بیان مطابقت نہ کرتا، تو وہ کوئی بہانہ بنا کر، ٹال دیتا۔

گاؤں کا مکھیا پورن، گر دھاری کو اچھا نہ سمجھتا تھا۔ مگر جب بہت سے لوگوں نے اُس سے آ آکر کہا کہ گردھاری ہاتھ دیکھ کر اگلی پچھلی باتیں بیان کر دیتا ہے۔ تو اس کو بھی ہاتھ دکھانے کا شوق ہوا انسان فطری طور پر اغراض کا بندہ واقع ہوا ہے۔ یہی اغراض اُس کو ہر نا جائز سے نا جائز فعل کے ارتکاب پر آمادہ کرتی ہیں آئندہ کیا ہوگا؟ اس کے جاننے کے لئے تو انسان ہر وقت بے تاب رہتا ہے گردھاری لاکھ ہوشیار اور سمجھدار سہی، لیکن اغراض تو اس کے پیچھے بھی لگی ہوئی تھیں۔ اُس نے گردھاری کو ہاتھ دیکھنے کے لئے بُلایا۔ گردھاری کو جب پورن کا بلاوا پہنچا۔ تو وہ خوشی کے مارے باغ باغ ہو گیا وہ تو پورن کے پھانسنے کی فکر میں مدت سے لگا ہوا تھا اور اب تو شکار نے خود صیاد کو دعوت دی تھی ایسے بھیے شکار روز روز تھوڑی ملتے ہیں۔

گردھاری نے نہا دھو کر صاف کپڑے پہنے، ماتھے پر چندن لگایا، اور بغل میں ایک کتاب دبا کر پورن کے گھر پہنچا پُورن اپنی چوپال پر بیٹھا ہوا حقہ پی رہا تھا، جاڑے کی رُت تھی، چوپال کے صحن میں الاؤ لگا ہوا تھا، بہت سے لوگ الاؤ کے آس پاس بیٹھے تاپ رہے تھے، اور اگر الاؤ نہ بھی ہوتا، تو بھی گاؤں کے مکھیا کی چوپال میں دو چار آدمی تو ہر وقت بیٹھے ہی رہتے ہیں گردھاری نے گاؤں والوں کو ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا۔ پورن پلنگ کی پائنتی کی طرف سرک گیا، اور گردھاری کو سرہانے جگہ دی۔

" مہاراج! تم نے یہ علم کہاں سیکھا ہے۔" پورن نے چلم کی راکھ الاؤ میں ڈالتے ہوئے کہا۔

" ورنڈاکر جی! میں کوئی دو سال تک متھرا میں رہا ہوں۔"

" وہاں کاشی جی کے ایک بڑے وِدوان جوتشی سے"

" اس ودّیا کو سیکھا ہے، اس علم کا نام سامدرکہ ہے، ہاتھ "
" کی ریکھائیں (لکیریں) دیکھ کر سب کچھ معلوم ہو جاتا ہے، یہ "
" ودیا بڑی سانچی ہے، جو پنڈت جی میرے گرو تھے "
" وہ آجکل گیا کے مندر میں تپسیا کر رہے ہیں۔ بڑے دیالو گرو ہیں، "
" ایسے ویسے کو وہ چیلا تھوڑی بناتے ہیں، پہلے اُس کی پرکھشا "
" (امتحان) لیتے ہیں جب وہ پرکھشا میں پورا اُترتا ہے، تب جاکر "
" کچھ بتاتے ہیں۔ مہاراجی کے ایک سیٹھ کے لئے گروجی نے کہا تھا، "
" کہ فلاں تاریخ کو فلاں وقت اُس کا انتقال "
" ہو جائیگا، ٹھیک اسی وقت سیٹھ مر گیا، گروجی بڑے سنیاسی اور مہاتما، "
" تھے، اُن ہی کی جوتیاں میں نے اٹھائی ہیں۔ جو تھوڑی بہت ودّیا آگئی "
" ہے ______________ گردھاری نے جواب دیا

گردھاری کی میٹھی باتوں کا جادو پورن مکھیا پر چل گیا، پُورن نے اپنی ہتھیلی کو انگوچھے سے اچھی طرح رگڑا، اور اکڑوں بیٹھ کر، اپنا ہاتھ گردھاری کے آگے بڑھا دیا۔ گردھاری نے پورن کے ہاتھ کو بڑے غور سے دیکھا۔ بہت دیر تک ہاتھ کی لکیروں کی جانچ پڑتال کرتا رہا۔ کئی دفعہ کتاب کو دیکھا پھر بولا :-

" ٹھاکر جی! آپ کے بچپن میں چیچک نکلی ہے، اور ایک دفعہ "

" آپ ڈوبتے سے بچ گئے ہیں"

اس پر ٹھاکر گردھاری کی بات کاٹ کر بولا:-

" مہاراج! آپ نے ٹھیک کہا، میرے چیچک بھی نکلی ہے۔ اور"

" ایک دفعہ میں بھینس کی پیٹھ پر بیٹھ کر تالاب کو پار کر رہا تھا، بھینس نے"

" بیچ تالاب میں ڈبکی لگائی، اور میں پانی میں ڈبکیاں کھانے لگا۔ وہ تو"

" ایشور کو میری جان بچانی تھی۔ کہ کنارے کے آدمیوں نے

مجھے نکال لیا نہیں تو ———— !

گردھاری کی نظریں بدستور لکیروں پر جمی ہوئی تھیں۔ اُس نے لکیروں پر انگلی پھیرتے ہوئے

کہا:-

" آجکل آپ کو بہت سی فکریں ہیں، رات کو برابر نیند نہیں آتی "

" ہر وقت دل بے چین رہتا ہے۔ آپ کے اسی گاؤں میں بہت سے دشمن ہیں"

" میں آپ کے سب سے بڑے دشمن کا بھی نام بتا سکتا ہوں، "

" اتنا کہہ کر، گردھاری نے بیٹھے ہوئے آدمیوں کو ذرا گھبرا کر دیکھا۔ اس پر پورن نے مونچھوں

کو انگوچھے سے پونچھتے ہوئے کہا:-

" مہاراج! یہ اپنے ہی آدمی ہیں، آپ گھبرائیں نہیں، ہاں! تو"

" میرا دشمن کون ہے — !

" گردھاری نے پورن کے ہاتھ پر نظر جماتے ہوئے کہا۔

" گاؤں کا پٹواری، ٹھاکر جی! آپ کو اس پٹواری سے بہت بڑا "

" نقصان پہنچنے والا ہے، ہوشیار رہیے، یہ پٹواری کا بیٹا بچہ، بڑا حرامی"

کا بنا ہوا ہے۔

اس پر ایک آدمی نے، جو چلم پر آگ رکھ رہا تھا۔ دبی آواز میں کہا :۔

" مہاراج نے ٹھیک کہا، یہ پٹواری کئی دن ہوئے مجھ سے کہہ رہا تھا۔ کہ "

" ہمارے گاؤں کے مکھیا، گاؤں والوں پر جاستی (زیادتی) کرنے لگے ہیں "

یہ سن کر، پورن کا چہرہ لال پڑ گیا۔ اس نے گرجدار آواز میں کہا :۔

دیکھ لوں گا اس پٹواری کے بچہ کو، ہماری بلی اور ہمیں سے میاؤں! "

" اب کے بیسیا کہ میں اس نے میرے ایک کھیت کو جو خالی "

" پڑا تھا، فصل والے کھیتوں میں لکھ دیا تھا "

گردھاری کا فریب اپنا کام کر رہا تھا۔ اس نے پھر کہنا شروع کیا :۔

" ٹھاکر جی! آپ کی عمر کی ریکھا، آخر میں جا کر ذرا دھندلی پڑ "

" گئی ہے، نہیں تو سو سال کی عمر ہوتی آپ کی! پھر بھی ایشور کی "

" کرپا سے اسی، بیاسی سال کی عمر ہوگی، ساٹھ سال کی عمر "

" میں آپ کو دکھ ہوگا۔ مگر ایشور کی کرپا سے دکھ "

" زیادہ دن نہ رہیگا، اُس کے بعد تو چین ہی چین ہے۔ "

" ٹھاکر جی! آپ ہر منگل کو کچھ دان دیا کیجئے، ایک بھوت "

" سے آپ کو نقصان پہنچنے کا ڈر ہے، آپ دان دیا کرینگے تو "

" بھوت کے کرتوتوں کی کاٹ ہوتی رہیگی۔ "

" بس مہاراج! آپ کا ہاتھ جو کچھ کہہ رہا ہے، وہ میں نے بتا دیا "

" ایشور کے بھید، ایشور ہی جانتا ہے۔ پرمیشور آپ کو سدا "

" سکھی رکھے ———————— "

اس پر پورن نے خوش ہو کر کہا:۔

" مہاراج! آپ کی ہر بات میرے دل میں اتر رہی ہے، آپ تو "

" بڑے بھگت اور مہاتما معلوم ہوتے ہیں۔ اور کیوں نہو، آپ "

" چوبیسوں گھنٹے دیوی جی کے چرنوں میں رہتے ہیں۔ جب ہم جیسے "

" پاپیوں کو دیوی جی فائدہ پہنچاتی ہیں، تو آپ تو اُن کی "

" سیوا ہی کرتے رہتے ہیں۔ "

سب لوگوں نے پورن کی رائے سے اتفاق کیا، اور گردھاری کی جی کھول کر تعریف کی، پورن چوپال سے اٹھ کر گھر گیا،

اور وہاں سے ایک بڑے تھال میں آٹا، دال، گڑ کی بھیلی اور کچھ پیسے لیکر واپس ہوا۔ گردھاری

نے تمام سامان اپنی چادر میں باندھ لیا، اور پورن کی سخاوت کے گیت گاتا ہوا وہاں سے رخصت ہو گیا۔

اس طرف تو گردھاری نے گاؤں کے مکھیا پورن کو پٹواری کی طرف سے بدگمان کر دیا۔ اور اُدھر پٹواری سے جا کر کہہ دیا۔ کہ پورن تمہاری مخالفت پر تلا ہوا ہے۔ اُس سے بچے رہنا۔ جب ایک دوسرے سے بدگمانی ہو جاتی ہے۔ تو چھوٹی چھوٹی باتیں، جو صفائی اور میل ملاپ کے زمانہ میں درگذر کرنے کے قابل ہوتی ہیں، بہت زیادہ شدید اور اہم نظر آنے لگتی ہیں۔ یہاں تک کہ دونوں طرف سے عداوت کا مظاہرہ ہوتا ہے، اور دونوں ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو جاتے ہیں۔ پھر یہاں تو گردھاری جیسا فتنہ ساز شخص موجود تھا جس کو مخالفت کی خلیج کو وسیع سے وسیع تر کرنے کی ہر وقت دھن تھی۔

پورن مکھیا بھوت پریت کی باتوں پر ہنسا کرتا تھا، مگر گردھاری نے جو اُس کا ہاتھ دیکھ کر کہا کہ:-

"ایک بھوت سے آپ کو نقصان پہنچنے کا ڈر ہے"

اس سے پورن چوکنا ہو گیا۔ اور گردھاری کے کہنے کے مطابق ہر ہفتہ تھوڑا بہت دان دینے لگا، مگر گردھاری غریب مکھیا سے کافی معاوضہ چاہتا تھا۔ اس "تھوڑے بہت" کے لئے اُس نے یہ ڈھونگ ڈھونڈی کیا تھا، گاؤں کے بہت قریب ایک چھوٹا سا باغ تھا، جس میں آم کے بہت سے گھنے درخت تھے۔ باغ کے چاروں طرف جامن کے درختوں کی روش تھی، گاؤں والوں کے لئے یہ باغ خطۂ کشمیر تھا۔ گرمیوں کی دوپہریاں وہ اِسی باغ میں گذارتے، اور آم کی فصل میں تو یہ باغ آدمیوں سے بھرا رہتا تھا۔ چھوٹی چھوٹی لڑکیاں کالی کالی جامنوں سے ٹوکریاں بھر بھر کر اپنے گھروں کو لاتیں۔ صبح سے شام تک

ایک میلہ لگا رہتا۔ اس باغ کے پچھم میں قدرے نشیب تھا۔ جس میں خودرو درختوں کے جھنڈ تھے۔ اسی نشیب کے قریب برگد کا بہت پرانا درخت تھا۔ یہ درخت بھوت پریت کے لئے پہلے سے بدنام تھا، گردھاری نے اس بدنامی کو حقیقت بنا دیا تھا۔ اور لوگ رات کو یہاں سے گذرتے ہوئے کتراتے تھے۔

جاڑے کی رُت تھی، مہاوٹ نے جاڑے کی شدت میں بہت زیادہ اضافہ کر دیا تھا پورن مکھیا اُس دن کسی کام سے تھانہ گیا ہوا تھا۔ گردھاری، پٹواری اور مکھیا کے حالات کی خبر رکھتا تھا۔ شام سے کچھ قبل اُسے یہ معلوم ہو گیا۔ کہ پورن ابھی تھانہ سے واپس نہیں ہوا۔ یہ موقعہ اس کے لئے بہت غنیمت تھا، اُس نے ایک مُرغا پکڑا کالا کمبل بغل میں دبایا۔ اور گاؤں کے لوگوں کی نگاہوں سے بچتا ہوا باغ میں جا پہنچا۔ تھانہ کا راستہ اسی باغ کے برگد کے نیچے سے جاتا تھا۔ گردھاری کمبل اوڑھ کر، برگد کی ایک شاخ پر بیٹھ گیا جب ذرا اندھیرا پھیل گیا۔ تو اُسے کوئی آدمی سامنے سے آتا ہوا دکھائی دیا۔ آنیوالے آدمی نے کھانسنا شروع کیا۔ گردھاری کا دِل باغ باغ ہو گیا۔ جس شکار کے اُس نے جال بچھایا تھا، وہ جال کے بالکل قریب آچکا تھا۔ پورن جب برگد کے نیچے آیا تو گردھاری نے مرغے کو اُس کے سر پر اس زور سے پھینکا کہ پورن کا سر چکرا سا گیا، پورن نے درخت کی طرف سر اٹھایا۔ تو گردھاری نے "ہوں ہوں" کر کے شاخوں کو زور سے ہلایا پورن کو کوئی کالی چیز حرکت کرتی ہوئی نظر آئی، رات کا سناٹا ہوں ہوں کی بھیانک آواز، درخت کا بھوت پریت کے لئے بدنام ہونا۔ پورن خوف کے مارے تھر تھر کانپنے لگا۔ اُس کے پیر خوف کی شدت

سے اتنے بوجھل ہوگئے تھے۔ کہ اٹھائے نہ اٹھتے، وہ جیسے تیسے مکان پہنچا، اور نیم دیوانگی کے انداز میں بڑبڑانے لگا۔

"مرغا، بہت بڑا مرغا، بھیڑیے سے زیادہ ڈراؤنا، میرا تو"

"سر چکرا گیا۔ برگد کی ڈالیوں پر ہی تھا۔ وہ ...... کوئی ..."

"کالی رنگت کا بھوت ہی ہوگا۔ ارے کوئی گردھاری"

"پجاری کو بُلاؤ۔"

پورن کی باتیں، گھر والوں کی سمجھ میں بالکل نہ آئیں۔ مگر برگد اور بھوت کے الفاظ سے اُن کو تھوڑا بہت اتا پتا مل گیا۔ گردھاری مندر میں آچکا تھا۔ پورن کا منجھلا بیٹا بھاگتا ہوا مندر میں پہنچا، اور گھبرا کر بولا:۔

"پجاری جی! میرے پتا دکھاری (بیماری) ہوگئے"

"ہیں، نہ جانیں کیا بک رہے ہیں، آپ جلدی چلئے!"

"وہ آپ کو یاد کر رہے ہیں ————"

گردھاری بغل میں کتابوں کا بستہ دبا کر، پورن کے لڑکے کے ساتھ چل دیا۔ گردھاری کو دیکھ کر پورن تکیہ کے سہارے اٹھ کر بیٹھ گیا، وہ کچھ کہنا ہی چاہتا تھا۔ کہ گردھاری نے پورن کے دل پر ہاتھ رکھ کر کہنا شروع کیا:۔

"مکھیا جی! آپ گھبرائیں نہیں، سب کام ٹھیک ہو جائیگا"

"میرے پاس اس برگد والے بھوت کا کاٹ موجود ہے، وہ رنجش"

"ایک مرغا کیا، ہزار مرغے بھی اگر لیکر آئے، تو بھی آپ کا بال بیکا"

"نہیں ہو سکتا ________________"

ان جملوں کو پورن نے حیرت کیساتھ سُنا، اور یہی حیرت اُس کی گھبراہٹ کے لئے سکون کا پیام بن گئی، اُسے پسینہ آگیا، اور پسینہ آتے ہی جسم ہلکا ہو گیا۔ اُس کے دِل کی دھڑکن میں کمی ہوتی گئی، یہاں تک کہ پورن اپنی اصلی حالت پر آگیا۔ پورن کو ہوش میں پاکر سب لوگ خوش ہو گئے۔

"مہاراج! آپ نے مجھے موت کے مُنہ سے نکالا ہے، میں آپ کے"

"احسان کو ساری عمر نہیں بھول سکتا، دیوی کے پترون ہیں"

"رہتے رہتے آپ بھگت ہو گئے ہیں کہ پچھلی اور اگلی باتیں"

"اس طرح بتاتے ہیں، جیسے آپ کی آنکھوں کے سامنے ہر بات"

"گذر رہی ہے میں کسی قابل نہیں ہوں مگر جو آپ کہیں گے"

"اُس کو ٹالوں گا نہیں، یہ مکان، جائداد، گھر بار سب آپ ہی کا"

"ہے۔!" پورن نے گردھاری کو شکریہ آمیز نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"ٹھاکر جی! یہ سب آپ کی کرپا اور من کے اُجالے"

"کی وجہ ہے جو آپ مجھے ایسا سمجھتے ہیں، میں تو دیوی جی کا"

"بس ایک داس ہوں، اس سے زیادہ کچھ نہیں!"

"آپ کا گھر بار آپ کو مبارک! میں تو یہ چاہتا ہوں کہ"

"بھوت کی پورے طور پر کاٹ ہو جائے اور وہ پھر آپ کو نہ"

"ستا سکے، اس کے لئے آپ کو دان دینا ہوگا۔ آم کے باغ کے"

"قریب جو آپ کا کھیت ہے، بس اُس کی پیداوار آپ مندر میں"

"بھجوا دیا کیجئے، مندر کے جاتریوں کی اُس پیداوار سے سیوا کی"

"جائیگی، شورا تری اور جنم اشٹمی کو "ہون" ہوا کریگا، بس"

"پھر آپ کے لئے کوئی کھٹکا نہیں ہے، ایک بھوت کیا، ہزار بھوت بھی۔"

"اگر آپ کے خلاف ہو جائیں تو آپ کا کچھ بگاڑ نہیں سکتے، اور ہاں"

"کاتک کی پیداوار بھی آپ کو دینی ہوگی، ———— گردھاری نے جواب دیا

"مہاراج! آپ کے حکم کو بھلا میں ٹال سکتا ہوں، آپ اس سے زیادہ کے لئے"

"کہتے تو بھی میں آپ کی بات کو پورا کرتا۔ آپ اطمینان"

"رکھئے فصل کے فصل کھیت کی پیداوار ایک ایک دانہ مندر میں پہنچ جایا کریگی"

"کاتک کی فصل میں، کھیت کے ایک حصّہ میں کپاس اور دوسرے حصّہ میں باجرہ"

"پیدا ہوا تھا۔ کپاس تو کوئی بیالیس روپیہ کو بک گئی، اور باجرہ"

"کوٹھار میں بند ہے، میں کل صبح کچھ روپے اور باجرہ مندر میں بھجوا دونگا" پورن نے ہاتھ

ملتے ہوئے کہا۔

گردھاری جب چلنے لگا، تو پورن نے اُس سے پوچھا کہ میں رات کو کیا کھاؤں؟ گردھاری نے بستہ کھول کر ایک کتاب نکالی۔ اور اُس کے ورق اُلٹنے کے بعد کہا۔

"آپ رات کو غلّہ کی قسم سے کوئی چیز نہ کھائیں، آدھ سیر دودھ"
"گڑ ڈال کر پی لیں، اور دودھ پیتے ہی سو جائیں، صبح کو"
"آپ کی طبیعت کا بوجھ ہلکا ہو جائیگا، اور طبیعت پھول سی"
"معلوم ہوگی۔"

گردھاری لکھیا کے یہاں سے رخصت ہو کر مندر پہنچا۔ اور خوشی خوشی سو گیا اپنی کامیابی پر وہ اس قدر خوش تھا۔ کہ دُنیا کے بڑے سے بڑے فاتح کو بھی، اپنی فتح اور کامیابی پر اتنی خوشی نہ ہوئی ہوگی۔ صبح سویرے پورن لکھیا کا لڑکا بیالیس روپے اور گاڑی میں باجرہ لیے ہوئے پہنچ گیا۔ گردھاری نے مندر کی ایک کوٹھری میں باجرہ ڈلوا دیا اور پورن کو دُعائیں دیتے ہوئے روپے لے لئے۔ گردھاری کی یہ پہلی کامیابی تھی اب اس کے مُنہ سے لہو لگ چکا تھا۔ جس نے اس کی ہوس کو بہت زیادہ بڑھا دیا تھا۔

گاؤں کے پٹواری اور پورن لکھیا میں کشیدگی بڑھتی جاتی تھی۔ اور یہ سب کچھ

گردھاری پجاری کا کیا دھرا تھا، گردھاری دونوں سے ملا ہوا تھا۔ وہ دونوں کو ایک دوسرے کی مخالفت کے لئے اُبھارتا۔ اس منافقت اور سازش نے تو بڑی بڑی حکومتوں کو غارت کر دیا ہے۔ اور بڑے بڑے ہوشمند مدبّروں کو زیر دیکھنا پڑا ہے۔ پٹواری اور مکھیا تو بہت ہی سیدھے سادھے تھے۔ اُن کو آپس میں لڑا دینا کیا مشکل تھا۔ گردھاری ہمیشہ موقعوں کی تلاش رکھتا تھا، سازش اور منافقت کی دُنیا تو بہت وسیع ہے۔ زندگی کے بازار میں ایسے موقع مل ہی جاتے ہیں ؂

گاؤں میں تحصیلدار کی آمد کی خبر نے، سارے گاؤں کو ہلا دیا۔ شہر کے رہنے والے شاید گاؤں والوں کی اس خوف و دہشت کا حال پڑھ کر مسکرائیں گے۔ مگر میں جو کچھ کہہ رہا ہوں۔ اُس میں ذرہ بھر مبالغہ نہیں ہے جس جگہ ایک لال پگڑی والے کو گورنر کا قائم مقام سمجھا جاتا ہو۔ وہاں کے لوگوں کو تحصیلدار کی آمد کی خبر سے گھبرا ہی جانا چاہیئے، گاؤں کے قریب جس باغ میں تحصیلدار کا کمپ لگنے والا تھا۔ اُس کی صفائی شروع ہوگئی، کمہاروں نے آوے لگا دئے، گھوڑوں اور بیلوں کے لئے چارہ اکٹھا ہونے لگا، دوکاندار رسد کا انتظام کرنے لگے، ایسے موقعوں پر ذلیل فطرت سپاہیوں اور چپراسیوں کی خوب بن آتی ہے گاؤں والوں پر وہ حکومت کیا کرتے ہیں ظلم کرتے ہیں، ایسا ظلم کہ جو بیچاروں کو ایک زمانہ تک سوہان روح میں مبتلا رکھتا ہے۔ ضرورت ہوتی ہے پچاس گھڑوں کی اور یہ لوگ گاؤں کے کمہاروں سے ایک ہزار سے کچھ اوپر ہی گھڑے وصول کرکے چھوڑتے ہیں۔ بیس مزدور ڈیرے لگانے کے لئے کافی ہو سکتے ہیں۔ مگر یہ خدا کے بندے سو ڈیڑھ سو مزدوروں سے کام لیتے ہیں، اور غریبوں

کو ایک پیسہ نہیں دیتے، اس کا نام اُن کی زبان میں "بیگار" ہے۔ تحصیلدار کے ساتھ چند گھوڑے اور چند بیل ہوتے ہیں۔ اور گاؤں والوں سے ایک پلٹن کے گھوڑوں کے لئے چارہ جمع کروایا جاتا ہے دوکانداروں کو رسد فراہم کرنے میں اپنی جمع پونجی کا بڑا حصّہ لگا دینا پڑتا ہے کیونکہ رسد میں ہر چیز آدھے داموں پر دینی پڑتی ہے۔ جے گنج کے رہنے والوں کے لئے بھی تحصیلدار کا آنا قیامت سے کسی طرح کم نہ تھا۔ پٹواری اور مکھیا یہاں کے ذمہ دار افسر تھے، ان بیچاروں کو تو راتوں کو نیند نہ آتی تھی، اُن کے دل و دماغ پر تحصیلدار صاحب برگد والے بھوت کی طرح مُسلّط تھے۔ گردھاری سپاہیوں اور چپراسیوں سے مل گیا تھا، سپاہیوں اور چپراسیوں نے گردھاری کے اشارے سے گاؤں والوں کو اور زیادہ ستایا۔ گردھاری بہت زیادہ ہوشیار تھا، وہ ٹٹی کی آڑ میں شکار کھیلتا تھا۔ مقررہ تاریخ پر تحصیلدار صاحب جے گنج تشریف لائے، گاؤں والوں نے دیدہ و دل کو فرشِ راہ بنا کر اُن کا استقبال کیا، مگر تحصیلدار نے ان پُرخلوص استقبال کرنے والوں پر ایک نگاہِ غلط انداز بھی مشکل ہی سے ڈالی، وہ گھوڑے پر سوار تھے، اور گاؤں والوں کی قطار سے گھوڑا دوڑاتے ہوئے کیمپ چلے گئے۔ گاؤں والے تحصیلدار صاحب کی صورت بھی اچھی طرح نہ دیکھ سکے، گاؤں والوں کی نگاہیں تحصیلدار کے جمال جہاں افروز کے نظارہ کے قابل کہاں تھیں!

تحصیلدار صاحب کے جے گنج میں دو دن کے قیام کے بعد، اُن کے چند رشتہ دار بھی وہاں آ گئے، سیر و تفریح کے لئے شکار کے لئے، ممکن ہے کہ یہ لوگ خود ہی گاؤں کی ہوا کھانے کے لئے چلے آئے ہوں اور اس کا بھی گمان غالب ہے کہ تحصیلدار صاحب نے اپنی حکومت کا نظارہ کرانے کے لئے ان

لوگوں کو بُلایا ہو۔ بہرحال وہ لوگ آئے اور اس طرح آئے کہ گاؤں کے چوطرف بندوقوں کی آوازوں نے تمام گاؤں کو سہما دیا۔ اور دو تین دن ہی میں تمام پرندوں کا صفایا ہو گیا۔ انڈے اور مرغی کی سربراہی پُورن کھیا کے ذمہ تھی۔ اُسے تحصیلدار کے رشتہ داروں کے آنے کی اطلاع نہیں دی گئی تھی، اُس غریب نے تحصیلدار صاحب ہی کے لئے انتظام کیا تھا۔ تحصیلدار کے رشتہ دار تو شاید مرغی اور انڈے کھانے کے لئے ہی بے گنج آئے تھے، پورن نے آس پاس کے گاؤں سے بھی مرغی اور انڈے مہیا کئے۔ مگر چوتھے دن مرغی اور انڈے کا توڑا پڑ گیا یعنی تحصیلدار کے ناشتہ میں صرف آٹھ انڈے اور تین بھنے ہوئے چوزے تھے، تحصیلدار کے رشتہ دار آن کی آن میں انڈے اور چوزے چٹ کر گئے۔ تحصیلدار نے باورچی سے انڈے اور چوزے لانے کے لئے کہا، باورچی نے کہا ایک بھی انڈا اور چوزہ باقی نہیں رہا۔ اس جواب کا سننا تھا کہ تحصیلدار صاحب کے آگ ہی تو لگ گئی، وہ باؤلے کتے کی طرح چلّانے لگے، تمام عملہ تھرا اٹھا، سپاہی اپنی اپنی جگہ سہم گئے اور اہلکار اپنی جھولداریوں میں خوف کے مارے کانپنے لگے۔ ہر شخص اپنی جگہ غیر مطمئن اور خوف زدہ تھا۔ تحصیلدار کو جب یہ علم ہوا کہ انڈوں اور چوزوں کی سربراہی گاؤں کے مکھیا کے ذمہ ہے۔ تو وہ اور زیادہ برافروختہ ہوئے۔ انہوں نے مکھیا کے بلانے کے لئے حکم دیا۔ تحصیلدار صاحب کے مُنہ سے دو بول کیا نکلے کہ کوئی چھ چپراسی گاؤں کی طرف دیوانہ وار دوڑنے لگے، پورن مکھیا اپنی چوپال کے تخت پر بیٹھا ہوا رسی بٹ رہا تھا اور دو تین آدمی چلم پی رہے تھے، چپراسیوں کو آتا دیکھ کر پورن کے ہوش و حواس جاتے رہے رسی اس کے ہاتھ سے چھوٹ پڑی دوسرے لوگوں نے اپنی چلموں کو گھبرا کر الاؤ میں پھینک دیا۔

" تم کو تحصیلدار صاحب نے بلایا ہے۔" تمام چپراسیوں نے یک زبان ہو کر کہا۔

" مجھے بُلایا ہے، ابھی چلتا ہوں، گھر میں جا کر "

" ذرا منڈاسہ باندھ آؤں " پُورن مکھیا نے گھبرا کر جواب دیا۔

" ٹھاٹ کی ضرورت نہیں ہے، جس حالت میں ہو، اُسی "

" حالت میں چلو، نہیں تو ساری مکھیا گری رکھی رہیگی "

ایک شتنڈے سپاہی نے پورن کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

پورن سپاہیوں کے ساتھ ہولیا، وہ سپاہیوں کے نرغے میں تھا، اُس کا دل دھک دھک کر رہا تھا، ذرا سی دیر میں اُس کا چہرا بہت دن کے مریض کی طرح پیلا پڑ گیا تھا۔ پورن کو تحصیلدار صاحب کے سامنے پیش کیا گیا۔

" تم ہی ہو یہاں کے مکھیا۔! ——" تحصیلدار نے گرجتی ہوئی آواز میں کہا۔

" حضور ان داتا! میں ہی ہوں، آپ کا "

" مکھیا ——" پورن نے کپکپاتے ہوئے جواب دیا۔

" یہ تم نے انڈے اور چوزے اتنی کم تعداد میں "

" کیوں بھیجے ہیں ——" تحصیلدار میز پر مُکّی ٹیکتے ہوئے بولا۔

" حضور اجے گنج کی تمام مرغیاں اور انڈے ختم "

" ہو گئے، اور میں نے آس پاس کے گاؤں سے بھی حضور کے لئے "

منگائے ہیں۔ ـــــــــــــــــــــــــــــ" پورن نے ٹوپی سنبھالتے ہوئے جواب دیا۔

اس جواب نے تحصیل دار کے آگ لگا دی۔ وہ غصے سے بے تاب ہو کر زور زور سے میز کو ہلانے لگے۔ پورن کو سینکڑوں بے نقط سُنا دیں۔ پورن ڈر کے مارے تھر تھر کانپ رہا تھا۔ اُس کی روح تحلیل ہوئی جاتی تھی۔ تحصیل دار کا ایک ایک لفظ اُس کے کان کے پردوں سے پگھلے ہوئے سیسہ کی طرح ٹکراتا تھا۔ آخر میں تحصیل دار صاحب نے فرمایا۔

"چلے جاؤ میرے سامنے سے! بدمعاش کہیں کے!

"میرے یہاں روزانہ دو ڈھائی درجن انڈوں اور سات آٹھ"

"چوزوں کا خرچ ہے۔ اگر اس میں کمی آگئی۔ تو تمہاری کھیا گری کی"

"خیر نہیں! حوالات میں ٹھونس دوں گا ـــــــــــــــــ"

پورن وہاں سے روانہ ہوا، مگر اس طرح کہ اُس کا دل دھڑک رہا تھا، اور اس کے کانوں میں تحصیل دار کی کرخت آواز گونج رہی تھی۔ تحصیل دار نے جتنے انڈوں اور چوزوں کی تعداد بتائی تھی اُس کی فراہمی قریب قریب ناممکن تھی۔ وہ تو پورن کے دن اچھے تھے کہ ضلع سے تحصیل دار کے نام طلبی کا حکم آ گیا۔ اور وہ اسی دن جی گنج سے چلے گئے۔ نہیں تو پورن کی ساری عزت خاک میں مل جاتی۔ تحصیل دار کے جانے کے بعد گاؤں والوں نے اطمینان کی

سانس لی۔

"گردھاری کو جب اس واقعہ کی خبر ہوئی۔ تو وہ فوراً پورن کے پاس بھاگا ہوا آیا، اس نے پورن سے آکر کہا۔

"ٹھاکر جی! یہ سب پٹواری کی شرارت ہے، قانون گو صاحب نے"

" اسے اطلاع دے دی تھی۔ کہ تحصیل دار صاحب کے رشتہ دار بھی آ رہے ہیں۔"

" رسد کا معقول انتظام رکھنا، پٹواری نے آپ کو اس کی خبر تک نہ دی"

" اگر وہ آپ کو اس کی اطلاع دے دیتا۔ تو آپ انڈے اور مرغی کا"

" پہلے سے بندوبست کر لیتے ——————— "

اس پر پورن نے جواب دیا:۔

" یہ پٹواری تو میری آبرو کا دشمن ہو گیا ہے۔ میں نے اس کی باتوں کو بہت کچھ"

" ٹالا ہے، مگر اب میں اس سے بدلہ لوں گا، اگر اس کا بیٹنہ بچہ کا بستہ"

" نہ چھنوا دیا، تو میرا نام پورن نہیں، مہاراج! آپ کو بھی میری مدد کرنا"

" پڑیگی،

گردھاری نے جواب میں کہا۔

" ٹھاکر صاحب۔ اس پٹواری کو بھگالس دینا کون بڑی بات ہے، پرسوں ہی کا قصہ

ہے"۔

" گاؤں کے بھولا چمار کو پٹواری نے لات گھونسوں سے مارا تھا۔ آپ اُس چمار کو"

" کچھ دے دلاکر راضی کیجئے۔ اور اُس کی طرف سے فوجداری میں دعوے دائر کرا دیجئے"

" ایک دعوے میں دیوان جی کا مزاج درست ہو جائیگا۔ "

اس پر پُورن خوش ہوکر بولا:۔

" بھئی مہاراج اکیا ترکیب تبلائی ہے۔ دو تین دن میں ہمارے کھیت"

" کٹ جائیں گے، اُس کے بعد فرصت ہی فرصت ہے میں چمار کو "

" راضی کرکے پٹواری پر ضرور دعوے کرا دونگا۔ اس بھولا چمار پر تو میرے"

" روپیہ آتے ہیں۔ وہ میرا کہا ٹال نہیں سکتا۔ ———— "

گردھاری نے یہاں تو پُورن کو پٹی پڑھائی، اور وہاں پٹواری سے جاکر کہہ دیا کہ تم پر مکھیا دعویٰ دائر کروانیوالے ہیں ہوشیار رہنا۔ پورن نے ایک ہفتہ بعد پٹواری پر دعویٰ دائر کرا دیا۔ اور دونوں میں مقدمہ بازی شروع ہوگئی۔ گردھاری کی اب چاندی ہی چاندی تھی، وہ پٹواری اور مکھیا کو دونوں ہاتھ سے لوٹ رہا تھا۔ کچہری میں جاکر اہلکاروں کو پٹی پڑھا دیتا۔ اور پٹواری اور مکھیا سے ایک کی جگہ چار وصول کرتا۔

مقدمہ چل رہا تھا، استغاثہ کی شہادت ختم ہو چکی تھی، صفائی کی شہادت ہو رہی تھی، گردھاری نے پورن کو پٹی پڑھائی کہ ڈپٹی صاحب اپنے سالے کے ذریعہ کھاتے پیتے ہیں۔ میں نے اُن کے سالے سے معاملہ طے کر لیا ہے، سو روپیہ میں ڈپٹی صاحب پٹواری کے خلاف فیصلہ سُنا دینگے، پورن پر پٹواری کی مخالفت کا بھوت سوار تھا۔ اس نے اپنا غلّہ بیچ کر سو روپیہ گردھاری کے حوالے کر دئے، گردھاری ضلع کو گیا۔ وہاں دو ایک دن رہ کر واپس ہوا۔ اور پورن سے آ کر کہہ دیا کہ ڈپٹی صاحب نے رقم لے کر استغاثہ کے موافق فیصلہ کر دینے کی ہامی بھر لی ہے۔ مقدمہ اس اعتبار سے تو سچا تھا کہ پٹواری نے بھولا چمار کو مارا تھا، مگر گاؤں کی دنیا میں ایسے واقعات روزانہ ہوتے رہتے ہیں، اور گاؤں پر ہی کیا منحصر ہے شہروں میں بھی اس قسم کی مار پیٹ اور گالی گلوچ کی کیا کمی ہے، اگر بات بات پر اس طرح دعوے ہوا کریں تو تمام بیروزگار گریجویٹوں کو فوجداری کا حاکم بنا دیا جائے، کیونکہ ہزاروں اور لاکھوں مقدمات کی سماعت کے لئے سینکڑوں حکّام کی ضرورت ہوگی۔ گاؤں میں مکھیا کا اثر پٹواری کے مقابلے میں زیادہ تھا۔ اس لئے پٹواری کو زیادہ معتبر شہادت نہ مل سکی، مگر استغاثہ کے گواہ جرح میں ٹوٹ گئے۔ گاؤں کے لوگ شہری وکیلوں کے اینچ پیچ سے کس طرح بچ سکتے تھے۔ استغاثہ کی کمزوری سے مُلزم کے وکیل نے فائدہ اُٹھایا اور پٹواری کو ڈپٹی صاحب نے بری کر دیا۔ پورن کی جیب سے سو روپیہ نکل چکے تھے، گردھاری نے اُسے یقین دلا دیا تھا۔ کہ فیصلہ تمہارے موافق ہوگا۔ گردھاری فیصلہ کی تاریخ کو گاؤں میں ہی رہا پورن نے اُس سے ضلع چلنے کے لئے بہت کچھ کہا، مگر اُس نے بہت سے بہانے بنا دئے۔

پورن نے گاؤں پہنچتے ہی گردھاری کو بلایا۔ گردھاری ہمیشہ مکھیا کا بلاوا پہنچتے ہی فوراً

آجایا کرتا تھا۔ مگر آج وہ بہت دیر سے آیا۔

"پجاری جی! مقدمہ تو اُلٹا ہو گیا، پٹواری کو،"

"ڈپٹی صاحب نے بری کر دیا ————" پورن نے گردھاری کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

"بہت تعجب ہے، ڈپٹی صاحب نے تو پورا وعدہ کیا تھا۔"

"حاکم لوگ بھی کیسے جھوٹے ہیں۔ کہ وعدہ کر کے، پلٹ"

"جاتے ہیں ————" گردھاری نے قدرے جھینپ کر جواب دیا۔

"مہاراج! میں تو لٹ گیا، میرے گھر میں تو ایک دانہ بھی"

"کھانے کو نہیں رہا۔ میری تو ساری پونجی اس مقدمہ میں"

"لگ گئی، آپ ہی کے کہنے سے میں نے پٹواری پر دعوےٰ کرایا تھا"

"اور آپ ہی نے سو روپیہ ڈپٹی صاحب کو دئے تھے، اب"

"آپ ہی ———— ! ————" پورن لجاجت کیساتھ بولا۔

"ٹھاکر جی! تدبیر تو میں نے ہی بتائی تھی، مگر اپنے نفع نقصان کو آپ مجھ سے"

"زیادہ جانتے تھے۔ مقدمہ بازی کوئی کھیل نہیں ہے۔ اس میں تو بڑی"

"بڑی جائدادیں تباہ ہو جاتی ہیں، آپ کے تو سو دو سو روپیہ ہی خرچ ہوئے ہیں"

"میرا خیال ہے کہ پٹواری نے، ڈپٹی صاحب کی مٹھی گرم کر دی ہو گی۔ اُس نے"

"سو سے کچھ اوپر روپے اُن کو دیئے ہوں گے، جب ہی تو ایسا ہوا۔" گردھاری نے جواب دیا۔

"تو مہاراج، پھر ڈپٹی صاحب سے میرے روپے واپس کرا دیجئے چلیئے آج"

"ہی شہر کو چلیئے! جب ڈپٹی صاحب نے ہمارا کام نہیں کیا تو اُن کو ہمارا"

"روپیہ واپس کر دینا چاہیئے ——————— گردھاری کا ہاتھ تھام کر

پُورن بولا

"مکھیا صاحب! آپ کیسی بہکی ہوئی باتیں کرتے ہیں، یہ کچہری دربار کی"

"باتیں ہیں، گاؤں کی بات نہیں ہے۔ ڈپٹی صاحب مجھے اور آپ دونوں کو"

"جیلخانہ بھجوا دینگے، ڈپٹی معمولی حاکم نہیں ہوتا۔ تین سال تک سزا"

"کرنے کا اُسے اختیار ہے۔ ٹھاکر جی! جو ہو گیا وہ ہو گیا۔ اس بات کا"

"منہ سے نکالنا بھی اچھا نہیں۔ ڈپٹی صاحب کے کانوں تک یہ بات اگر پہنچ"

"گئی۔ تو کچھ سے کچھ ہو جائیگا۔ میرا کیا ہے میں تو پجاری کا بیٹا ہوں، کسی مندر میں"

"پہنچ جاؤنگا۔ روٹی کپڑا مل جائیگا مگر آپ کی تو عزت، آبرو کا"

"سوال ہے ——————— گردھاری نے بڑی سنجیدگی کیساتھ

جواب دیا۔

پورن اور گردھاری میں بہت دیر تک "تو تو میں میں" ہوتی رہی، گاؤں کے لوگ جمع ہو گئے، اور تمام گاؤں میں بجلی کی طرح یہ خبر پھیل گئی، ٹھاکر جی کو بھی اس کا حال معلوم ہوا معاملہ تو خیر رفع دفع ہو گیا۔

مگر گاؤں والے گردھاری کی طرف سے بدگمان ہو گئے اور اُس کی سازشوں اور فتنہ پردازیوں کے چہرے سے ایک ایک کر کے نقاب اُٹھنے لگے۔

عورتیں، مندروں میں عام طور پر بہت زیادہ تعداد میں دیویوں کے چرن چھونے اور برکت حاصل کرنے کے لئے جاتی ہیں۔ بات یہ ہے کہ عورتوں کے جذبات مردوں کے جذبات کے مقابلہ میں بہت زیادہ نازک ہوتے ہیں عورتوں کے جذبات کی یہی نزاکت، اُن کو وہم پرست بنا دیتی ہے، کسی عورت کا شوہر بیمار ہو گیا۔ بس اب وہ بے چین ہو گئی، شوہر کی صحت کے لئے وہ بتوں کے سامنے سجدہ بھی کر سکتی ہے اور جوتشیوں اور سیانوں کے دامنوں کو بھی زر و جواہر سے بھر سکتی ہے عورت کی عقل پر اکثر و بیشتر محبت غالب رہتی ہے اور محبت جب اصول سے ٹکراتی ہے۔ تو اصول کو شکست اور محبت کو فتح حاصل ہوتی ہے کتنی عورتیں ہیں جو اولاد کی تمنا میں مندروں اور مقبروں کی چوکھٹوں پر اپنی پیشانیاں رگڑتی پھرتی ہیں۔ بہت سے خانقاہ نشینوں کے گھر ان عورتوں ہی کی وہم پرستی کے بدولت آباد ہیں۔ مردوں کو کانوں کان خبر بھی نہیں ہوتی، اور گھر کی عورتیں مسجدوں کے طاقوں کو گھی کے چراغوں سے بھرواتی ہیں، مزاروں اور مقبروں پر چاندی کے چراغ چڑھاتی ہیں۔ مجاوروں اور سجادہ نشینوں کو گراں قدر نذریں بھیجتی ہیں۔ یہ تو اُن عورتوں کا حال ہے۔ جن کے یہاں غیر اللہ کی پرستش حرام ہے پھر جن کے یہاں مذہبی طور پر بتوں کی پوجا کی جاتی ہو، اُن کے یہاں کی عورتیں جو کچھ بھی کریں تھوڑا ہے۔

سے گنج کے مندر میں بھی عورتیں بہت زیادہ تعداد میں آتی تھیں، گردھاری ایک تو پہلے ہی سے کمینہ فطرت تھا۔ گاؤں والوں کو لوٹ کر وہ اب مالدار ہو گیا تھا۔ اور اُس کی مالداری نے اُس کو اب

بہت زیادہ آزاد اور بے باک بنا دیا تھا۔ مندر میں آنیوالی عورتوں کو وہ چھیڑا کرتا تھا۔ بعض عورتیں تو اپنی شرم کے مارے خاموش ہو جاتی تھیں۔ اور بعض ایک دوسرے سے ذکر کر دیا کرتی تھیں۔ مردوں کے کانوں تک یہ بات نہ پہنچی تھی۔ گردھاری کی ہوسناکی ترقی کر رہی تھی، اور عورتوں کی خاموشی اُس کو بیباک اور جری بنا رہی تھی۔ پہلے تو اس کی چھیڑ چھاڑ باتوں کی حد تک تھی، اب اُس نے ہاتھوں سے چھیڑ چھاڑ شروع کی کسی عورت کا گھونگھٹ اُٹھا دیا، کسی کے رُخسار کو ٹھوکا دیدیا، کسی کے چٹکی لیلی۔ گاؤں میں گردھاری کی ان باتوں کا چرچا ہونے لگا۔ لیکن گاؤں کے لوگ اگرچہ اُس سے بدگمان تھے، مگر وہ اس کو آوارہ نہ سمجھتے تھے، اُن کو یقین تھا کہ دیوی کی سیوا کرنیوالا، اتنا آوارہ نہیں ہوسکتا، عورتوں نے گردھاری کی آوارہ مزاجی اور مردوں کی خاموشی کو دیکھ کر مندر میں آمدورفت کم کر دی،

لوگ کہتے ہیں کہ "حسن شہروں میں ہوتا ہے" میں کہتا ہوں کہ حسن کے لئے کسی خطہ کی قید نہیں ایک ایک قریہ میں حُسن موجود ہے۔ ایک ایک گاؤں حسن کا مرکز ہے، فرق صرف اتنا ہے کہ شہر کے حسن کی نزاکت و آسائش کی آغوش میں پرورش ہوتی ہے، اور گاؤں کا حُسن افلاس و نکبت کی گود میں پلتا ہے۔ اس لئے شہر کا حسن "نازک اور لطیف" اور گاؤں کا حسن "کرخت اور سادہ ہوتا ہے" شہر کی عورتوں کے چہروں کو پاؤڈر اور کریم نرم و نازک بناتے ہیں" اور گاؤں کی عورتوں کے چہروں کو سرسوں کا تیل دھوپ کی شدت کے امتزاج کے ساتھ سخت اور روکھا بناتا ہے شہر کی فضا میں بدصورت عورت بھی نمائش و تکلف کے ساز و سامان کے ساتھ جاذب نظر بننے کے قریب پہنچ جاتی ہے، اور گاؤں میں حسین سے حسین عورت بھی افلاس و نکبت کے ہاتھوں اُس حال کو پہنچ جاتی ہے کہ جس کو دیکھ کر دل محبت کے لئے نہیں تڑپیں

کھانے کے لئے کھچتا ہے۔ مگر پھر بھی نگاہوں نے گاؤں میں حسن و رعنائی کے ایسے مجسموں کو دیکھا ہے کہ شعر و ادب کی تمام رنگینیاں اُن کی "نیم نگاہی" پر بیدریغ قربان کی جاسکتی ہیں۔

جے گنج میں عورتیں زیادہ خوبصورت تو نہ تھیں۔ مگر برہمنوں کے گھرانوں میں البتہ حسن پایا جاتا تھا پوربی برہمن کی لڑکی ساونتی، گاؤں میں سب سے زیادہ حسین تھی اُس کا سن، پندرہ سولہ سال کے لگ بھگ تھا چمپئی رنگ، دلکش ناک نقشہ، موزوں اندام، شباب کا اٹھان اس پر مستزاد! وہ جو کسی نے کہا ہے کہ "خدا جب حسن دیتا ہے نزاکت آہی جاتی ہے" ساونتی اگرچہ جے گنج جیسے کوردیہہ میں پیدا ہوئی تھی، مگر اُس کی چال ڈھال میں ایک خاص سلیقہ پایا جاتا تھا۔ اُس کی مسکراہٹ پر تکلف وتصنع کی اگرچہ پرچھائیں بھی نہ پڑی تھیں۔ مگر دیکھنے والا یہی سمجھتا تھا۔ کہ وہ کسی خاص احساس کے ساتھ مسکرانے کی کوشش کر رہی ہے، ساونتی میں توجہ کو جذب کرنے کی بہت زیادہ قابلیت پائی جاتی تھی۔ مگر گاؤں کی معصوم ذہنیت کو کیا کہئے کہ کوئی اُس کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھتا تھا۔ سب گاؤں والے اُسے اپنی بچی سمجھتے تھے، ایک پھول تھا جو ویرانہ میں کھل رہا تھا۔ ایک آبشار تھا جو کوہستانوں میں جاری تھا، ایک چراغ تھا جو سنسان گھاٹیوں میں جل رہا تھا۔

گردھاری کی ساونتی پر نظر تھی، اور وہ ساونتی کے گھر کا دن میں ایک آدھ مرتبہ چکر بھی لگا آیا کرتا تھا۔ ساونتی کی سنجیدگی کو دیکھ کر گردھاری کی ہمت نہ پڑتی تھی، وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں ساونتی سے اپنے دل کی بات کہنے کی کوشش کرتا تھا، مگر ہوسناکی نگاہوں کے اس نامہ وپیام پر کب قانع ہوتی ہے۔ گردھاری نے آہستہ آہستہ زبان اور ہاتھ سے چھیڑ چھاڑ شروع کی، گردھاری

احتیاط کے ساتھ ایک ایک اِنچ سرک رہا تھا۔

گلابی جاڑے کی رُت تھی، ساونتی کا باپ مندر سے کچھ دُور ہل چلا رہا تھا، ساونتی اپنے باپ کے لئے کھانا لیکر آئی، اور واپسی میں اُس نے سوچا کہ مندر میں دیوی کے درشن بھی کرتی چلوں۔ گردھاری مندر کے بیچ کے دروازے پر بیٹھا ہوا مٹی میں تیل ڈال رہا تھا۔ ساونتی کو تنہا پاکر اُس کا دل باغ باغ ہو گیا۔ چالاک اور عیار گردھاری بدستور اپنی جگہ پر بیٹھا رہا، جب ساونتی مندر میں گھس گئی، تو وہ بھی چپکے سے اندر پہنچا۔ اور اُس نے ساونتی کا ہاتھ پکڑ کر زور سے جھٹکا دیا۔ ساونتی نے زور سے چیخ ماری۔ ساونتی بہت زیادہ نازک تھی، مگر غیرت وحیا نے اُس کے اعصاب کو فولاد سے زیادہ مضبوط بنا دیا تھا۔ گردھاری کی گرفت سے وہ ہر بار نکل جاتی تھی، اُسکی سانس پھول گئی، اور اُس کے چاند سے زیادہ روشن ماتھے پر پسینہ کی ننھی بوندیں نمودار ہو گئیں، اس نے پُوری قوت کے ساتھ چلّانا شروع کیا۔ مندر کے قریب سے کچھ لوگ گذر رہے تھے، چیخنے چلّانے کی آواز سن کر لوگ مندر میں دوڑے ہوئے آئے، انہوں نے آکر دیکھا۔ کہ گردھاری برہمن کی معصوم لڑکی کے شانوں کو پکڑ کر اپنی طرف کھینچ رہا ہے، اور لڑکی اُس کی گرفت سے نکلنے کے لئے زور لگا رہی ہے۔ آدمیوں نے گردھاری کو جھٹکا دے کر، ساونتی کو اُس کی گرفت سے چھڑا دیا۔

آدمیوں کو دیکھ کر گردھاری گھبرا گیا۔ اُس نے پشیمانی اور گھبراہٹ کے ساتھ کہنا شروع کیا:۔

”اس لڑکی نے دیوی جی کی توہین کی ہے، یہ لڑکی“

”بڑی مورکھ ہے۔ میں اس کو ضرور سزا دونگا“

"دیوی کی توہین ہیں گوارا نہیں کر سکتا"

اتنے میں گاؤں کے اور لوگ بھی مندر میں آگئے، اور یہ خبر بجلی کی طرح سارے گاؤں میں پھیل گئی کہ سادتی پر مندر کے پجاری نے بری نیت سے ہاتھ ڈالا ہے۔ گاؤں کے لوگ جاہل ہوتے ہیں۔ اور جہالت اور غیرت کا چولی دامن کا ساتھ ہے، یہ علم و تہذیب کی مصلحت اندیشیاں ہیں جو غیرت کے آتشکدہ کو ٹھنڈا کرتی رہتی ہیں۔ اس خبر کو سن کر گاؤں والوں کی غیرت جوش میں آگئی، اور گردھاری پر اتنی مار پڑی کہ اُسے چھٹی کا دودھ یاد آگیا۔ گاؤں کا شاید ہی کوئی شخص ہوگا جس نے گردھاری کے ایک آدھ تھپڑ اور لات رسید نہ کی ہو، وہ تو گردھاری جیسا سخت جان انسان تھا جو بچ گیا، ورنہ کوئی دوسرا ہوتا تو مر جاتا۔

گاؤں والے عدالت اور تھانہ میں جاتے ہوئے بہت ڈرتے ہیں شہر میں ایسا واقع اگر ہو جاتا، تو ذرا سی دیر میں ہتھکڑیاں پڑ جاتیں، گاؤں کے لوگوں نے گردھاری کو مار پیٹ کر چھوڑ دیا، گردھاری کے لئے اب گاؤں میں رہنا کسی طرح مناسب نہ تھا جے گنج اُس کی چراگاہ تھی، اور اس چراگاہ کا ایک ایک تنکا اُس کا دشمن بن گیا تھا، گاؤں والوں کے لات گھونسوں نے اُس کے جسم کو چور چور کر دیا تھا۔ اور اب وہ کسی قیمت پر اُن لوگوں میں رہنے کے لئے تیار نہ تھا، گردھاری رات کو اپنی جمع پونجی لیکر گاؤں سے بھاگ گیا، دوسرے دن لوگوں کو اُس کے غائب ہو جانے کا حال معلوم ہوا تو سب کو خوشی ہوئی۔ کہ ایک مجسم فتنہ سے نجات مل گئی۔

اس واقعہ کے بعد گردھاری کی فتنہ پردازیاں لوگوں پر ظاہر ہوئیں۔ گاؤں کی چوپالوں اور

بیٹھکوں میں اُس پجاری کی عیاریوں اور فتنہ پردازیوں کا ذکر رہتا۔ پٹواری اور پورن مکھیا کو اسی گردھاری نے ایک دوسرے کا دشمن بنایا تھا، جب تمام واقعات روشن ہو گئے تو پٹواری اور مکھیا ایک دوسرے سے گلے ملے، اور آن کی آن میں ٹوٹی ہوئی دوستی جڑ گئی گلے ملتے وقت پورن مکھیا نے پٹواری سے کہا۔

" دیوان جی! مجھے مُعاف کر دیجئے۔ یہ جو کچھ ہوا، اس بدمعاش گردھاری کے "

" سبب سے ہوا، اُس نے ہی مجھے آپ کے خلاف اُکسایا۔ مجھے تو اس نے تباہ کر دیا۔

" میری ساری جمع پونجی مقدمہ بازی میں لگ گئی مجھے اور آپ کو ایک گاؤں میں "

" رہنا ہے، میں اور آپ مل کر نہ رہیں گے تو زندگی دوبھر ہو جائیگی، "

پٹواری نے بڑی لجاجت کے ساتھ جواب دیا۔

" ٹھاکر جی! آپ کہتے ہیں تو میں معاف کئے دیتا ہوں، مگر آپ نے کوئی قصور "

" تھوڑی کیا ہے، جس کی آپ معافی چاہتے ہیں، یہ تو اُس پجاری کی "

" آگ لگائی ہوئی ہے۔ ایشور نے اچھا کیا کہ بہت جلد بھانڈا "

" پھوٹ گیا، نہیں تو وہ سارے گاؤں میں لڑائی کرا کے چھوڑتا۔ "

" اس کے بعد گاؤں میں پنچایت ہوئی، اور اُس میں پورن مکھیا نے کہا۔

" بھائیو! گردھاری کو شہر کی ہوا لگ گئی تھی جس نے اُسے "

" دھوکہ باز اور فریبی بنا دیا تھا، ہمارے گاؤں میں کوئی کسی کی بہو "

" بیٹی پر بُری نگاہ نہیں ڈالتا۔ یہ شہر کی صحبت کا اثر تھا، کہ گردھاری نے "

" (ارے رام رام) دیوی جی کے سامنے بُری نیّت سے برہمن کی"
چھوری پر ہاتھ ڈالا، بھائیو! اگر دھوکے اور فریب سے دور"
" رہنا چاہتے ہو۔ تو شہر کی ہوا سے بچو، ہمیں اپنی عزّت آبرو"
" اپنی جان سے زیادہ پیاری ہے، ہم مرجائیں گے مگر اپنی آبرو پر"
" آنچ نہ آنے دینگے، ہم اپنی گاؤں کی دُنیا کو شہر کی دُنیا سے"
" الگ تھلگ رکھنا چاہتے ہیں!"
گاؤں کے لوگوں نے ٹھاکر جی کی خوب تعریف کی اور پنچایت ختم ہوگئی،

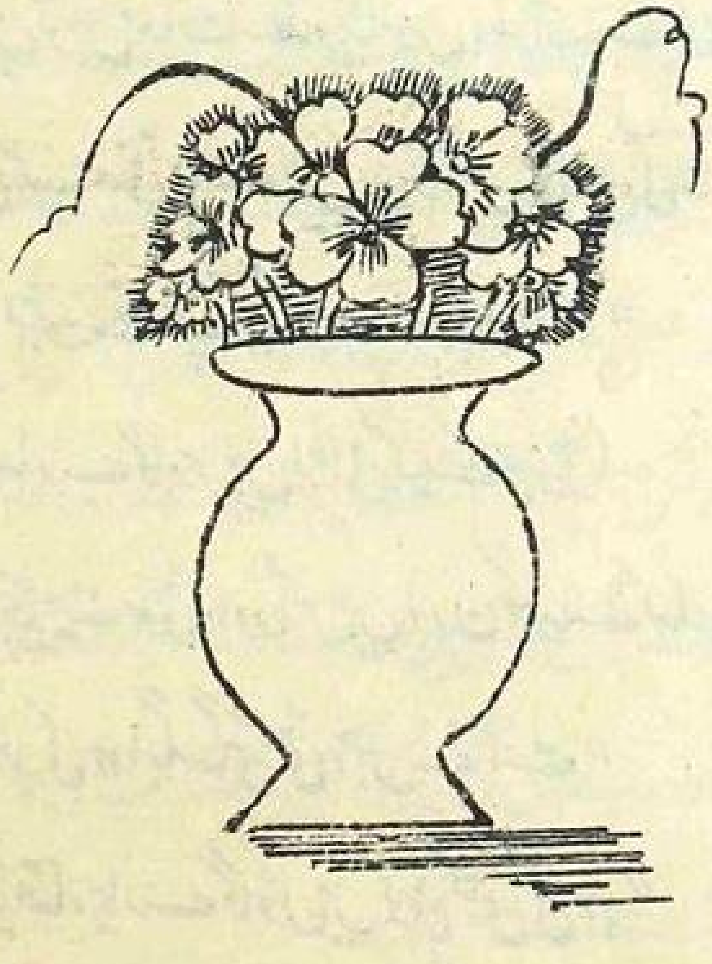

خوش مزاج افتخار

زندہ دلی، نصف زندگی ہے، بلکہ پوری زندگی!

مگر آہ

گذر رہی ہے کچھ اس ڈھب سے زندگی ماہر
کہ جیسے میری ضرورت نہیں زمانے کو

خوش مزاج افتخار

افتخار بچپن ہی سے شوخ اور ھنسوڑ تھا، اسکول میں اسکی خوش مزاجی ضرب المثل بن گئی تھی۔ اسی خوش طبعی نے اُس کو ہردلعزیز بنا دیا تھا، افتخار کو اسکول کی ہر تقریب میں شریک کیا جاتا۔ اور اُس کی خوش مزاجی ہر بزم کو تبسم اور قہقہہ کی انجمن بنا دیتی۔ وہ خود ہنستا، دوسروں کو ہنساتا، یہاں تک کہ محفل برخاست ہو جاتی اور لوگ ہنستے ہوئے اپنے گھروں کو واپس ہوتے اسکول کے ماسٹر افتخار کو پسند تو کرتے تھے مگر اس سے گھبراتے بھی تھے، کیونکہ افتخار کی خوش طبعی بعض اوقات اسکول کے "ڈسپلن" کو صدمہ پہنچاتی تھی اور ماسٹروں کے وقار میں فرق آتا تھا۔ ہنستے چہرے سب کو بھلے معلوم ہوتے ہیں۔ مگر استاد کے عتاب کے وقت، طالب علموں کے چہروں پر ہنسی کی نمود یقیناً استاد کے لئے کوفت اور اذیت کا باعث ہوتی ہے، رونے اور ہنسنے کا ایک محل ہوتا ہے لیکن اسکول کے لڑکے رونے اور ہنسنے کے محل و موقع سے کہاں واقف ہوتے ہیں کسی لڑکے کو سزا دی جاتی اور افتخار کوئی ایسی بات کہ دیتا۔ کہ لڑکے مسکرا دیتے۔ افتخار کی ان باتوں سے اسکول کے ماسٹر بہت گھبراتے تھے۔

افتخار جس اسکول میں پڑھتا تھا، وہ امدادی اسکول تھا، حکومت کی طرف سے سالانہ امداد ملتی تھی اسکول کی عمارت کیلئے بھی محکمہ تعلیمات نے کافی روپیہ دیا تھا۔ اسکول کے انتظام کے لیے ایک کمیٹی مقرر تھی جس کا صدر ایک ساہوکار تھا۔ یہ ساہوکار کچھ زیادہ لکھا پڑھا نہ تھا، اُسکی دولت نے اُسے ایک تعلیمی ادارہ کی کمیٹی کا صدر بنا دیا تھا۔ اسکول کا ہیڈ ماسٹر ڈگریوں کے اعتبار تو قابل اور لائق کہا جا سکتا تھا، مگر اُس میں حکومت کرنیکا بے پناہ جذبہ موجود تھا۔ وہ اسکول کے ماسٹروں کو اپنا ذلیل ماتحت بنا کر رکھنا چاہتا تھا۔ چھوٹی تنخواہ کے استاد، ہیڈ ماسٹر کے گھر کا کام کاج کرتے تھے، کسی کے ذمہ ہیڈ ماسٹر صاحب کے گھر کی جنس کا لانا تھا۔ کوئی ہیڈ ماسٹر کے مہمانوں کی آؤ بھگت کے فرائض انجام دیتا۔ کوئی اُن کے بچوں کے لیے دوا دارو لاتا۔ غریب اُستاد یہ تمام کام بادل ناخواستہ کرتے تھے، مگر روٹی کا سوال بڑا ٹیڑھا ہے۔ اگر وہ ہیڈ ماسٹر کے حکم سے سرتابی کرتے تو اُن کو ملازمت سے علیحدہ ہونا پڑتا۔ ایک معمولی سے شہر میں بیس پچیس روپیہ کی نوکری مڈل اور نارمل کے امتحان میں کامیاب افراد کو مل ہی کہاں سکتی تھی؟ وہ لوگ پیٹ کی خاطر تمام ذلتیں برداشت کرتے تھے۔ اور ایک عرصہ کی مشق کے بعد تو ذلت و عزت کا اُنہیں احساس بھی نہ رہا تھا۔ انہوں نے اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ طلباء کی تعلیم کے ساتھ ساتھ ہیڈ ماسٹر صاحب کی خدمت بھی اُن کے فرائض میں داخل ہے۔

چھوٹی تنخواہ کے مدرس تو ہیڈ ماسٹر کی جابرانہ حکومت کو برداشت کر لیتے تھے، مگر وہ استاد جو ڈگریوں کے اعتبار سے، ہیڈ ماسٹر کے ہم پلہ تھے، اور جن کی دُنیا صرف اس ایک اسکول ہی تک محدود نہ تھی، ہیڈ ماسٹر صاحب کے جابرانہ احکام کی پرواہ نہ کرتے تھے اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ بہت جلد جلد مدرسین بدلے جاتے اسکول کی کمیٹی کا صدر تو ہیڈ ماسٹر کی مٹھی میں تھا۔ ہیڈ ماسٹر جو چاہتا کمیٹی سے

کرواکر چھوڑنا۔ ہیڈ ماسٹر کے اسی طرزِ عمل کے بدولت بہت سے قابل، لائق اور ہمدرد استادوں کو اسکول سے علیحدہ ہونا پڑا۔ ہیڈ ماسٹر اسکول کا مطلق العنان آمر بنا ہوا تھا۔ وہ اسکول کی حکومت کا مسولینی اور ہٹلر تھا۔ بلکہ ان سے بھی بڑھکر۔! استادوں کی ردوبدل سے اسکول کا تعلیمی نظام بہت ہی ابتر حالت میں تھا۔

ہیڈ ماسٹر نے ایک طرف تو کمیٹی کو ملا لیا تھا، اور دوسری طرف ضلع کے اعلےٰ عہدیداروں اور تعلیمات کے افسروں کی اس قدر آؤ بھگت کرتا کہ سب لوگ اس کی تعریفوں کے گیت گاتے ہوئے اسکول سے رخصت ہوتے۔ جہاں کسی عہدیدار کے اسکول میں آنیکی اطلاع آئی، ہیڈ ماسٹر انتظامات کے لئے بے چین ہو جاتا۔ عمارت کی صفائی ہوتی، اسکول میں جھنڈیاں لگائی جاتیں، سڑک پر چھڑکاؤ کرایا جاتا، لڑکوں کو ایک ہی قسم کی وردی پہننے کی ہدایت ہوتی، عہدیدار کی شان میں قصیدے پڑھے جاتے، حکومت کے افسروں کے لئے اس سے زیادہ اور کیا چاہیئے! عہدیداروں کی نگاہیں تو عام طور پر ان ہی بوقلمونیوں میں اُلجھ کر رہ جاتی ہیں، انہوں نے دیکھا کہ عمارت پر رنگ و روغن چڑھا ہوا ہے، خوشنما جھنڈیاں لگی ہوئی ہیں لڑکے صاف ستھرے کپڑے پہنے ہوئے ہیں، اسکول کے اُستاد اور خصوصاً صدر استاد، نہایت ادب کیساتھ اُنکا استقبال کر رہے ہیں، اسکول کی جانب سے اُنکی خدمات میں ایڈریس پیش کئے جا رہے ہیں طلباء جھوم جھوم کر قصیدے گا رہے ہیں، چپراسیوں کی وردیاں بہت صاف ستھری ہیں، ہیڈ ماسٹر کا کمرہ سجا ہوا ہے۔ اُس کی میز پر ہر چیز قرینہ سے رکھی ہوئی ہے۔ اسکول کے کمروں میں نقشے لٹکے ہوئے ہیں، بس عہدیداروں نے صفحے کے صفحے اسکول کی تعریف میں لکھ ڈالے۔ ان ہی تعریفی معائنوں کو، اخباروں میں شائع کرایا

گیا۔ وہ عہدیدار جن کو ہزار ہزار، دو دو ہزار تنخواہ ملتی ہے۔ اُن کی ہر بات کا پبلک احترام کرتی ہے، جب یہ معلینے اخباروں میں شائع ہوتے ہیں تو لوگوں کو اسکولوں کی انتظامی اور تعلیمی حالت کی طرف سے اطمینان ہو جاتا ہے، کیونکہ عہدیدار صاحبان، دو ایک کلاسوں میں ایک آدھ سوال لڑکوں سے پوچھنے کے بعد، ارشاد فرماتے ہیں:۔

"اسکول کی تعلیمی حالت نہایت درجہ اطمینان بخش ہے، اساتذہ نے"

"طلباء میں علم و عمل کی روح پھونک دی ہے، طریقِ تعلیم بہت ہی"

"پسندیدہ نفسیاتی اور قابلِ اطمینان ہے۔"

افتخار جس اسکول میں پڑھتا تھا، اُس کی تعریف میں بھی ہیڈ ماسٹر نے بیسیوں تحریفی معلینے عہدیداروں سے لکھوالئے تھے۔ ہیڈ ماسٹر کو ان معائنوں پر اتنا گھمنڈ تھا۔ کہ جہاں کمیٹی کے کسی رُکن نے اسکول کے انتظام پر نکتہ چینی کی، اور ہیڈ ماسٹر نے معائنہ کی کتاب کھول کر کمیٹی کے ارکان کے سامنے رکھ دی۔ معائنہ کی کتاب میں کلکٹر، کمشنر، جیسے افسروں کے قلم سے یہ جملے لکھے ہوئے تھے:۔

"اس اسکول کی انتظامی حالت بہت اچھی ہے۔"

"ہیڈ ماسٹر کو ہم اُن کے حسنِ انتظام پر مبارک باد دیتے ہیں"

ان "الہامی جملوں" کو پڑھنے کے بعد اسکول کی کمیٹی کے رکن کی کیا مجال تھی، کہ وہ ایک حرف بھی زبان سے نکالتا۔ کلکٹر اور کمشنر جس اسکول کے انتظام کی تعریف کر رہے ہوں، اُس پر اسکول کی کمیٹی کے رُکن کو تنقید کرنے کا حق ہی کیا ہے؟ یہ دوسری بات ہے کہ کلکٹر اور کمشنر نے صرف ایک گھنٹہ

اسکول میں رہکر یہ رائے قائم کی ہے۔ اور اسکول کی کمیٹی کے رکن کی سالہا سال سے اسکول کے انتظامات پر نظر ہے۔ مگر یہ بڑی بڑی تنخواہیں پانیوالے عہدیدار، ایک منٹ میں دیکھ کر جس حقیقت کو معلوم کر لیتے ہیں، یہ میونسپلٹیوں اور اسکولوں کے ارکان سو برس کے تجربہ کے بعد بھی اُس حقیقت کی تہ کو نہیں پہنچ سکتے!

جس اسکول کا ہم ذکر کر رہے ہیں، اُس کے ہیڈ ماسٹر کو کلکٹر کی آمد کی اطلاع وصول ہوئی، اس اطلاع کے ملتے ہی ہیڈ ماسٹر نے انتظامات شروع کر دئے۔ اسکول کی عمارت کی صفائی ہونے لگی جھنڈیاں بنائی جانے لگیں، روزانہ حکم پر حکم جاری ہونے لگے، استادوں کے ذمہ بہت سے فرائض سپرد کئے گئے اختر حسین اس اسکول میں ریاضی کے استاد تھے۔ اختر حسین کو ہیڈ ماسٹر کے جابرانہ احکام کی مطلق پرواہ نہ تھی، وہ ٹھیک وقت پر مدرسہ آتے اور مدرسہ کا وقت ختم ہوتے ہی گھر چلے جاتے۔ ہیڈ ماسٹر کی درباداری کو اُن کی شرافت کسی طرح گوارا نہ کر سکتی تھی۔ وہ ہیڈ ماسٹر کے غلام نہیں تھے، اسکول کے ملازم تھے، اور اسکول کے ملازم کا سب سے اہم فریضہ لڑکوں کی تعلیم و تربیت ہے۔ اختر حسین طلباء کو محنت کے ساتھ پڑھاتے، اُن کی تعلیم صرف اسکول کی چاردیواری تک محدود نہ تھی، جہاں تک اُن سے ہو سکتا اسکول کے باہر بھی طلباء کے کردار پر وہ نظر رکھتے۔ اختر حسین قدرے سخت گیر تھے۔ لیکن طلباء کو اُن سے محبت تھی طلباء کو جب اس بات کا یقین ہو جاتا ہے کہ اُستاد سختیاں اُن کی بھلائی کے لئے کر رہا ہے اور وہ اُن کا بہی خواہ ہے تو طلباء استاد کے بندۂ بےدام ہو جاتے ہیں۔ ریاضی بہت ہی خشک مضمون ہے، لیکن اختر حسین کا طرز تعلیم اتنا دلکش اور دلچسپ تھا کہ طلباء کو اس مضمون سے ایک گونہ دلچسپی ہو گئی تھی۔ وہ باتوں باتوں میں ریاضی کے گُر بتا دیتے، اُن کی جماعت کے طلباء عام طور پر محنتی اور شوقین پائے گئے۔

کلکٹر کے آنے میں کوئی دو تین دن باقی رہ گئے تھے، ہیڈ ماسٹر نے اختر حسین کو چپراسی کے ذریعہ بُلایا۔ اختر حسین نے چپراسی سے کہا۔

" میں نے طلباء کو ریاضی کا ایک نیا قاعدہ بتانا شروع کیا ہے"

" اس کو ختم کرنیکے بعد آؤں گا۔ "

چپراسی نے لفظ بلفظ ہیڈ ماسٹر سے کہہ دیا۔ ہیڈ ماسٹر تاؤ کھا کر رہ گیا۔ وہ ایسے جوابات سننے کا عادی نہ تھا۔ اُس کے کانوں نے تو " آمنا، وصدقنا " کے سوا کچھ سُنا ہی نہ تھا۔ گھنٹہ ختم ہونے کے بعد اختر حسین، ہیڈماسٹر کے کمرے میں آئے۔

" کلکٹر صاحب بہادر ۲۰ تاریخ کو آرہے ہیں "

" اور اب صرف تین دن باقی رہ گئے ہیں، ہم کوان ہی "

" تین دن میں سب کچھ کرنا ہے ———— " ہیڈماسٹر نے اختر حسین کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا،

" جی ہاں! شاید بیس ہی کو آرہے ہیں، " اختر حسین نے بے پروائی کے ساتھ جواب دیا۔

" ماسٹر صاحب! میں نے اساتذہ صاحبان پر مختلف "

" کاموں کو بانٹ دیا ہے۔ آپ کے ذمہ صرف اتنا کام ہے "

" کہ آپ دروازے پر طلبا کو لیکر کھڑے رہیں، جب کلکٹر صاحب "

" کی موٹر دروازے سے گذرے، تو آپ طلباء کو اشارہ کریں۔ "

"طلباء اپنی جھولیوں کے پھول کلکٹر صاحب کی موٹر پر"

"برسادیں گے۔"

"دیکھئے! کلکٹر صاحب بہادر بالکل تازہ ولایت ہیں۔ کوئی ایسی بات نہ ہو جائے"

"جو اسکول کی بدنامی کا باعث ہو۔ مدرسہ کے بچے بڑے چنچل اور شوخ ہوتے ہیں"

"آپ کو نظم قایم رکھنا ہوگا۔ پھول اس ترتیب کیساتھ برسنے چاہئیں"

"کہ صاحب کو پھولوں کی بارش ناگوار نہ ہو ـــــ" ہیڈ ماسٹر نے جاذب کو چھوتے ہوئے کہا۔

"میں تو اس اہم ذمہ داری کو اپنے سر لینے سے قاصر ہوں۔"

(اختر حسین نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے جواب دیا)

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ آپ اسکول کے ملازم ہیں! اسکول کے کاموں"

"میں حصہ لینا آپ کا فرض ہے۔ ـــــــــــــــــ" ہیڈ ماسٹر نے جھنجلا کر کہا۔

"کلکٹروں اور کمشنروں کا استقبال میرے فرائض میں داخل نہیں ہے۔"

(اختر حسین نے ٹوپی کے پھندنے کو جنبش دیتے ہوئے جواب دیا۔

"ماسٹر صاحب! آپ کے فرائض میں ہر وہ کام جس کا تعلق اسکول سے ہو، داخل"

"ہے۔ پھر کلکٹر صاحب کا استقبال کرنا تو ہماری عین عزت ہے! کلکٹر ضلع کا بادشاہ"

"ہوتا ہے، یہ تو صاحب بہادر کی مہربانی ہے۔ جو ہمارے اسکول میں تشریف لانے کی زحمت گوارا"

" فرمارہے ہیں، اُن کی راہ میں تو ضلع کے بڑے بڑے رُوساء اپنی آنکھیں بچھاتے ہیں"۔

" اسکول کے دروازے پر سب سے پہلے کلکٹر صاحب کی نظر آپ ہی پر پڑے گی، میں نے اسی لئے تو "

" آپ کو دروازہ پر مقرر کیا ہے ــــــــــــ ہیڈ ماسٹر قدرے مسکراہٹ

کے ساتھ بولا۔

" ہیڈ ماسٹر صاحب! مجھے افسوس کے ساتھ عرض کرنا پڑتا ہے کہ آپ نے استاد کے مرتبہ کو"

" نہیں سمجھا۔ میں جب کہنے پر آیا ہوں تو لگی لپٹی نہ رکھوں گا، سچ تو یہ ہے"

" کہ آپ جیسے لوگوں نے استادوں کی عظمت کو نقصان پہنچایا ہے"۔

" غور تو فرمایئے کہ جب اسکول کے اساتذہ کلکٹر کے پیچھے ہاتھ باندھے ہوئے چلتے ہونگے"

" اُس وقت طلباء پر اساتذہ کی شخصیت کا کتنا بُرا اثر پڑے گا ہمیں تو قول و فعل"

" سے بچوں میں خودداری کا احساس پیدا کرنا ہے، ہمارا تو یہ کام ہے کہ "

" طلباء کو اس قدر بلند فطرت بنادیں کہ کسی بڑی سے بڑی شخصیت کے سامنے بھی"

" اُن کی نگاہ نہ جھپک سکے۔ میں کلکٹر کے استقبال میں اپنے لئے"

" کوئی عزت محسوس نہیں کرتا۔ اور میں تو سرے سے استقبال کے اس تزک و احتشام ہی"

" کے خلاف ہوں، جتنا روپیہ آپ کلکٹر کے استقبال میں صرف کر رہے ہیں، اتنے روپیہ"

" میں کئی غریب طالب علموں کو وظیفہ دیا جا سکتا تھا۔

" آپ ہی کے بقول کلکٹر تازہ ولایت ہے، اس نے انگلستان کے اسکولوں کے مناظر اپنی

آنکھوں سے"

"دیکھتے ہیں، آپ کے اسکول میں جب وہ آ کر دیکھے گا۔ کہ اسکول کی تمام عظمت اُس کے"

"قدموں پر جھکی جا رہی ہے، تو ہندوستان کی پست ذہنیت کا اس پر کتنا برا اثر پڑیگا"

"جس ملک کی تعلیم بھی آزادانہ ہو، اُس ملک کی بدنصیبی پر جتنا بھی ماتم کیا جائے کم ہے"۔

"تازہ ولایت انگریزوں کو غلامی اور نیاز مندی کے یہی مظاہرے تو"

"متکبر اور فرعون بنا دیتے ہیں۔ ——————— اختر حسین نے جواب دیا۔

ہیڈ ماسٹر کا چہرہ غصے کے مارے تمتما اُٹھا، اختر حسین کے تیور دیکھ کر اُس نے ایک لفظ بھی نہ کہا۔ اُس نے گھنٹی بجائی، چپراسی دوڑتا ہوا آیا، ہیڈ ماسٹر نے ماسٹروں کی طلبی کیلئے چپراسی کو حکم دیا۔ اختر حسین نے دیکھا کہ ہیڈ ماسٹر منہ پھیلائے خاموش بیٹھا ہے۔ اس لئے وہ ہیڈ ماسٹر کے کمرے سے اُٹھ کر چلے گئے۔

تاریخ مقررہ پر کلکٹر آیا، اور اُس کا پرجوش خیر مقدم کیا گیا۔ شام کو اسکول کے بڑے کمرے میں تقسیم انعامات کا جلسہ منعقد ہوا۔ کلکٹر کے لئے اونچے اونچے تختوں پر کرسیاں بچھائی گئی تھیں، نہایت پرتکلف قالین کا فرش تھا۔ کلکٹر صاحب کی نشست کے پیچھے ہال کی دیوار تھی۔ دائیں بائیں اور سامنے اُستاد، طلبا، اسکول کی کمیٹی کے ارکان اور شہر کے عمائد بیٹھے ہوئے تھے۔ کلکٹر نے بہت ہی مختصر تقریر کی، جس کا بہت زیادہ حصہ ہیڈ ماسٹر کی تعریف پر مشتمل تھا۔ کلکٹر جب تقریر کر کے بیٹھا، تو حاضرین نے پوری قوت کے ساتھ تالیاں بجائیں، مجمع بہت سنجیدہ تھا جس طرح موسم بہار کے آتے ہی دیوانوں کی دیوانگی بڑھ جاتی ہے اور شعرا کے بقول جیب و دامن کی دھجیاں اڑا دینے کو دل چاہتا ہے۔ بالکل اسی طرح خوش طبع

اور ہنسوڑ انسان کی فطرت، سنجیدگی کو دیکھ کر، بے چین ہو جاتی ہے، خوش طبع اور مزاح پسند انسان خشک سنجیدگی کو برداشت ہی نہیں کر سکتا۔ افتخار کے دل میں بھی مزاح کی ایک لہر پیدا ہوئی، کلکٹر بہادر ڈائس پر تشریف فرما تھے، تمام حاضرین اس طرح مؤدب بیٹھے ہوئے تھے، گویا کہ یہ لوگ کچھ دیر میں سجدہ کے لئے جھکنے والے ہیں۔ اس ماحول میں مزاح کا کوئی عنوان اُس کی سمجھ میں نہ آتا تھا۔ وہ تھوڑی دیر تک دماغ پر زور ڈالتا رہا۔ اُس کے بعد وہ مسکرایا، اُسکی مسکراہٹ بتا رہی تھی، کہ عنقریب کوئی گل کھلنے والا ہے افتخار کے قریب ہی ہیڈ ماسٹر کا کمسن بچہ زرق برق کپڑے پہنے بیٹھا تھا، ہیڈ ماسٹر کے یہاں تو آج عید تھی اُن کا سارا خاندان کلکٹر کے استقبال کا شرف حاصل کر رہا تھا۔ وہ تو ہیڈ ماسٹر کا بس نہ چلتا تھا۔ ورنہ اپنی بیوی اور لڑکی کو بھی صاحب بہادر کے استقبال کی عزت دلا کر چھوڑتا۔ افتخار نے چپکے سے ہیڈ ماسٹر کے بچے کے چٹکی لی، بچہ اُوں نہہ کر کے رہ گیا، سینکڑوں نگاہوں سے بچتے ہوئے چٹکی لینا کوئی معمولی کام نہ تھا افتخار کا ہاتھ ذرا ڈھیلا پڑ گیا۔ اِس لئے اُس کی چٹکی کارگر نہ ہوئی۔ تھوڑی دیر بعد اُس نے بچہ کی ران میں اس زور سے نوچا کہ غریب تلملا کر رونے لگا۔ بچہ کا رونا تھا۔ کہ تمام جلسہ میں گڑبڑ مچ گئی، بہت سے لوگ مُنہ پر انگلی رکھ کر، بچہ کو خاموش ہو جانے کے لئے اشارے کرنے لگے، مگر بچہ نے جو غیل مچانے شروع کئے ہیں، تو سارے جلسہ کو سر پر اُٹھا لیا۔ ہیڈ ماسٹر کا خوف سے یہ حال کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں،

"یہ کس کا بچہ ہے؟ ایسے چھوٹے بچوں کو جلسوں میں لانا نہ چاہیئے" کلکٹر نے ہیڈ ماسٹر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

" جناب! ہاں ..... غلطی ہوگئی ..... نہ معلوم یہ کس کا "

" بچہ یہاں چلا آیا ہے ————" ہیڈ ماسٹر نے گھبرا کر جواب دیا۔

افتخار تو اپنے مزاح کو طویل اور دلچسپ بنانا چاہتا تھا، وہ جرأت کر کے ڈائس کے قریب بڑھا اور ہیڈ ماسٹر سے جو ڈائس کے قریب کھڑے ہوئے تھے۔ بولا:۔

" ہیڈ ماسٹر صاحب! یہ آپ ہی کا بچہ ہے، آپ کو غلط فہمی"

" ہو رہی ہے۔

اس پر ہیڈ ماسٹر اس قدر شرمندہ ہوا کہ اُس کی نگاہیں زمین میں گڑھی جاتی تھیں، کلکٹر بھی ہیڈ ماسٹر کی گھبراہٹ پر مسکرا دیا۔ تھوڑی دیر بعد جلسہ برخاست ہو گیا۔ اور کلکٹر صاحب بہادر قیمتی ہاروں کو زیب گلو کئے ہوئے رخصت ہو گئے۔

ہیڈ ماسٹر نے اپنے کمرے میں پہنچکر فوراً افتخار کو طلب کیا۔ افتخار قدرے گھبرایا ہوا آیا۔

" تم کو میری غلط فہمی رفع کرنیکی آخر کیا ضرورت"

" تھی؟" ———— ہیڈ ماسٹر نے کاغذ پہ لکیریں کرتے ہوئے کہا،

" ہیڈ ماسٹر صاحب! آپ نے کلکٹر صاحب سے فرمایا تھا۔ نہ معلوم کس کا "

" بچہ یہاں چلا آیا ہے۔" یہ الفاظ مجھے بُرے معلوم ہوئے، اور "

" مجھ سے نہ رہا گیا" میں تو صرف لفظ "کس" کی اصلاح "

" چاہتا تھا ــــــــــــــــــــ " افتخار نے سنجیدہ ہو کر جواب دیا۔

ہیڈ ماسٹر کھلا گئے تھے، افتخار کو چھوڑ کر وہ چپراسی پر بگڑنے لگے کہ تو بچہ کو یہاں کیوں لایا

چپراسی نے جواب دیا:۔

" حضور! میں نے تو بہو جی صاحبہ ہیڈ ماسٹر صاحب کی بیوی سے "

" کہا تھا کہ اتنے چھوٹے بچہ کا جلسہ میں جانا ٹھیک نہیں ہے، کہیں "

" بابو مچل گئے تو سنبھالنا مشکل ہو جائیگا۔ مگر بہو جی صاحبہ نے کہا۔"

" کہ تمہارے ماسٹر صاحب تاکید کر گئے ہیں کہ بابو کو ضرور بھیجنا۔ اسی "

" جلسہ کے لئے ہی تو ہیڈ ماسٹر صاحب نے بابو کے واسطے کپڑے تیار کرائے ہیں "

اس کے بعد ہیڈ ماسٹر نے اپنے بچہ کو کمرے میں لانے کے لئے کہا، چپراسی بچہ کو آن کی آن میں جا کر لے آیا۔

" بابو تو کیوں رو رہا تھا ــــــــــــــــــــ " ہیڈ ماسٹر نے کرخت لہجہ میں دریافت کیا،

لڑکے نے افتخار کی طرف دیکھنا شروع کیا۔ اُس کے ہونٹ پورے طور پر ہلنے بھی نہ پائے تھے۔ کہ افتخار بچہ کو مخاطب کر کے بولا:۔

" بابو! تم کو پیاس لگی تھی، اور ہاں! تم کہہ رہے تھے کہ "

" مجھے بابو جی کے پاس پہونچا دو، اور ہاں! بابو تم کو پسینہ بھی آ رہا "

"نھا۔"

افتخار نے کچھ اس انداز میں سے گفتگو کی کہ بچہ نے ہر لفظ پر "ہاں" کہی، ہیڈ ماسٹر نے بچہ کو عتاب کی نظروں سے دیکھا اور لہو کا سا گھونٹ پی کر رہ گیا۔

کلکٹر کی آمد کی خوشی میں اسکول کو ایک دن کی تعطیل دی گئی، ماسٹر اختر حسین کی طرف سے ہیڈ ماسٹر کے دل میں گرہ پڑ گئی تھی، وہ اپنے دل میں ماسٹر اختر حسین کے علیحدہ کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا چھٹی کے دن، ہیڈ ماسٹر نے کمیٹی کے صدر کو اپنے یہاں چائے پر مدعو کیا، سیٹھ صاحب اپنے تین چار عدد بچوں کے ساتھ ہیڈ ماسٹر کے یہاں آئے، چائے پینے کے بعد ادھر ادھر کی باتیں ہونے لگیں سیٹھ صاحب کے بچے ماسٹر کے بچوں کے ساتھ کھیلنے لگے۔

"کلکٹر صاحب کا استقبال تو اچھا رہا مگر خدا کا"

"ہزار ہزار شکر ہے کہ پہلے سے ایک بات کا"

"انکشاف ہو گیا، نہیں تو نہ معلوم کیا سے کیا ہو جاتا"

(ہیڈ ماسٹر بناوٹی گھبراہٹ کے ساتھ بولا)

"کس بات کا انکشاف ہو گیا؟ ہیڈ ماسٹر صاحب"

"آپ نے مجھے اچنبھے میں ڈال دیا۔ ذرا تفصیل"

"کے ساتھ بیان کیجئے"

(سیٹھ صاحب نے، اپنی پگڑی کے پیچ کو سنبھالتے ہوئے جواب دیا۔)

" یہ جو ہمارے اسکول ہیں ریاضی کے استاد اختر حسین"

" ہیں، ان کے خیالات انقلابی معلوم ہوتے ہیں،"

" تمام ماسٹروں نے کلکٹر صاحب بہادر کے استقبال ہیں"

" گرمجوشی کے ساتھ حصہ لیا، مگر ماسٹر اختر حسین نے صاف"

" انکار کر دیا۔ وہ کہتے تھے۔ کہ کلکٹر کا استقبال میرے لئے"

" باعثِ مسرت نہیں ہوسکتا، یہ جو کچھ انتظامات اسکول کی"

" طرف سے کئے جا رہے ہیں، قابلِ اعتراض ہیں، ماسٹر صاحب"

" نے چند لڑکوں کو بھی ورغلایا تھا، کہ کلکٹر صاحب کے آنے پر"

" سیاہ دستیاں ہلائیں، خدا کو اسکول کی اور ہماری لاج"

" رکھنی تھی، جو پہلے سے اس سازش کا پتہ چل گیا، نہیں تو ہماری"

" کوششوں پر پانی پھر جاتا۔ اور کلکٹر صاحب نہ معلوم کیا اثر"

" لیکر جاتے ؟ ——————— ہیڈ ماسٹر، انگوروں کا خوشہ سیٹھ صاحب

کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔

" ماسٹر صاحب میں آپ کے حسنِ انتظام پر مبارک باد دیتا ہوں، کہ"

" اسکول کی تمام باتوں کی آپ خبر رکھتے ہیں، اگر کہیں اس سرپھرے ماسٹر کو اپنی سازش کے

پورا کرنے کا موقعہ مل جاتا"

" تو بس آفت ہی نازل ہو جاتی۔ یہ کلکٹر کوئی معمولی انگریز نہیں"

"ہے، یہ انگلستان کے ایک لارڈ خاندان کا رکن ہے"

" صوبہ کا گورنر اس کا ادب کرتا ہے، اسکی ایک رپورٹ ہیں"

" اسکول توڑ دیا جاتا۔ اور ہم لوگوں پر نہ معلوم کیا بپتا آ کر"

"پڑتی۔ ا ——— سیٹھ نے سگرٹ کو گل کرتے ہوئے جواب دیا۔

" سیٹھ صاحب! اسکول کے لڑکے ماسٹر اختر حسین کو بہت"

"عزیز رکھتے ہیں، اگر اُس کی ہردلعزیزی کا یہی عالم رہا"

" تو سارا اسکول انقلابی ہو جائیگا، ——— ہیڈ ماسٹر نے کوٹ کا بٹن گھماتے ہوئے کہا۔

" ماسٹر صاحب! ایسے خطرناک قسم کے استاد کو ایک"

" منٹ بھی اسکول میں نہیں رکھنا چاہیئے، یہ تو اسکول"

" کی تمام فضا کو زہر آلود بنا دے گا۔ اسکول کے طلباء"

" تو انقلابی تحریکوں کا بڑی مسرت کے ساتھ خیر مقدم کرتے ہیں"

" اسی ماسٹر کی دیکھا دیکھی کتنے ہی لڑکوں نے کھدر کا"

" لباس پہننا شروع کر دیا ہے یہ ماسٹر کچھ دن اور"

" رہ گیا، تو اسکول کو سیاست کا اکھاڑا بنادے گا" سیٹھ صاحب نے ذرا تیزی کے ساتھ جواب دیا)

" مجھے آپ کی رائے سے، حرف حرف اتفاق ہے، مگر"

" سیٹھ صاحب! مجھے اپنی بدنامی کا خوف ہے، جب کوئی ماسٹر"

" اسکول سے علیحدہ کیا جاتا ہے، تو لوگ مجھ ہی کو"

" مطعون کرتے ہیں ———— ہیڈ ماسٹر نے کہا۔

" ماسٹر صاحب! آپ لوگوں کے طعن و تشنیع کی پروا "

" نہ کیجئے، آپ ہی نے تو ایک دن وزیر ہند بہادر"

" کی تقریر سنائی تھی، جس کا ایک ٹکڑا یہ تھا "

" قافلہ گذر جاتا ہے اور کتے بھونکتے رہتے ہیں"

" یہ تمام اعتراض کرنیوالے کتوں کی طرح بھونکا کرتے ہیں،"

" ان کی پرواہ نہ کرنی چاہیئے۔ پھر کوئی آپ پر طعن کرے "

" آپ کا کیا بگاڑ لیگا، جب تک میں کمیٹی کا صدر ہوں"

" آپ پر آنچ نہیں آسکتی۔ "

" ماسٹر اختر حسین کو تو آپ علیحدہ ہی سمجھئے، میں "

" کل کمیٹی کا جلسہ طلب کر کے، ماسٹر اختر حسین کی"

" علیحدگی کا مسئلہ طے کرا دوں گا " سیٹھ صاحب نے ایک ساتھ

چار پانچ انگور منہ میں رکھتے ہوئے جواب دیا۔

" سیٹھ صاحب! آپ کے حُسنِ تدبر کا تو میں ہمیشہ سے "

" قائل ہوں اور آج سے تو میں آپ کی ہوشمندی "

" اور دور اندیشی کا کلمہ پڑھا کروں گا، آپ ذرا سی "

" دیر میں معاملہ کی تہ تک پہنچ گئے، سچ ہے کہ خدا کسی کو "

" کچھ دیکھ کر ہی، کسی قابل بناتا ہے۔ " ہیڈ ماسٹر بولا

سیٹھ صاحب نے دوسرے دن ارکان کا خصوصی جلسہ طلب کیا، جس میں ماسٹر اختر حسین کی علیحدگی کی تجویز بالاتفاق طے ہوگئی، ارکان ایک تو سیٹھ صاحب سے ویسے ہی مرعوب تھے۔ دوسرے اُن سے کہا گیا کہ ماسٹر اختر حسین ایک خوفناک انقلاب کی سازش کر رہا ہے، بنگال کے رہنے والوں کی اختر حسین کے پاس ڈاک آتی رہتی ہے، ان باتوں کو سُنکر ارکان نے رائے دی کہ اختر حسین کو فوراً علیحدہ کر دیا جائے۔ اختر حسین کو علیحدگی کا نوٹس دیا گیا۔ اختر حسین کی علیحدگی کو طلبا نے بری طرح محسوس کیا۔ طلباء نے اختر حسین کو الوداعی دعوت دینے کا بھی انتظام کیا تھا۔ مگر اختر حسین نے لکھ کر بھیج دیا۔

" آپ لوگوں کے خلوص و محبت کا مجھ پر بیحد اثر ہے "

" دعوت اور پارٹی رسم و تکلف کی چیزیں ہیں "

" اپنے خلوص و محبت کو پارٹی دیکر، آلودۂ رسم و تکلف "

" نہ بنایئے "

ماسٹر اختر حسین کے جانے کے بعد، ریاضی کے کتنے ہی استاد آئے۔ اور چلے گئے، بات یہ تھی کہ ہیڈ ماسٹر سے کسی کی بنتی نہ تھی، وہ ہر ماسٹر کو اپنا غلام بنا کر رکھنا چاہتا تھا کئی استادوں کے ردوبدل کے بعد، ایک مدراسی استاد کی خدمات حاصل کی گئیں یہ شخص مدراس کا پنڈت تھا، جسے اُردو کا ایک لفظ نہ آتا تھا، آدمی بہت قابل تھا۔ اور ریاضی کے مسائل اُس کو اکثر مستغرق بنائے رکھتے تھے۔ مگر اس کو کیا کیجئے کہ:۔

"زبان یارِ من ترکی و من ترکی نمیدانم"

نویں اور دسویں جماعت کے طلباء کی انگریزی بہت ہی معمولی ہوتی ہے، اور یہ مدراسی پنڈت موٹے موٹے الفاظ اور اُلجھی ہوئی ترکیبیں بولنے کا عادی تھا۔ ریاضی کے لئے اگرچہ مخصوص فنی محاورات اور اصطلاحات کی ضرورت داعی ہوتی ہے، مگر یہ پنڈت اُن اصطلاحات کی تشریح کچھ اس قدر تکلف و تعمق کے ساتھ کرتا۔ کہ غریب طلباء اُس کا مُنہ ہی دیکھتے رہ جاتے۔

افتخار نویں جماعت کا طالب علم تھا، مدراسی پنڈت کو آٹھویں۔ نویں اور دسویں جماعت کی ریاضی دی گئی تھی، ابتدا میں تو طلباء مدراسی پنڈت کے سمجھانے پر سر ہلا دیا کرتے تھے، مگر کچھ دن کے بعد اُن کا سر ہلانا بڑی حد تک کم ہو گیا، اور اُن کے شوخ و معصوم چہرے زبانِ حال سے کہنے لگے:۔

"ماسٹر صاحب! ہم کچھ نہیں سمجھے"

افتخار شوخ اور ذہین تھا۔ اور کلاس میں آزادی کے ساتھ استادوں سے سوالات کیا کرتا تھا

مدراسی پنڈت پر بھی افتخار کی ذہانت کا اثر پڑا، اور وہ اس کو ذہین اور طباع طالب علم سمجھنے لگا، ایک دن مدراسی پنڈت نے طلباء کو اقلیدس کی ایک شکل پڑھائی، پنڈت نے سیدھی سادھی باتوں کو اپنی قابلیت کے الجھاؤ میں ڈال دیا۔ طلباء نے بار بار پنڈت سے سوالات کئے، جب پنڈت سمجھا چکا، اور اُس نے طلباء کے چہروں پر مستفسرانہ نگاہ ڈالی، تو اُس نے محسوس کیا۔ کہ بہت سے دماغوں کی تختیوں پر ایک نقش بھی باقی نہیں رہا۔ پنڈت نے افتخار سے دریافت کیا۔

"جو کچھ میں نے سمجھایا ہے، کیا تم اُسے اردو"

"زبان میں سمجھا سکتے ہو۔"

افتخار پہلے تو قدرے سٹ پٹایا، مگر اُس کی مزاحیہ فطرت نے اُس کی گھبراہٹ کے طوفان کا یکایک رُخ پھیر دیا۔ وہ انتہائی سنجیدگی کے ساتھ بولا:۔

"جی ہاں! میں آپ کی کہی ہوئی بہت سی باتوں"

"کو اردو زبان میں دہرا سکوں گا۔"

استاد کے اشارہ کرنے پر افتخار تختۂ سیاہ کے قریب پہنچا۔ اُس نے بڑے سلیقہ کے ساتھ کھریا "chalk" کا ٹکڑا اٹھایا۔ اور خفیف سی مسکراہٹ بغیر گلفشانی کرنے لگا:۔

"دوستو لطف لینا چاہتے ہو، تو خدا کے لئے ہنسنا نہیں"

"میری باتیں غور سے سننا۔"

"دیکھو ب / ج، د ایک چوکھٹ ہے۔ جس کی تمام ٹانگیں"

" ایک دوسرے کے برابر ہیں۔ اور ہاں! ہمارے قبلہ

" استاد بھی چغد ہی ہیں، اور یہ اقلیدس حکیم سب سے بڑا"

" چغد تھا، یہ جیومیٹری چغدیت کے سوا اور کیا ہے؟ بہت سے استاد بھی

" چغد ہوتے ہیں، اور ریاضی پڑھانے والے استادوں کو تو اکثر چغدیت کے نشہ میں"

" مخمور دیکھا گیا ہے، ہاں بھائیو! لفظ "چغد" کو یاد رکھنا"

یہ لڑکے بھی حرفوں کے بنے ہوئے تھے، افتخار کی باتوں پر سنجیدگی کے ساتھ سر ہلاتے رہے

دو تین لڑکے البتہ قدرے مسکرائے مگر انہوں نے بناوٹی کھانسی کے پردے میں اپنی مسکراہٹ

کو چھپا لیا۔ مدراسی پنڈت نے افتخار کو شاباش دی۔ افتخار کے ہونٹوں پر تشکر و امتنان کی بناوٹی مسکراہٹ

کھیلنے لگی۔

" یہ "چغد" کس چیز کا نام ہے تم نے اس لفظ کو "

" کتنی ہی مرتبہ دہرایا ہے ——————" مدراسی پنڈت نے افتخار سے پوچھا۔

" چغد، مثلث (Triangle) کو کہتے ہیں"۔

" جناب! . . . . " افتخار سر کھجاتے ہوئے بولا۔

تھوڑی دیر بعد گھنٹہ ہوا اور مدراسی پنڈت نویں جماعت کے کمرے سے نکل کر، دسویں

جماعت کے کمرے میں پہونچا۔ مدراسی پنڈت نے دسویں کلاس کے طلباء کو بھی جیومیٹری کے

چند صفحے پڑھائے۔ جن میں مثلث کا بھی ذکر تھا۔ پنڈت نے تختہ سیاہ پر مثلث بنایا، اور طلبا کو سمجھانے لگا

"دیکھو یہ اے، بی، سی ایک (Triangle)"

"ہے" ہاں! "چغد" اس "چغد" کے دو زاویے

"ایک دوسرے کے برابر ہیں۔"

"چغد" کا نام سُنکر لڑکوں نے بے اختیار قہقہہ لگایا۔ پنڈت نے پہلے تو کچھ خیال نہ کیا مگر جب اُس نے دیکھا کہ لڑکے مسلسل ہنسے جا رہے ہیں، تو اُس نے ڈانٹ کر کہا۔

"یہ تم سب کیوں ہنس رہے ہو؟"

لڑکے ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے، پنڈت نے میز پر زور سے ہاتھ مارتے ہوئے ہنسنے کی وجہ پوچھی تو دو ایک لڑکوں کے مُنہ سے "چغد" نکلا۔ اور لڑکے پھر ہنسنے لگے۔

"تم "چغد" کے لفظ پر آخر ہنسنے"

"کیوں ہو؟ —————— پنڈت قدرے تیزی کے ساتھ بولا۔

"جناب! "چغد" کے معنی پوچھتے ہیں، لیکن! میں کیا کہوں۔!" ایک لڑکے نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"صاف صاف بتاؤ، نہ خوف کی ضرورت ہے اور نہ"

"شرم کی۔!" پنڈت نے رومال سے پیشانی کو پونچھتے ہوئے کہا۔

"چغد" الّو کو کہتے ہیں —————— "لڑکا دبی زبان سے بولا۔

" چغد" الّو کو کہتے ہیں، "اُلّو کو" پنڈت بڑبڑاتا ہوا، کمرے میں ٹہلنے لگا۔ اُس کے چہرے پر ایک رنگ آتا تھا اور ایک رنگ جاتا تھا۔

" نویں جماعت کے اُس لانبے لڑکے کو بلا کر"

" لاؤ۔"

پنڈت مٹھی کو زور سے دباتے ہوئے بولا۔

" نویں جماعت میں تو کئی لڑکے لانبے ہیں، آپ کس"

" لڑکے کو بلانا چاہتے ہیں۔"

" دسویں جماعت کے عریف (Monitor) نے جواب دیا۔

" اسی لڑکے کو جو بہت زیادہ شریر ہے، جس کے چہرے سے"

" معصومیت برستی ہے، مگر اُس کا دل مجرم اور خوفناک ہے۔

یہ کہکر پنڈت کرسی پر بیٹھ گیا۔ آدمی تھا سمجھدار۔ کرسی پر بیٹھ کر اُس نے تھوڑی دیر تک غور کیا۔ اور اپنی گھبراہٹ کو چھپانے کے لئے اُس نے طلباء کو پڑھانا شروع کر دیا۔ گھنٹہ ختم ہونیکے بعد دسویں جماعت کے طلباء نویں جماعت کے طلباء سے ملے، تبادلۂ خیال کے بعد جب اصل بات معلوم ہوئی۔ تو طلباء کے قہقہوں اور واہ واہ کا عالم نہ پوچھیئے، اسکول کے گوشہ گوشہ سے "ہی ہی" کی صدائیں آرہی تھیں۔ لڑکوں کا ہر قہقہہ افتخار کے لئے داد و ستائش کی پیشکش تھا۔

مدراسی پنڈت اگر ہیڈ ماسٹر کو اس واقعہ کی اطلاع کر دیتا۔ تو افتخار کی اچھی طرح گوشمالی

ہوتی، مگر آدمی تھا فہیم اور زیرک، اُس نے اس معاملہ کو طُول دینا پسند نہ کیا، کیونکہ اس میں خود اُس کی بھی سبکی کا ایک پہلو نکلتا تھا۔ دوسرے دن پنڈت نویں جماعت میں آیا تو اُس پر ایک خاص قسم کی گھبراہٹ طاری تھی۔ اُس نے ایک ایک لفظ رک رک کر طلباء کو پڑھایا، افتخار کی طرف اُس نے مشکل سے دو ایک بار دیکھا ہوگا۔ مگر ان دو ایک نظاروں میں ہی اُس کا لہو کھول کر رہ گیا۔

افتخار کی ان ہی باتوں نے اُسے مدرسہ کے طلبا میں ہر دلعزیز بنا دیا تھا۔ اگر کسی جلسہ میں افتخار کا آنا نہ ہوتا۔ تو طلباء ایک خاص کمی اور بے کیفی محسوس کرتے۔ افتخار محنتی تو زیادہ نہ تھا۔ مگر ذہین بلا کا تھا۔ نویں جماعت کے سالانہ امتحان میں اُس کے جغرافیہ اور تاریخ کے پرچے خراب ہو گئے۔ دُوسرے مضامین میں اُس نے بہت ہی اچھے نمبر حاصل کئے۔ اس لئے اُسے ترقی دیدی گئی اب وہ اسکول کی سب سے اعلیٰ جماعت کا طالب علم تھا۔ وہ جو کسی حکیم کا قول ہے کہ "فطرت کبھی نہیں بدلتی"۔ افتخار کی مزاحیہ فطرت میں بھی عمر اور علم کی زیادتی کوئی انقلاب پیدا نہ کرسکی۔ ہاں البتہ یہ ضرور تھا۔ کہ اُس کے مزاح میں پختگی اور سنجیدگی پیدا ہوتی جاتی تھی۔ "سنجیدہ مزاح" اور "چھچھورے مزاح" میں بہت کچھ فرق ہے۔ مگر مزاح بہرحال مزاح ہے۔

جاڑوں کا زمانہ تھا، شہر کے خوش باش لوگوں نے کُشتی کے ایک بڑے دنگل کا انتظام کیا تھا۔ دُور دور کے پہلوانوں کو دعوت دی گئی تھی۔ تین روز تک بڑے زور کا دنگل رہا، چوتھے دن آخری دنگل تھا۔ جس میں مشہور اور مشاق پہلوانوں کی کُشتیوں کا اعلان کیا گیا تھا۔ دنگل کا وقت شام کے

ڈھائی بجے سے شروع ہونا تھا۔ طلبا نے نصف دن کی چھٹی کے لئے ہیڈ ماسٹر کے پاس درخواست پیش کی ہیڈ ماسٹر نے درخواست نامنظور کر دی اور درخواست نامنظور کرنے کے ساتھ ہی اسی دنگل کے دن شام کو ہاکی کے میچ کا انتظام کر کے طلبا کو تاکید کر دی کہ کھیل کے میدان میں حاضر رہیں۔ بات یہ تھی کہ دنگل کے منتظمین نے ہیڈ ماسٹر کے پاس ایک "فری پاس" بھیجا تھا ہیڈ ماسٹر نے جواب میں لکھا کہ میرے یہاں تین چار مہمان آئے ہوئے ہیں۔ اُن کے لئے "فری پاس" بھیج دیجئے۔ دنگل کے منتظمین نے جواب دیا کہ آپ کیلئے فقط ایک "پاس" مزید بھیجا جاتا ہے، اس سے زیادہ کی گنجائش نہیں ہے۔ ہیڈ ماسٹر اس پر بگڑ بیٹھا، اور اُس نے اپنے دل کی بھڑاس اس طرح نکالی کہ ہاکی کے میچ میں طلباء کو حاضری کا پابند بنا دیا یہ دنگل کے بائیکاٹ کی ایک "مہذب تدبیر" تھی۔

ہیڈ ماسٹر کے اس نادری حکم سے طلبا بہت مایوس ہوئے، دو ایک استادوں نے ہمت کر کے، طلباء کے خیالات کی ترجمانی بھی کی، مگر ہیڈ ماسٹر نے کورا جواب دے دیا۔ انسان کو جس کام سے روکا جاتا ہے۔ اُس کی طرف اُس کا دل اور زیادہ کھنچتا ہے۔ طلباء کی بھی بالکل ایسی ہی حالت تھی، اُن کے دل و دماغ پر "دنگل" چھایا ہوا تھا، اُن کے جذبات شدید انقباض محسوس کر رہے تھے، اُن کے شوق کی بے چینی اور اُس پر اُن کی بے بسی اور ناچاری، بہ ہر عنوان قابل رحم تھی۔ مگر ہیڈ ماسٹر اپنی بات پر جما ہوا تھا، اور وہ اپنے فیصلہ میں کسی قسم کی ترمیم کے لئے تیار نہ تھا۔

لڑکوں نے درخواست آخری دنگل سے ایک دن پہلے ہیڈ ماسٹر کے پاس پیش کی تھی۔

انہوں نے رات بڑی بے چینی کے عالم میں گذاری، دوسرے دن طلبا کی بڑی تعداد، وقت سے بہت پہلے مدرسہ میں آگئی۔ وہی دن معرکہ کا تھا، طلبا، اس معرکہ سر کرنے کی تدابیر سوچنے اور تبادلۂ خیالات کرنے کے لئے وقت سے پہلے مدرسہ میں آگئے تھے۔ بہت دیر تک آپس میں گفتگو رہی۔ تمام طلبا کی نظریں افتخار پر تھیں، اُن کا خیال نہیں بلکہ یقین تھا۔ کہ افتخار کی ذہانت کوئی نہ کوئی راہ ضرور نکالے گی۔ افتخار بہت دیر تک سوچتا رہا اور قدرے تامل و تفکر کے بعد ذرا پریشان ہو ہو کر بولا:۔

"بھائیو! ترکیب تو ذہن میں آگئی ہے۔ اگرچہ اُس ترکیب کا"
"پورا کرنا خطرات سے خالی نہیں، مگر آپ لوگوں کے بے پناہ"
"شوق کو میں خطرات کی بنا پر ٹھکرا نہیں سکتا۔ میں کیا"
"کرنے والا ہوں؟ اس کا میں آپ لوگوں کو اتا پتا بھی نہ دونگا، ابھی اسکیمیں"
"ہمیشہ پردۂ راز میں رکھی جاتی ہیں۔ مجھے آپ لوگوں کی رازداری پر پورا"
"اعتماد ہے، لیکن بھائیو! "دیوار ہم گوش دارد" اس اسکیم کے"
"پورا کرنے کے لئے پانچ روپیہ کی ضرورت ہوگی، آٹھ آنہ میں اپنی طرف سے"
"پیش کرتا ہوں، باقی کا آپ لوگ بندوبست کر دیں!"

اسکول کے لڑکے افتخار کے چہرے کو مسرت و امتنان کی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے، افتخار کی زبان سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ اُن کی مایوس تمناؤں کے لئے امید کا پیام تھا۔ بات

کی بات میں بانی کے ساڑھے چار روپے کا چندہ جمع ہوگیا۔

اسکول کمیٹی کے صدر کی بیوی چند دن سے بیمار تھی، دو تین دن پہلے اُس پر عملِ جراحی بھی ہوا تھا۔ اسی واقعہ نے افتخار کی ذہانت کو تدبیر سجھائی، اُسے اپنی تدبیر کی کامیابی کا سو فیصدی یقین تھا۔ افتخار لاکھ ھنسوڑا و خوش طبع سہی مگر وہ اتنا بیوقوف نہ تھا کہ کسی چیز کے انجام اور اُس کی اچھائی برائی کو نہ سمجھ سکے، جس کام کے پورا کرنے کے لئے اُس نے بیڑا اٹھایا تھا، وہ یقیناً بہت سے خطرات سے بھر پور تھا لیکن طلباء کے بڑھتے ہوئے اشتیاق اور اُن کی تمناؤں کی بے چینی نے افتخار کی عقل و ہوش کی آنکھوں پر محبت کے پردے ڈال دئے تھے۔ وہ خطرات کے آتش کدہ میں کودنے کے لئے تیار ہوگیا۔

وہ ایک ایسی سازش کا ارتکاب کر رہا تھا جسے خلوص و محبت کی زبان میں "معصوم" اور قانون و تمدن کی اصطلاح میں "خوفناک" کہتے ہیں۔

رام نرائن اسکول میں اُس وقت سے چپراسی تھا جبکہ اسکول کی عمارت مٹیوں اور چھپریں تک محدود تھی۔ اسکول میں بہت سے انقلاب آئے۔ ٹوٹے پھوٹے کمرے، بلند و فراخ ہالوں سے بدل گئے۔ جس میدان میں دن رات خاک اڑا کرتی تھی۔ وہاں لہلہاتا ہوا سبزہ نظر آتا تھا چٹائیاں اور بوریے کی جگہ بنچوں اور کرسیوں نے لیلی۔ یہ سب کچھ ہوا۔ مگر رام نرائن میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی، اُس کی اونچی دھوتی کو تمدن و تہذیب کی ترقی ایک انگل بھی نیچا نہ کر سکی۔ اور اس کے منڈاسے کے پیچوں کی بے ترتیبی کو بھی تہذیب کی شائستگی نہ بدل سکی۔ اس کی گھنی اور لانبی مونچھیں

تھوڑی بہت سپید تو ضرور ہوگئی تھیں۔ مگر فیشن کے انقلابات کی ہوا ایک بال کو بھی ادھر سے ادھر نہ کر سکی۔ رام نراین نے جن بچوں کی گوشمالی کی تھی۔ وہ اسی اسکول میں مدرس ہو گئے تھے۔ اور وہ اُن کو مسکرا کر "ماسٹر صاحب" کہا کرتا تھا۔ رام نراین طالب علموں، مدرسوں اور چپراسیوں میں بیحد ہر دلعزیز تھا۔ اُس کی بھولی بھالی باتیں، اچھا خاصہ تفریح کا سامان پیدا کرتی تھیں اسکول کمیٹی کے صدر اور ارکان کے یہاں بھی اُس کا آنا جانا رہتا تھا۔ رام نرائن اسکول کی دلچسپ زندہ تاریخ تھا۔

مدرسہ شروع ہو چکا تھا۔ مدرسین، جماعتوں میں درس دے رہے تھے۔ ہیڈ ماسٹر اسکول کی سالانہ رپورٹ مرتب کرنے میں ہمہ تن مصروف تھا افتخار نے رام نراین کو انگلی کے اشارے سے بلایا۔

"افتخار میاں، تم خیریت سے تو ہو"

"میں نے تم کو کئی دن کے بعد دیکھا ہے"۔ رام نرائن نے لانبی مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے پوچھا۔

"میں تو اسکول روز آ رہا ہوں، رام نرائن!"

"تم کو تو میں روز ہیڈ ماسٹر صاحب کے"

"کمرے کے پاس کھڑا ہوا دیکھتا ہوں، ایک دن"

"میں نے تم کو اشارہ بھی کیا تھا، لیکن"

" تم نے نہیں دیکھا، تم لفافوں کو الٹ پلٹ کر"

" دیکھ رہے تھے ———————— " افتخار نے جواب دیا

" ارے میاں! اس ہیڈ ماسٹر سے ناک میں دم ہے، میں اس"

" مدرسہ میں جوان سے بوڑھا ہو گیا، ایشور جھوٹ نہ بلوائے "

" تو کئی درجن ہیڈ ماسٹروں کا زمانہ میں نے دیکھا ہے۔ مگر"

" ایسا ہیڈ ماسٹر اس مدرسہ میں آجتک نہیں آیا۔ مدرسہ کا"

" وقت ختم ہو جانیکے بعد، اسکے گھر کا کام کرو۔ بچوں کو"

" ٹہلانے کے لئے لے جاؤ۔ کہار نہ آئے تو پانی بھرو باہر کے"

" کمرے میں جھاڑو دو، میں تو رات کو اپنے گھر دس گیارہ بجے"

" پہلے نہیں پہنچتا۔ اس سے پہلے کے ہیڈ ماسٹر بھی اپنے"

" گھر بار کا تھوڑا بہت کام لیتے تھے۔ مگر وہ میرے"

" ساتھ سلوک بھی تو کرتے تھے کسی تیوہار پر خشک"

" جنس وید ی، میرے بچوں کو کچھ انعام دے دیا۔ مجھے کپڑا"

" بنوا دیا۔ اور یہ آپ کا ہیڈ ماسٹر، ایسا کنجوس ہے کہ"

" آج تک ایک پھوٹی کوڑی بھی اسکے گھر سے مجھے نہیں ملی،"

" اور میاں! اس کی بیوی اس سے بھی زیادہ لوبھی ہے۔ دو پیسہ کی

"ترکاری کے لئے مجھے تین تین مرتبہ بازار جانا"

"پڑتا ہے میرا تو ناک میں دم ہے اس ہیڈ ماسٹر کی ٹہل"

"سے پانہ جانے کب میرا پنڈ چھوٹیگا!————رام نراین دھوتی کو اکستے

ہوئے بولا۔

"رام نراین ایک تم ہی کو نہیں بلکہ اسکول کے لڑکوں کو اُستادوں کو"

"چپراسیوں کو، غرض سارے اسکول کو ہیڈ ماسٹر صاحب سے"

"شکایت ہے، مگر اب ہیڈ ماسٹر صاحب کے دِن قریب آ گئے ہیں"

"ہاں! رام نراین، تم سے آج ایک ضروری کام ہے، وہ تمہارے ہی کرنے کا ہے، اگر تم پکا

وعدہ کرو، تو میں اسکا ذکر"

"کروں۔!" افتخار نے پنسل سے مدرسہ کی دیوار پر لکیر کھینچتے ہوئے کہا۔

"میاں آپ کی بات کو بھلا میں ٹال سکتا ہوں، میرے کرنے کا کام"

"ہوگا، تو ہنس کھیل کر کرونگا————" رام نراین چپراسی نے

جواب دیا۔

"تمہیں معلوم ہے ناراین! کہ آج آخری دنگل ہے، نامی"

"گرامی پہلوانوں کی کشتیاں ہوں گی، ایسے موقعے روز روز"

"تھوڑی میسر آتے ہیں، کتنی افسوس کی بات ہے کہ تمام"

"شہر دنگل دیکھے اور ہمارے اسکول کے لڑکے مُنہ دیکھتے"
"رہ جائیں، تم کو ضرور معلوم ہوگا، کہ ہیڈ ماسٹر نے لڑکوں کی"
"چھٹی کی درخواست کو کرنا منظور کر دیا ہے، اور درخواست ہی کو"
"نامنظور نہیں کیا بلکہ شام میں، کھیل کے میدان میں حاضری"
"کی پخ لگادی ہے ——————" افتخار کوٹ کی سلوٹ کو چھوتے ہوئے بولا۔

"ہیڈ ماسٹر نے یہ تو بڑا ظلم کیا ہے، آدھے دن کی چھٹی تو"
"ہیڈ ماسٹر صاحب اپنے حکم سے دے سکتے ہیں"
"مجھے تو لڑکوں کی مجبوری پر بڑا ترس آتا ہے ابھی تو بچوں کے"
"کھانے کھیلنے کے دن ہیں، بڑے ظالم ہیں ہمارے ہیڈ ماسٹر"
"صاحب! اچھا ہاں! اب کیا ہونا چاہیئے۔!"— رام نراین نے افتخار کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"اب کیا ہونا چاہیئے"؟ چھٹی ہونی چاہیئے، اور اس کا"
"دارومدار تم پر ہے، تم اگر چاہو تو ابھی اور اسی وقت"
"چھٹی ہوسکتی ہے —————— افتخار نے جواب دیا۔
"میں چاہوں تو چھٹی ہوسکتی ہے! میاں تم مجھ سے مذاق"

"کر رہے ہو۔ چھ روپئے کے چپراسی کی بھلا"

"کیا چل سکتی ہے! میں کیا کر سکتا ہوں، کچھ کہو تو سہی!" رام نراین قدرے تیزی کے ساتھ بولا۔

"نارائن! ذرا ہمت کرنی پڑیگی، بس پھر بیڑا پار ہے۔ تم کو"
"معلوم ہے۔ کہ اسکول کمیٹی کے صدر کی بیوی بیمار ہے اتم"
"کسی طرح ہیڈ ماسٹر کے کان تک یہ بات پہنچا دو، کہ سیٹھ"
"صاحب کی بیوی مر گئی ——————" افتخار نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔

"افتخار میاں! آپ کی تجویز تو معقول ہے، چھٹی فوراً ہو جائیگی"
"مگر میری نوکری جاتی رہیگی، ہیڈ ماسٹر صاحب اور سیٹھ صاحب دونوں"
"کی ملی بھگت ہے، وہ مجھ کو علیحدہ کر دینگے نوکری سے!"
"پھر یہ تو ایسا جھوٹ ہے، کہ ابھی تھوڑی دیر میں کھل جائیگا"
"میاں! بڑھاپے میں مجھ سے کوئی چلم بھی نہ بھروائے گا"
"مدرسہ میں لاکھ تکلیف سہی، مگر ایک وقت تو روٹی"
"مل جاتی ہے۔ اور کہیں تو اتنا بھی سہارا نہیں ہے۔" رام نراین نے گھبرا کر جواب دیا۔

"رام نراین! تم مجھ پر اعتبار کرو، تمہارا بال بیکا بھی نہیں ہو سکتا۔"

"میرے دو رشتہ دار اسکول کی کمیٹی کے ممبر ہیں، پھر خدا کے فضل سے"

"میرے خاندان کے لوگوں کا اسکول پر بہت کچھ اثر ہے اس سے"

"تم ناواقف نہیں ہو۔ نارائن! اگر کوئی بات آ کر"

"پڑی تو میں سب کچھ سنبھال لوں گا" اور اگر تم کو اسکول سے

"علیحدہ ہی ہو جانا پڑا، تو چنگی میں ہمارے بڑے بھائی سکتر ہیں"

"اُن سے کہہ کر تم کو وہاں نوکر رکھا دوں گا۔ یہاں تم کو چھ روپے ملتے"

"ہیں، وہاں اس سے کچھ زیادہ ہی ملیگا۔ نارائن! لڑکے تمہارے"

"عمر بھر احسان مند رہیں گے۔ ان کی خوشی کا تم کو خیال کرنا چاہیئے" افتخار، چپراسی کا ہاتھ دباتے ہوئے بولا۔

"میاں! میرا دل کسی طرح تیار نہیں ہوتا۔ بڑا سخت معاملہ ہے"۔

"افتخار میاں!۔ اچھا، چنگی میں تم نوکر رکھا دوگے، اگر"

"یہاں سے نوکری چھٹ گئی۔ !" چپراسی نے قدرے مضطرب ہو کر کہا۔

"ضرور رکھا دوں گا نارائن! بھائی کی بات بھائی کہیں"

"ٹال سکتا ہے۔ اور یہ لو، تمہارے بچوں کی مٹھائی"

"کے لئے لڑکوں نے کچھ دیا ہے۔" افتخار چپراسی کے ہاتھ میں روپے پکڑاتے

ہوئے بولا۔

چھ روپے کی تنخواہ والے ملازم کو اکٹھے پانچ روپے مل گئے، اور وہ بھی ایک دو جملے کہنے کے بدلے نارائن نے خوشی کے ساتھ "ہامی" بھر لی، نوکری کے متعلق تو افتخار اُسے یقین دلا چکا تھا، اس طرف سے تو نارائن چپراسی کو اطمینان ہو گیا۔ پانچ روپوں کی پیشکش نے خوف اور گھبراہٹ کے طوفان کو آمادگی کی طرف پھیر دیا۔ اُس نے روپے دھوتی کی انٹی میں خوب کس کر باندھے، اور تیزی کے ساتھ ہیڈ ماسٹر کے کمرے کی طرف چلا، دروازے پر پہنچکر وہ ذرا گھبرا کر رکا، اور افتخار کی طرف مڑ کر دیکھا۔ افتخار نے انگلی کے اشارے سے کہا۔ کہ کمرے میں چلے جاؤ۔ نارائن ہیڈ ماسٹر کے کمرے میں گھبرا کر داخل ہو گیا۔

ہیڈ ماسٹر رپورٹ کا مسودہ بڑے انہماک کے ساتھ پڑھ رہا تھا۔ اُس کی انگلیوں میں ادھ جلا سگریٹ لگا ہوا تھا، جس سے راکھ گر رہی تھی۔ نارائن نے جب دیکھا کہ ہیڈ ماسٹر اُس کی طرف متوجہ نہیں ہوتا تو وہ زور سے کھانسا، اس انداز کے ساتھ کہ وہ ادب کے لحاظ سے کھانسی کو روکنا چاہتا ہے۔ مگر کھانسی نہیں رُکتی، ہیڈ ماسٹر چونکا، سگریٹ اُس کی اُنگلی سے چھوٹ پڑا۔

"کیا بات ہے نارائن۔ ! " ہیڈ ماسٹر نے قدرے متوحش ہو کر دریافت کیا۔

"حضور! کیا کہوں ——— ! " نارائن چہرے پر حزن و ملال کے آثار پیدا کرتے ہوئے بولا۔

"صاف صاف کہو، نارائن! تم اس قدر پریشان"

"کیوں ہو رہے ہو! ——————" ہیڈ ماسٹر نے کہا۔

"سرکار! سیٹھ صاحب کا آدمی ابھی کہہ کر گیا ہے۔ کہ"

"سیٹھ صاحب کی بیوی کا انتقال ہو گیا ——————" نارائن جھوٹ کے فطری احساس سے گھبراتے ہوئے بولا۔

"ارے! سیٹھانی صاحبہ کا انتقال ہو گیا۔ صبح تو میں"

"اُن کو بالکل اچھا چھوڑ آیا تھا۔ مگر ہاں! موت کے لئے"

"کسی خاص وقت کی قید تھوڑی ہے، حکیم صاحب نے تو"

"سیٹھ صاحب سے اپریشن کے لئے پہلے ہی منع کیا تھا۔"

"نارائن! فوراً چھٹی کی گھنٹی بجا دو، اور چپراسیوں سے"

"کہہ دو کہ جماعتوں میں جا کر استادوں کو اس واقعہ"

"کی اطلاع کر دیں ——————" ہیڈ ماسٹر نے رپورٹ کو میز کی دراز میں رکھتے ہوئے کہا۔

چپراسیوں نے جماعتوں میں جا کر اس واقعہ کی اطلاع کر دی اور نارائن نے چھٹی کی گھنٹی بجا دی، طلباء کے کانوں کو چھٹی کا گھنٹہ بربط اور پیانو کے نغموں سے زیادہ سُریلا اور شیریں محسوس ہوتا ہے اور آج کے دن کی چھٹی کے لئے تو وہ دعائیں مانگ رہے تھے، طلباء کمروں سے "ہُرّے" کے نعرے لگاتے ہوئے نکلے، اُن کی مسرتیں قیاس و اندازہ سے باہر تھیں، افتخار بھی بہت خوش تھا، مگر اُسکی خوشی کی

تہ میں اضطراب پایا جاتا تھا۔ اُس کی تدبیر اگرچہ کارگر ہو چکی تھی، لیکن اُس کے عواقب و نتائج کا تصور افتخار کے لئے بہرحال وجہ اضطراب تھا۔ طلباء اس کا شکریہ ادا کر رہے تھے، وہ ہنس رہا تھا مگر کوئی گہرا تفکر اُس کی ہنسی کا دامن تھامے ہوئے تھا۔ لڑکے مدرسہ سے اس تیزی کے ساتھ بھاگے، جیسے قیدی، جیلخانہ سے چھوٹ کر بھاگتے ہیں، آن کی آن میں مدرسہ خالی ہو گیا، استاد و چپراسی سوگ منانے کے لئے رہ گئے تھے۔

ہیڈ ماسٹر استادوں اور چپراسیوں کو لیکر سیٹھ صاحب کے مکان پر پہنچا سیٹھ صاحب چوکی پر بیٹھے ہوئے حقہ پی رہے تھے، استادوں نے سیٹھ صاحب کو جھک کر آداب کیا۔

"آداب بندگی، پرنام! بیٹھیے بیٹھیے چوکیوں"

"پر تشریف رکھیے۔" سیٹھ صاحب نے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

تمام اُستاد، ہیڈ ماسٹر سمیت چوکیوں پر بیٹھ گئے۔ استاد اپنے چہروں پر بناوٹی حزن و ملال کے آثار پیدا کر رہے تھے، اور ہیڈ ماسٹر نے تو اپنے چہرے کو اس قدر غمناک بنا لیا تھا۔ کہ جیسے اُس کا کلیجہ شق ہوا جاتا ہے، اور سیٹھ کی بیوی کا نہیں، بلکہ خود اس کی بیوی کا انتقال ہوا ہے۔ تھوڑی دیر تک خاموشی طاری رہی،

"صبح تو سیٹھانی صاحبہ بالکل اچھی تھیں"۔ ہیڈ ماسٹر نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا،

ہیڈ ماسٹر نے جب یہ جملہ کہا۔ تو سیٹھ چلم کی آگ کو جو کجلا گئی تھی، پھونک رہا تھا۔ اُس نے ہیڈ ماسٹر کی بات کو اچھی طرح نہیں سنا۔ اُس نے بے خیالی کے عالم میں جواب دیا،۔

"جی ہاں! صبح بالکل اچھی بھلی تھیں وہ!"

یہ کہہ کر سیٹھ نے زور سے گڑ گڑی میں کش لگایا۔ اور کش لگانے کے بعد جو دھواں چھوڑا ہے تو تھوڑی دیر کے لئے اُس کے چہرے کا ایک حصّہ دھوئیں کے ہلکے سے پردے میں چھپ گیا۔ وہ بے پروائی کے ساتھ حقّہ پی رہا تھا، اور کمرے کی فضا میں دھواں اٹھکھیلیاں کرتا ہوا گھوم رہا تھا۔

"سیٹھانی صاحبہ! کتنی بھاگوان اور مہربان تھیں"

"ایسے لوگ کہاں پیدا ہوتے ہیں۔ ——" ہیڈ ماسٹر نے دل گرفتگی کے انداز میں کہا

"سیٹھانی صاحبہ مہربان تھیں؟ یعنی، کیا مطلب ہے آپ کا،" سیٹھ صاحب گاؤ تکیہ سرکا کر اوپر اٹھتے ہوئے بولے

"سیٹھ صاحب! صبر کیجئے، جو آیا ہے اُسے ایک دن"

"جانا ہے، سنسار میں سدا ایسا ہی ہوتا"

"آیا ہے۔ بڑے بڑے رشیوں اور بھگتوں کو بھی"

"دُنیا سے اُٹھ جانا پڑا۔ ——" ہیڈ ماسٹر نے جواب دیا۔

"کس بات کا صبر کروں؟ یہ آپ کیا کہہ"

"رہے ہیں؟ ——" سیٹھ صاحب نے متعجب ہو کر کہا۔

"ہم سیٹھانی کے انتقال کا پرسا دینے کے لئے آئے ہیں"۔

"غم و محبت کی شدّت کا اثر تو دیکھو، کہ سیٹھ صاحب، اپنی"

"چہیتی بیوی کو زندہ سمجھ رہے ہیں، ——" ہیڈ ماسٹر اُستادوں کی طرف

دیکھتے ہوئے بولا۔

"ماسٹر صاحب! آپ یہ آج کیسی بہکی ہوئی باتیں کر رہے"

"ہیں، سیٹھانی صاحبہ تو بالکل اچھی ہیں، میں تو ابھی اُن کو"

"دھا پلا کر آیا ہوں۔ آج تو وہ دو چار قدم ٹہلی بھی تھیں" سیٹھ نے جواب دیا۔

یہ سنکر ہیڈ ماسٹر اس قدر پشیمان ہوا کہ اُس کے چہرے پہ ہوائیاں اڑنے لگیں، اور پشیمان ہونیکی بات بھی تھی۔ کہ زندہ آدمی کو وہ مرا ہوا تصور کر رہا تھا۔

نارائن چپراسی ستون کی آڑ میں کھڑا ہوا تھا سیٹھ صاحب اور ہیڈ ماسٹر صاحب کی یہ گفتگو سُن کر وہ چپکے سے کھسک گیا۔ اور سیدھا افتخار کے یہاں پہونچا سیٹھ صاحب نے ہیڈ ماسٹر سے دریافت کیا۔ کہ آپ کو کس نے یہ جھوٹی اطلاع دی؟ ہیڈ ماسٹر نے نارائن چپراسی کا نام لیا۔ اس پہ نارائن چپراسی کی تلاش شروع ہوئی معلوم ہوا کہ وہ کسی ضرورت سے گھر چلا گیا۔ ہیڈ ماسٹر نے سیٹھ صاحب سے معافی چاہی، اور جب ہیڈ ماسٹر صاحب کو اس بات کا یقین ہو گیا کہ سیٹھ صاحب نے اُن کو دل سے معاف کر دیا ہے۔ اور اب اُن کے دل میں کوئی بات ہیڈ ماسٹر کی طرف سے نہیں رہی، تو وہ اُستادوں کو لے کر وہاں سے رخصت ہو گئے۔

نارائن جب افتخار کے گھر پہنچا ہے تو افتخار مردانہ کمرے میں بیٹھا ہوا جوتہ پہ پالش کر رہا تھا

"میاں! بھید کھل گیا" نارائن گھبرا کر بولا۔

افتخار چونک کر مسکرایا۔ اور نارائن کو تسلّی دے کر فرش پہ بیٹھنے کے لئے کہا۔ نارائن نے

ساری داستان ایک ہی سانس میں سنا ڈالی۔

" نارائن اتنے زیادہ نہ گھبراؤ، گھبراہٹ سے"

" کام خراب ہو جاتا ہے ــــــــــــــــ" افتخار پالش کی شیشی کے کنارے سے انگلی پونچھتے ہوئے بولا۔

" ہیڈ ماسٹر صاحب مجھ سے بلا کر پوچھیں گے تو میں"

" کیا جواب دوں! اور ہاں! میاں! میں تو اب"

" آپ کے گھر سے نہ جاؤنگا، آپ مجھے پنگی میں نوکر"

" رکھا دیجئے، اسکول کی نوکری تو سمجھ لیجئے کہ چھوٹ گئی"

" میری تو ہیڈ ماسٹر کے سامنے جانیکی ہمت ہی نہیں پڑتی"

" اُن کے ڈراونے دیدوں سے مجھے ویسے ہی خوف معلوم"

" ہوتا ہے ــــــــــــــــ" چپراسی نے جواب دیا۔

" ہمت سے کام لو نارائن! اگر تم میری کہی ہوئی بات پر عمل کرو"

" اور گھبراؤ نہیں تو، تمہارا کچھ بھی نہیں بگڑ سکتا، دیکھو!"

" جب ہیڈ ماسٹر تم سے دریافت کریں، تو تم کہنا کہ ایک"

" لانبا سا آدمی جو کناری دار دھوتی باندھے ہوا تھا جس"

" کے سر پر اُودی مخمل کی ٹوپی تھی مجھ سے یہ بات"

" کہکر کہ "سیٹھانی کا انتقال ہوگیا" فوراً ہی الٹے پاؤں"

" بھاگا چلا گیا، میں اس کا چہرہ بھی اچھی طرح دیکھنے"

" نہ پایا۔ میں نے اس آدمی کو اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا" — افتخار نے برش کو ہاتھ میں

لیتے ہوئے کہا۔

" جو کچھ تم نے کہا ہے میں ہیڈ ماسٹر صاحب سے کہہ دونگا"

" مگر اتنا کہہ دینے سے کیا میری جان چھٹ جائیگی؟"

" ہیڈ ماسٹر تو بال کی کھال نکالتے ہیں، میں ان کی باتوں کا"

" کہانتک جواب دوں گا ——————" نارائن انگوچھے کو گرہ دیتے

ہوئے بولا۔

" تم اس سے زیادہ ایک لفظ بھی نہ کہنا، جو کچھ میں نے کہا ہے بس"

" یہی کہے جانا۔ اور جو کچھ معاملہ آ کر پڑے گا، اُس کا"

" انتظام میں کروں گا۔ نارائن! اپنے گھر جاؤ، اور ہیڈ ماسٹر"

" اگر بلائیں تو فوراً چلے جانا۔ گھبرانا نہیں، اطمینان"

" کے ساتھ جواب دینا ——————" افتخار نے اٹھتے ہوئے کہا

نارائن رخصت ہو کر گھر پہنچا۔ نارائن کو گھر پہنچکر معلوم ہوا کہ

ہیڈ ماسٹر کا آدمی دو تین مرتبہ اُس کے بلانے کے لئے آچکا ہے۔ نارائن نے ایک کٹورا

بھر کر پانی پیا اور خود ہی ہیڈ ماسٹر کے گھر چلا گیا۔ ہیڈ ماسٹر نے اس کو دیکھتے ہی گالیاں بکنا شروع کیں۔ نارائن سکین صورت بنائے گالیاں سنتا رہا۔ جب ہیڈ ماسٹر نے اس سے دریافت کیا، تو اس نے افتخار کی بتائی ہوئی باتیں حرف حرف ہیڈ ماسٹر کے سامنے دوہرا دیں۔ ہیڈ ماسٹر نے بہت کچھ جرح کی، مگر نارائن اُن ہی باتوں کو دہراتا رہا، جرح میں تو اُن لوگوں کے بیانات مجروح ہو جاتے ہیں، جو بہت زیادہ بولتے ہیں، یا اپنی باتوں کی تاویلیں کرتے ہیں، جو شخص اپنی کہی ہوئی باتوں ہی کو دہرائے جاتا ہے اور اِدھر اُدھر نہیں بھٹکتا وہ جرح میں کیوں ٹوٹنے لگا۔

یہ خبر بہت سے لوگوں کے کانوں تک پہنچ چکی تھی، افتخار نے اپنے بھائی کو جو سیٹھ صاحب اور ہیڈ ماسٹر کے دوست تھے اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ دونوں کو کسی مناسب عنوان کے ساتھ یہ باور کرا دیں کہ سیٹھ صاحب کے کسی دشمن کی یہ کارروائی ہے، اور دو چار لڑکوں نے اُس آدمی کو جس نے نارائن چپراسی کو آکر اطلاع دی تھی، اسکول کی طرف جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ افتخار کا بھائی اگرچہ بال بچوں والا تھا، مگر آخر افتخار کا بھائی تھا۔ اُس نے ہیڈ ماسٹر اور سیٹھ صاحب سے کچھ ایسی چکنی چپڑی باتیں کیں، کہ نارائن کی طرف سے اُن کی بدگمانی دور ہو گئی۔ یہ خبر عام طور پر شہر میں پھیل چکی تھی، اسکول کے طلبا لاکھ رازدار سہی، مگر وہ آخر منچلے چھوکرے تو تھے ہی، اور جب کوئی بھید کی بات، ایک زبان سے نکل کر، دوسرے کے کان تک پہنچتی ہے۔ تو وہ "بھید" نہیں رہتی۔ دوسرا، تیسرے سے کہتا ہے، اور تیسرا چوتھے سے، یہاں تک کہ بہت سے آدمی اُس بھید سے واقف ہو جاتے ہیں، انسان کی فطرت کسی تاکید اور پابندی کو گوارا نہیں کر سکتی، آپ کسی شخص سے کوئی بات کہہ دیں، بہت ممکن ہے وہ اُس بات کا کسی سے ذکر نہ کرے، لیکن اگر آپ اُس سے کہیں گے :-

" بھائی! اس بات کا کسی سے ذکر نہ کرنا، دیکھو!"

" میں صرف تم ہی سے یہ بات کہہ رہا ہوں، کسی کو کانوں"

" کان خبر نہ ہو! ________________"

آپ اُس سے جتنی زیادہ تاکید کرینگے، اُسی قدر، اُس شخص کے پیٹ میں (آپ کی کہی ہوئی بات دوسرے سے کہنے کے لئے) گدگدی ہوگی وہ شخص دوسرے شخص سے کہیگا:۔

" بھئی! دیکھو میں جو تم سے کہہ رہا ہوں اُسکی"

" میرے اور ایک اور شخص کے سوا کسی کو خبر نہیں ہے"

" تم بیکر راز دار دوست ہو، تم سے بھی اس کا ذکر"

" کئے دیتا ہوں، تم کسی سے اس کا خدا کے لئے ذکر نہ"

" کرنا، نہیں تو مجھے اپنے ایک عزیز دوست کے سامنے"

" شرمندہ ہونا پڑیگا ________________"

" وہ شخص جواب دیگا:۔

" ارے بھئی! میں ایسے ہلکے پیٹ کا نہیں ہوں، میرا"

" پیٹ تو کال کوٹھری ہے، جو بات اس میں آگئی"

" پھر نکلنے کا نام ہی نہیں لیتی۔

یہ نمبر ۲ شخص، چوتھے شخص سے قول و قسم لیکر، اس بھید کی خبر دے گا، یہاں تک کہ یہ بھید

"افسانہ" بن جائیگا۔

طلباء میں اس واقعہ کے چرچے ہونے لگے، استادوں کو پہلے اس کا پتہ لگا، اور کچھ دن کے بعد ہیڈ ماسٹر کے کان تک یہ بات پہنچ گئی، ہیڈ ماسٹر آدمی مصلحت شناس تھا، اُس نے اس مردہ واقعہ کو زندہ کرنا مصلحت کے خلاف سمجھا۔ پھر ہیڈ ماسٹر افتخار کی ہر دلعزیزی سے بھی واقف تھا، افتخار کو کوئی سنگین سزا دینے کے یہ معنی تھے کہ تمام طلباء کو برہم کر دیا جائے، اور کوئی ہوشمند ہیڈ ماسٹر طلباء کی عام برہمی کو کبھی دعوت نہیں دیتا۔

اس واقعہ کے کوئی تین مہینہ بعد مدارس کا انسپکٹر معائنہ کرنے کے لئے آیا۔ انسپکٹروں کے ساتھ عام طور پر ڈپٹی انسپکٹر، اسسٹنٹ انسپکٹر، اور چند کلرک ہوا کرتے ہیں، انسپکٹر کے مددگار تو عام طور پر فارسی، عربی اور اردو کی جماعتوں کا معائنہ کرتے ہیں، اور اسکول کے رجسٹروں کا معائنہ کلرکوں کے ذمہ ہوتا ہے۔ انسپکٹر کے کلرک کے سامنے جب اسکول کے کلرک نے طلباء کی حاضری کا رجسٹر پیش کیا، تو ایک دن کے خانہ میں، سُرخ روشنائی سے لکھا ہوا تھا:۔

"پرنسپل کی بیوی کے انتقال کے باعث"

"چھٹی دی گئی ——————"

اس تحریر پر ایک لکیر بھی کھنچی ہوئی تھی، جس نے اس خانہ کو مشکوک بنا دیا تھا،

"یہ خانہ مشکوک کیوں ہے؟" انسپکٹر کے کلرک نے دریافت کیا،

"جی ہاں! کچھ مشکوک ہو گیا ہے" اسکول کے کلرک نے گھبرا کر جواب دیا۔

" مشکوک ہونے کا سبب ہی تو میں دریافت"

" کر رہا ہوں۔ یہ سُرخ تحریر پر نیلی لکیر کس لئے"

" کھینچی گئی ہے " انسپکٹر کے کلرک نے پوچھا،

" کچھ غلطی ہوگئی ہے، غالباً . . . . ہاں! . . . . " اسکول کے کلرک نے بہت زیادہ گھبرا کر جواب دیا۔

" غلطی ہوگئی ہے! خوب کہی! ارے بھائی پرینڈینٹ "

" کی بیوی کا انتقال ہوا، اسکول کو اُس دن "

" تعطیل دی گئی " پھر غلطی کیا ہوئی؟ کیا "

" پرینڈینٹ کی بیوی کا انتقال نہیں ہوا تھا " انسپکٹر کے کلرک نے مزاحیہ انداز میں کہا۔

" جی ہاں! یہی تو غلطی ہوگئی ہے "

" اسکول تو بند رہا تھا۔ مگر پرینڈینٹ کی "

" بیوی کا انتقال نہیں ہوا ——————" اسکول کے کلرک نے رجسٹر کا ورق موڑتے ہوئے جواب دیا۔

انسپکٹر کے کلرک نے تعجب کے ساتھ اسکول کے کلرک کے جواب کو سُنا، اسکول کے کلرک نے تفصیل سنائی، تو انسپکٹر کا کلرک ہنستے ہنستے لوٹ گیا۔ اور یہ اُس کی شرافت تھی۔ کہ انسپکٹر کے نوٹس میں وہ اس واقعہ کو نہ لایا۔

افتخار نے انٹرنس کے امتحان میں آسانی کے ساتھ کامیابی حاصل کرلی، اور وہ کالج میں داخل ہوگیا۔ کالج میں بھی اُس کے مزاج کا یہی عالم تھا، اسکول کے مقابلہ میں اب وہ قدرے سنجیدہ ضرور ہوگیا تھا۔ مگر اسکی مزاحیہ فطرت تبدیل نہیں ہوئی۔ ایف۔اے کا آخری سال تھا، جنوری کے اوائل میں اُسکے چچازاد بھائی ساجد کی شادی تھی، ساجد کے والد اور ساجد کے خسر دونوں متشرع اور قدرے زاہد خشک واقع ہوئے تھے۔ طوایف تو طوایف، وہ لوگ تو معمولی باجے اور گراموفون بجائے جانے پر بھی راضی نہ ہوئے افتخار اس تقریب میں قدرے رومانیت اور رنگینی پیدا کرنا چاہتا تھا۔ اُس نے مشاعرہ کی تجویز دولھا اور دلھن والوں کے سامنے پیش کی، افتخار کی تجویز تھی کہ دلھن کے مکان پر مشاعرہ منعقد کیا جائے اور شہر کے اور باہر کے نہایت ہی مخصوص شعراء کو بلایا جائے کسی طرح مصرع اور عنوان کی پابندی نہ ہو، ہر شاعر اپنے بہترین منتخب کلام سے سامعین کی تواضع کرے، ساجد کے والد تو لوگوں کے کہنے سننے سے نیم راضی سے ہوگئے، مگر ساجد کے خسر نے ارشاد فرمایا:۔

"یہ شاعری تو پرلے درجے کی نحوست ہے، جس مکان"
"میں مشاعرے ہوتے ہیں۔ اور گنجفہ کھیلا جاتا ہے، وہ ویران"
"ہوجاتا ہے، ہمارے محلہ کے چودھری پران ہی مشاعروں"
"کے بدولت تباہی آگئی، میں تو ان شاعروں"
"کو بھانڈ سمجھتا ہوں، اس سے تو اچھا ہے کہ بھانڈوں کو"
"بلالیا جائے، کچھ لطف تو آئیگا ———— "

"اور ہاں! مشاعرہ کرنے سے پہلے پانچ ہزار روپیہ"

"مقدمہ بازی کے لئے رکھ لئے جائیں۔ کیا آپ لوگ قاضی محلہ"

"کے اس مشاعرے کو بھول گئے جس میں ایک شاعر نے"

"دوسرے شاعر کی ران میں چاقو بھونک دیا تھا،"

"صرف اتنی سی بات پر کہ اُس غریب کے ایک شعر کا توارد حملہ کرنیوالے"

"شاعر کے شعر سے ہو گیا تھا۔ وہ شاعر تو مار پیٹ کر الگ ہو گئے"

"اور ساری بلا آئی صاحب مکان پر۔!"

افتخار کو اپنی معتدل اور معقول تجویز کے رد کئے جانے کا افسوس ہوا۔ اور اس کا مزاج انتقام کے لئے آمادہ ہو گیا۔

افتخار منسوڑ اور خوش طبع تھا، مگر آوارہ مزاج نہ تھا، اُس کا کردار مضبوط اور شریفانہ اوصاف کا حامل تھا۔ اُس نے کسی طوائف کے مکان کی صورت بھی نہ دیکھی تھی لیکن اب ضرورتاً (ضروری معلومات حاصل کرنے کے بعد) دو تین دوستوں کو ساتھ لیکر شہر کی مشہور طوائف کے یہاں پہنچا۔ افتخار نے جب پہلی مرتبہ طوائف کے مکان میں قدم رکھا ہے، تو اس کا دل دھک دھک کرنے لگا؛ اُس کے پیر قدرے بوجھل ہو گئے تھے۔ اُس نے قدرے تامل کے بعد دل کو ذرا سخت بنایا اور ہمت کر کے طوائف کے مکان کے صحن میں پہنچ ہی تو گیا۔

طوائفوں کا بناؤ سنگھار مغرب سے کچھ قبل ہوتا ہے۔ کیونکہ چراغوں کے جلتے ہی انکی دکانداری

شروع ہو جاتی ہے۔ شام ہی کو اُن کے مکان سجائے جاتے ہیں۔ قالین، چاندنی، گاؤ تکیہ، اور اُگالدان کی نمائش رات ہی کو ہوتی ہے۔ دن میں جو طوائف آپ کو تیس برس کی معلوم ہوگی، رات میں وہ کچھ اس نوعیت کا لباس پہنے گی۔ کہ آپ اُس کو دیکھ کر محسوس کریں گے۔ کہ چند گھنٹوں میں اُس کا شباب اپنے ماضی کی طرف لوٹ آیا سو وہ آپ کو بیس کے لگ بھگ نظر آئیگی۔ اُس کے سینہ کے تناؤ پر، آپ کی حسن بیں نظریں یہ شعر لکھا ہوا دیکھیں گی:-

ترے شباب کا عالم ارے خدا کی پناہ!

وہ جوش تھا کہ جسے تو بھی خود دبا نہ سکا۔!

اُس کے رخساروں اور ہونٹوں کی مصنوعی سُرخی آپ کو یقیناً دھوکے میں ڈال کر رہیگی۔ پھر وہ اس قدر جھینپ کر، شرما کر، بدن چرا کر، اور نگاہیں جھکا کر بات چیت کرے گی، کہ سچ مچ وہ بہت ہی کمسن ہے۔ اور اُس کے جذبات بے تکلفی سے بڑی حد تک ناآشنا ہیں:

افتخار دن کے دو تین بجے، طوائف کے یہاں پہنچا۔ طوائف کے مکان کے صحن میں کوڑا پڑا ہوا تھا، جسے مرغیاں کرید رہی تھیں، صحن کے ایک کونہ میں باورچی خانہ تھا، جہاں دو تین لونڈے دیگچیوں کو انگلی سے چاٹ رہے تھے۔ صحن کے پورب کی سمت میں ایک بڑا سا دالان تھا، جس میں طوائف میلے کچیلے کپڑے پہنے ہوئے پھٹی سی چاندنی پر لیٹی ہوئی تھی، نائکہ، یعنی طوائف کی ماں، ایک موٹے سے گاؤ تکیہ کے سہارے حقہ پی رہی تھی۔ گاؤ تکیہ کا غلاف بہت زیادہ میلا تھا، نائکہ کے پاجامہ سے بھی زیادہ میلا، دو تین مرد دالان کے ایک کونہ میں لوٹ لگا رہے تھے۔ افتخار اور اُس کے نوجوان

دوستوں کو دیکھ کر نایکہ کی باچھیں کھل گئیں۔

" آداب میاں! آئیے آئیے، تشریف "

" لائیے ۔!

نایکہ نے گاؤ تکیہ کے سہارے اوپر کو اٹھتے ہوئے کہا افتخار اور اُس کے دوست نایکہ کے پاس بیٹھ گئے ۔نایکہ کی بیٹی، نوجوانوں کو دیکھتے ہی وہاں سے اٹھ کر چلی گئی۔ ادھر ادھر کی باتوں کے بعد افتخار نے کہا۔

" میرے بھائی کی کل شادی ہے ۔آپ کے یہاں کے گانے کی "

" بہت تعریف سُنی ہے ۔ہم اسی لئے یہاں آئے ہیں "

نایکہ نے خوش ہو کر جواب دیا:۔

" آپ کی مہربانی ہے، قدر دانی ہے، ہم سے گانا وانا آنا ہی کیا ہے "

" بس آپ لوگ قدر فرماتے ہیں، یہی ہماری تعریف ہے! "

" تھوڑی دیر کے بعد نایکہ نے پاٹ دار آواز سے کہا:۔

" گلنار! اندر کیا کر رہی ہے، دیکھ! یہ میاں تیرا گانا سننے "

" کے لئے آئے ہیں۔ "

گلنار نے اندر سے آواز دی:۔

" ابھی آئی اماں! "

تھوڑی دیر میں گلنار بن سنور کر آ گئی۔ افتخار گلنار کی لُٹی ہوئی جوانی کا عالم ابھی ابھی دیکھ چکا تھا۔ اور اب جو وہ آئی ہے تو شباب و بدمستی کی ایک دُنیا لیکر آئی۔ وہی بے ترتیب اُلجھے ہوئے بال، اس قدر مرتب کہ کاکُل ٹھیک رخسار کے اُبھرے ہوئے حصّہ کی مصنوعی سُرخی کو چھو رہے تھے، دُنبالہ دار آنکھیں بناوٹی حیا کے بار سے جُھکی جاتی تھیں، گلنار نے ان ہی دُنبالہ دار آنکھوں کو اتنا پُرکیف بنا لیا تھا۔ کہ گویا یہ ابھی ابھی تیز شراب کے پے بہ پے بہت سی پیالے پی کر آئی ہے۔ چال میں نزاکت، کپڑے نفیس اور زرق برق، گلنار بناؤ سنگھار کرکے سرتاپا قدم گلنار بن گئی تھی۔ گلنار نے نہایت ادب کے ساتھ آداب کیا، زبان سے نہیں۔ بلکہ اپنی دو حنائی انگلیاں، اُس ماتھے پر رکھ دیں۔ جس پر جگنو جھلمل کر رہا تھا۔ یہی دو انگلیوں کا آداب، تو رنگین مزاج نوجوانوں کو اپنی طرف کھینچتا ہے، اور اسی نقطہ سے تو طوائف کی محبّت کا آغاز ہوتا ہے۔ گلنار نہایت ادب کے ساتھ افتخار کے قریب بیٹھ گئی۔

نائکہ نے گلنار کی طرف پاندان بڑھاتے ہوئے کہا:۔

"میاں کے لئے پان بناؤ!

گلنار نے پان بنانے شروع کئے۔ اور اس عرصہ میں کئی مرتبہ اُس کا دوپٹہ سر سے ڈھلکا اور اُس نے ہر بار ڈھلکے ہوئے ڈوپٹہ سے اپنا سر چُھپایا۔

کتنا پُرفریب ہوتا ہے طوائفوں کا

یہ انداز ——!

گلزار پان بناتی رہی، اور نایکہ صاحبہ گلفشانی فرماتی رہیں :-

" میاں! یہ آپ کی گلزار بڑی ہی بے پروا اور الھڑ ہے، ہفتوں "

" ہوجاتے ہیں۔ اور آنکھوں میں سرمہ تک نہیں لگاتی، میں نے مانا کہ "

" خدا نے اسے رنگ، روپ دیا ہے، مگر صاحب! رنگ، روپ کا "

" رکھ رکھاؤ بھی تو کرنا چاہیئے۔ گلزار کو تیرہ تیزی "

" کے مہینہ سے پندرہواں سال لگیگا۔ بڑی شرمیلی لڑکی ہے، "

" ہم تو اس عمر میں آسمان کے تارے توڑتے تھے۔ "

" اپنی اولاد کسے اچھی نہیں لگتی، میں تو اس کے رخسار "

" کے تل کی عاشق ہوں، میاں! میں جھوٹ تو نہیں کہتی "

" تل نے رخسار کی پھبن کو کتنا بڑھا دیا ہے؟ "

افتخار جواب دینا ہی چاہتا تھا۔ کہ گلزار نے حسبِن وسیک گلوریاں خاصدان میں رکھ کر، افتخار کے سامنے پیش کیں، افتخار نے ایک گلوری اٹھالی، اور خاصدان اپنے دوستوں کے سامنے بڑھا دیا۔

نایکہ نے تھوڑی دیر بعد اشارہ کیا، اور سازندے، ساز کھول کر بیٹھ گئے۔ بڑی دیر تک ساز ملایا جاتا رہا۔ طبلہ اور سارنگی کی ہم آہنگی کے لئے ہتھوڑی کی بہت سی ضربیں طبلہ کو برداشت کرنی پڑتی ہیں۔ ساز مل جانے کے بعد، گلزار نے پہلے ایک ٹھمری گائی۔ اور زت

بھی کی، اُس کی آواز واقعی دلکش تھی، شکل وصورت بھی جاذب نظر تھی، افتخار کے کانوں میں بھی رس پڑنے لگا۔ اس کے بعد گلزار نے دو تین غزلیں گائیں اور اپنے ترکش ناز وادا کے تمام تیر ختم کر دئے،

نیند اُس کی ہے، دماغ اُس کا ہے، راتیں اُس کی ہیں
جس کے بازو پر تری زلفیں پریشاں ہو گئیں

کہہ کر، گلزار نے پہلے افتخار کے بالوں کی طرف حسرت کی نگاہ سے دیکھا، اور پھر اپنے بازو پر نگاہ ڈالی، افتخار کے معصوم جذبات یہ منظر دیکھ کر گھبرا گئے۔

افتخار اور اس کے دوستوں نے گلزار کو خوب داد دی، گلزار نے جھک جھک کر آداب کیا، اب گلزار قدرے بے تکلف ہو گئی تھی،

"ایک رات کے گانے کی فیس کیا ہے، آپ"

"کی" افتخار کے ایک دوست نے نائکہ سے دریافت کیا۔

"میاں جو آپ کی مرضی چاہے، دیدیجئے یہ تو"

"خوشی کا سودا ہے۔ پیچھی عید کے دن کو توال"

"صاحب نے ہمیں بلایا تھا تو ایک رات کے گانے کے"

"سوا سو روپیہ دئے تھے، مگر آپ کے یہاں"

"ہم سو پر جانے کے لئے تیار ہیں، ہمیں تو آپ"

"جیسے قدر دانوں سے معاملہ کرتے ہوئے شرم معلوم"

"ہوتی ہے" نایکہ نے پاندان کے ڈھکنے کو چھوتے ہوئے کہا۔

افتخار اور اُس کے دوست راضی ہو گئے۔ نایکہ نے کہا کہ قاعدہ کے مطابق لکھت پڑھت ہو جانی چاہیئے۔ افتخار نے دس روپیہ کا نوٹ نایکہ کے ہاتھ پر رکھ کر کہا، کہ شریفوں سے ایسی باتیں نہیں کیا کرتے۔ نایکہ خاموش ہو گئی، افتخار نے مکان کا اچھی طرح پتہ سمجھا دیا۔

افتخار کے چچازاد بھائی ساجد کی بارات مغرب کے قریب دلھن کے گھر پہنچ چکی تھی، افتخار بارات میں دلھن کے مکان تک آکر، غائب ہو گیا۔ نایکہ مغرب کے بعد دو تانگوں میں گلزار سازندوں اور دو تین خدمت گار لونڈوں کو لیکر ساجد کے خسر مولوی احمد حسن کے مکان پر پہنچی نائکہ نے پہلے تو بارات کے آدمی کا انتظار کیا، لیکن جب اس نے دیکھا کہ کوئی ادھر آنے کا نام ہی نہیں لیتا۔ تو وہ تانگہ سے اُتری اور گلزار اور سازندوں کو لیکر بارات والے مکان میں رانی ہوئی چلی گئی سب لوگ حیرت کے ساتھ نووارد لوگوں کا مُنہ دیکھنے لگے۔

"ارے تم لوگ یہاں کیسے گھُسے چلے"

"آرہے ہو، کیا شراب پی لی ہے تم نے!" مولوی احمد حسن گرجتی ہوئی آواز میں بولے،

"مولوی صاحب! ہمیں بارات میں گانے کے لیئے"

" بلایا گیا ہے ــــــــــــــــ نایکہ نے جواب دیا۔

" تمہیں بارات میں گانے کے لئے بلایا گیا ہے، توبہ کرو "

" توبہ! اگر آگے قدم بڑھایا۔ تو نوکروں سے تمہارا "

" سر تڑوا دوں گا ــــــــــــــــ " مولوی احمد حسن نے عتاب آمیز لہجہ میں کہا۔

سازندے تو سٹ پٹا گئے، مگر یہ نایکہ حرفوں کی بنی ہوئی تھی، اس نے بیباکی کے ساتھ کہا

" مولوی صاحب! دیکھئے آپ اپنی حد سے آگے بڑھے جا رہے ہیں "

" کسی کو بلا کر اتنا ذلیل کرنا شریف آدمیوں کا شیوہ نہیں "

" آپ کہیں تو میں آپ کی جوتیاں سر پر اٹھا کر "

" رکھ لوں، مگر جس طرح آپ ہم سے پیش آ رہے ہیں، اس کا "

" جواب کچہری دربار کے ذریعے دیا جائے گا۔ انگریزی راج "

" ابھی باقی ہے۔ ہمارے کوتوال صاحب کو خدا سلامت رکھے "

" ایسا انصاف کرتے ہیں کہ دودھ کا دودھ اور پانی کا "

پانی ہو جاتا ہے "

مولوی احمد حسن اور ساجد کے والد آپے سے باہر ہوئے جاتے تھے، کہ ان سب کو مار کر بھگا دو، لوگوں نے جیسے تیسے اُن کو سمجھایا۔ ایک باراتی نے نایکہ سے پوچھا،

" اچھا یہ بتاؤ، تم کو کس نے یہاں آنے کے لئے بیعانہ دیا"

" تھا، اور ہاں! کس کے مکان کا پتہ بتایا تھا "

اس پر نایکہ نے خضاب آلود بالوں کو چھوتے ہوئے جواب دیا:۔

" تین نوجوان میرے یہاں کل آئے تھے، تینوں قریب قریب"

" ایک ہی عمر کے تھے، ہوں گے کوئی بائیس تئیس برس کے لگ بھگ!"

" ایک کا رنگ تو سانولا تھا، اور دو کا رنگ کھلتا ہوا تھا۔ چہرے سے"

" بڑے شریف معلوم ہوتے تھے۔ وہ لوگ! اُن کا نام ہم نے نہ پوچھا اور"

" نہ انہوں نے بتایا۔

" انہوں نے کہا تھا کہ مولوی احمد حسن صاحب جو چنگی کے ممبر ہیں"

" اور سیدوں کے محلوں میں رہتے ہیں، اُن کے گھر بارات جائیگی"

" مکان کا بھی اُن لوگوں نے ہی پتہ بتایا تھا۔ کہ مولوی احمد حسن کے"

" مکان کی گلی میں نل ہے۔ اور مکان کا دروازہ لال"

" پتھر کا بنا ہوا ہے ——————"

نایکہ کی یہ باتیں سُنکر سب ہکا بکا رہ گئے۔ سمجھدار لوگوں نے ساجد کے باپ سے نایکہ کو تیس روپیہ دلوا کر، معاملہ طے کرا دیا۔ نایکہ کو دس روپیہ تو پہلے ہی مل چکے تھے، تیس روپیہ یہ مل گئے۔ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ میں اُس کو ہاتھ پیر ہلائے بغیر چالیس روپیہ کی بانت ہوگئی،

نایکہ خوش خوش اپنے گھر کو سدھاری۔ نوجوان باراتی ہاتھ ملتے رہ گئے۔ ساجد نے ایک گمنام خط ٹائپ کرا کے، مولوی احمد حسن کے پتہ پر بھیج دیا۔ جس میں لکھا تھا:۔

"جو شخص شاعروں کو بھانڈ اور شاعروں کو"

"منحوس بتاتا ہے۔ اس کے گھر قدرت کی طرف سے"

"طوائف بھیجنے کا انتظام کر دیا جاتا ہے"

"عبرت پکڑو، مولوی صاحب! "

اس واقعہ کا بھی شہر میں بہت کچھ چرچا رہا۔ اور طوائفوں کے کوٹھوں پر تو بہت دن تک اس واقعہ کے بیان نے محفلوں کو گرمایا۔

شہر میں ایک ہائی اسکول اور ایک انٹرمیڈیٹ کالج تھا۔ افتخار نے ایف اے کے امتحان میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد تعلیم کو خیرباد کہہ دیا۔ جمشید نگر کہنے کو تو معمولی شہر تھا، مگر بعض امراء اور رؤساء کے شوق کی بدولت شہر میں نل، بجلی اور ٹیلیفون کی سہولتیں مہیا ہو گئی تھیں اور یہ سب کچھ دو تین سال کے عرصہ میں ہوا تھا۔ افتخار نے کالج چھوڑنے کے بعد مختصر نویسی (Short Hand) اور ٹائپ سیکھنا شروع کر دیا۔ افتخار کے ایک قریبی عزیز امپیریل سیکریٹریٹ میں اچھے عہدہ پر تھے، انہوں نے افتخار سے وعدہ کیا تھا۔ کہ مختصر نویسی اور ٹائپ سیکھ کر چلے آؤ میں تم کو کم سے کم ڈیڑھ سو کا نوکر کرا دوں گا۔ افتخار بڑی محنت کے ساتھ مختصر نویسی اور ٹائپ سیکھ رہا تھا۔

افتخار کے ٹاپ اسکول سے قریب ہی ایک رئیس کی کوٹھی تھی، افتخار اسی کوٹھی کے ٹیلیفون سے بات چیت کیا کرتا تھا۔ ایک دن افتخار کسی دوست سے بات چیت کرنے کے لئے کوٹھی میں گیا اُس نے آلہ اٹھا کر کان سے لگایا۔ ایک منٹ کے قریب تک وہ کان سے آلہ لگائے کھڑا رہا۔ مگر ایکسچینج آفس سے کوئی جواب نہ آیا۔ اُس نے بہت کچھ آلہ کے کھٹکے کو ہلایا۔ مگر "صدائے بر نہ خاست" اس نے آلہ کو خفا ہو کر رکھ دیا۔ اور تھوڑی دیر کے بعد پھر آلہ اٹھا کر کان سے لگا لیا اُس کے کان میں "گھر گھر" کی آواز آنے لگی، جو ٹیلیفون کی لائن خراب ہو جانے کے وقت اکثر آیا کرتی ہے۔ وہ آلہ کو رکھنے والا ہی تھا۔ کہ اُس کے کان میں کچھ مبہم آواز آئی۔

"ہلو ہلو، صاف کہو، پوری بات"

"سمجھ میں نہیں آتی ——————" افتخار قدرے متوحش ہو کر بولا۔

"میں شبیر منزل" سے بات کر رہی ہوں،"

"آپ مجھے کہاں بلانا چاہتے ہیں"

"اور ہاں! وقت شام کے پانچ بجے ہی مناسب

رہیگا ——————" دوسرے شخص نے کہا۔

افتخار عورت کی آواز سُنکر قدرے گھبرا گیا۔ اُس نے کچھ دیر تامل کیا، اُس کے بعد ٹیلیفون کے آلہ کے قریب منہ لیجا کر بولا:۔

"راجہ کے ٹیلے کے قریب آپ آج شام کے پانچ"

" نبجے آجائیے، میں وہاں آپ کا انتظار کروں گا "

دوسری طرف سے جواب ملا:۔

" بہت اچھا، خدا حافظ! "

افتخار نے کہنے کو تو کہہ دیا۔ مگر کوٹھی سے چند قدم چلنے کے بعد وہ گھبراہٹ سی محسوس کرنے لگا، وہ دل ہی دل میں کہنے لگا:۔

" نہ معلوم کیا بھید ہے؟ ممکن ہے میرا کوئی دشمن مجھے "

" دھوکا دے رہا ہو۔ میں نے کوئی آباد جگہ کیوں نہ بتائی، "

" راجہ کا ٹیلا تو بڑی سنسان جگہ ہے، اسے! کیا غلطی، "

" ہوگئی، اُس کے ٹیلیفون کا نمبر بھی جلدی میں نہ پوچھ سکا "

" غیر عورت سے تنہائی میں، میں کس طرح بات کروں گا۔ "

" اور کیا معلوم کہ عورت کے پردے میں کون کام کر رہا ہے "

" مجھے اس خطرے سے دور رہنا چاہیئے۔ "

وہ بہت دیر تک کوٹھی کے سامنے کمپنی باغ میں ٹہلتا رہا۔ وہ حیرت و فکر کے عالم میں مستغرق تھا۔ اُس کی زندگی کا یہ پہلا واقعہ تھا۔ وہ بالکل ناتجربہ کار تھا۔ بہت سوچ بچار کے بعد، اُس نے کیلے کے درختوں کے جھرمٹ میں پہنچ کر کہا:۔

" میرا ارادہ نیک اور میری نیت پاک ہے، مجھے کوئی گزند نہیں "

"پہنچ سکتی، میں خطرات کو دعوت تو نہیں دیتا لیکن ہاں
اس راز کا پتہ ضرور لگاؤں گا۔"

راجہ کا ٹیلہ شہر سے کوئی میل بھر کے فاصلہ پر تھا مغلوں کے زمانہ میں اس ٹیلہ پر کوئی راجہ رہتا تھا۔ انقلاب زمانہ کے ہاتھوں راجہ تباہ ہوا اور اس کے خاندان کا نام و نشان تک مٹ گیا۔ اب سے کچھ دن پہلے راجہ کی گڑھی کے کچھ آثار باقی تھے، مگر شہر کے لوگ گڑھی کی دیواروں کی اینٹیں نکال کر لے گئے۔ اب تو صرف ایک سنسان اور اُوجڑ ٹیلا اور گڑھی کی کھدی ہوئی دیواروں کے نشان باقی رہ گئے تھے۔ اس ٹیلے کے آس پاس کھیتی ہوتی تھی۔

افتخار پانچ بجے سے بہت پہلے ٹیلہ کے دامن میں پہنچ گیا۔ انتظار کی گھڑیاں بہت ہی صبر شکن ہوتی ہیں۔ پانچ ابھی نہیں بجے تھے کہ افتخار نہایت بے تابی کے ساتھ کچی سڑک کی طرف دیکھنے لگا اس کے لئے ایک ایک گھڑی ایک مہینہ کے برابر تھی۔ پانچ کے کچھ منٹ بعد کرایہ کی ایک بگھی اس کو آتی ہوئی دکھائی دی، افتخار کی امیدوں میں جان پڑ گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے بگھی آکر ٹیلہ کے دامن میں کھڑی ہوگئی۔ افتخار بھی بگھی کے بہت قریب آکر کھڑا ہوگیا اس نے دیکھا کہ چلمن کو جنبش ہوئی، اور کسی نے اس کی طرف دیکھا چلمن کو مسلسل جنبش ہوتی رہی۔ اور ہر جنبش پر افتخار بگھی کی طرف ایک ایک قدم بڑھنے لگا۔

"آپ کون ہیں؟" چلمن سے آواز آئی۔

"میں وہی ہوں، جس سے آپ نے ٹیلیفون پر بات کی تھی۔" افتخار نے چلمن کی طرف نظر یں

جما کر جواب دیا۔

" آپ تو وہ نہیں معلوم ہوتے ــــــــــــــــ " چلمن سے جواب ملا۔

" میں وہی ہوں، آپ کو مغالطہ کس بات کا ہو رہا ہے "

" میں نے ہی آپ سے راجہ کے ٹیلہ آنے کے لئے "

" کہا تھا ــــــــــــــــ " افتخار نے سنجیدگی کیساتھ کہا۔

بگھی کا دروازہ کھلا، اور ایک حسین دوشیزہ بگھی سے اُتری، نووارد حسینہ اور افتخار دونوں بگھی سے کچھ دور فاصلہ پہ جا کر ٹھہر گئے۔ کھیتوں میں ہریالی لہلہا رہی تھی، چڑیاں بسیرے کے لئے اپنے گھونسلوں کی طرف اڑ کر جا رہی تھیں۔ ہوا خنک اور کیف انگیز تھی، فضائے آسمانی میں بادل کے ہلکے ہلکے ٹکڑے تیر رہے تھے۔ بڑا دلکش اور رومانی سماں تھا۔ اِن ہی دلکشیوں اور جاذبیتوں کے جھرمٹ میں افتخار ایک حسین دوشیزہ کے ساتھ کھڑا ہوا تھا۔ وہ دو تو ساکت تھے۔ بت سے بھی زیادہ ساکت، اجنبیت نے اُن کے لبوں پہ خموشی کی مُہر لگا دی تھی۔ حسینہ کے گیسو ہوا میں ہل رہے تھے، اور وہ بار بار ساڑھی کے پلّو سے سر کو چھپا رہی تھی۔ حسینہ نے بہت غور سے افتخار کے چہرے کو دیکھا۔ افتخار کی سنجیدگی اور متانت سے وہ بےحد متاثر ہوئی۔ نگاہوں ہی نگاہوں میں پیام و سلام ہو رہے تھے۔

" کیا میں آپ کے واقعات دریافت کر سکتا ہوں۔ افتخار نے دریافت کیا۔

" میرے واقعات ــــ آہ! " یہ کہہ کر حسینہ کی آواز رُک گئی جیسے کوئی چیز اُس کے گلے

ہیں اٹک گئی تھی، وہ کہنے کی کوشش کر رہی تھی، مگر اُس کی قوتِ گویائی پر جذبات کا بے تحاشہ غلبہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔ اُس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو گرنے لگے، اُس کے ہونٹوں پر کپکپی طاری ہوگئی، اور وہ آواز کے ساتھ رونے لگی، دوشیزہ کا شباب اور اُس پر اس قدر بلک بلک کر رونا، افتخار کانپ اُٹھا۔ افتخار کی آنکھیں کسی بے اختیار جذبہ کے ماتحت نمناک ہوگئیں، اُس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا:۔

" خاتون! وقت بہت کم ہے، اور ہم جہاں کھڑے ہوئے "

" ہیں، یہ جگہ کوئی پردہ کی جگہ بھی نہیں ہے، خدا کے لئے "

" اپنی داستان جلد سنایئے۔ آپ کی حالت "

" دیکھ کر میری حالت بھی غیر ہوئی جاتی ہے "

" افتخار کے ان جملوں سے دوشیزہ کے دل کو ڈھارس ہوئی، اُس نے ساری کے پلوّ سے آنکھوں کو پونچھا۔ اور تھوڑی دیر تامل کے بعد (یہاں تک کہ وہ کچھ کہنے کے قابل ہوگئی) کہنا شروع کیا

" مہربان نوجوان! میری داستان اگرچہ بہت دردناک ہے، "

" مگر زیادہ طویل نہیں ہے۔ آپ کو میں بہت دیر تک یہاں کھڑے "

" رہنے کی زحمت نہ دوں گی۔

" میرے بھائی یہاں وکالت کا پیشہ کرتے ہیں۔ اُن کے ایک "

" دوست جو ہمارے یہاں اکثر آتے جاتے رہتے "

" ہیں۔ اُن سے ہی پردے سے گفتگو کر لیا کرتی ہوں"

" میں تو ایک غیر مرد سے اس طرح گفتگو کرنا پسند نہیں کرتی، مگر"

" بھائی جان نے فرمایا کہ میرے بے تکلف دوستوں سے"

" تمہارے بات چیت کرنے میں کچھ ہرج نہیں ہے۔ ایک دن"

" بھائی جان کی عدم موجودگی میں، اس شخص نے مجھے پردے کے قریب"

" بلایا اور کہا کہ شہر میں زنانہ نمائش ہو رہی ہے، عورتوں کی"

" دستکاری اور خطاطی کے نمونے مانگے گئے ہیں، تمہارا خط"

" بہت اچھا ہے۔ تم ایک، آدھ صفحہ ہاتھ"

" روک کر لکھ دو۔ میں اُسے نمائش میں جا کر رکھوا دوں گا، اور"

" رکھوا کیا دوں گا، بلکہ انعام دلا دوں گا، نمائش کے منتظمین سے"

" میرے تعلقات ہیں۔

" میں نے کہا کہ میرا خط زیادہ اچھا تو نہیں ہے، لیکن آپ کہتے ہیں"

" تو میں لکھنے کے لئے تیار ہوں، مگر آپ ہی بتائیں کہ میں کیا"

" عبارت لکھوں؟ اس پر اُس نے اپنی جیب سے ایک پرزہ"

" نکال کر مجھے دیا کہ اسے نقل کر دو، میں نے چلمن کی"

" آڑ سے اُس کے ہاتھ سے پرچہ لیا۔ اور بے خیالی میں"

" اس کے دئے ہوئے پرچے کی نقل کردی، اور پھر اُس کے کہنے پر"
" اپنا لکھا ہوا پرچہ اور اُس کا دیا ہوا پرچہ، دونوں کے"
" دونوں واپس کردئے، اس واقعہ کے کوئی تین چار"
" دن کے بعد بھائی جان کی عدم موجودگی میں وہ شخص"
" پھر آیا۔ اور مجھ سے کچھ ایسی باتیں کیں۔ جو اس سے قبل"
" میرے کانوں نے سنی بھی نہ تھیں، میں نے اُس کو نہایت"
" سختی کے ساتھ ڈانٹا۔ وہ میری ڈانٹ پی کر خاموش ہو کر"
" چلا گیا، اور کئی دن کے بعد اُس نے مجھے ایک خط لکھا جس"
" کا مضمون یہ تھا:۔
" تم مجھے محبت بھرا خط لکھ چکی ہو، تم نے ہی پہلے"
" اقدام کیا ہے۔ یاد رکھو اگر میں نے تمہارا پرچہ کسی کو،"
" دکھا دیا۔ تو تمہاری اتنی رسوائی ہوگی کہ تمہارا اور تمہارے"
" ساتھ تمہارے بھائی کا مستقبل تباہ ہو جائے گا" "
" اس خط کو پڑھ کر مجھے پسینہ آگیا، میں نے جب اپنے حافظہ پر زور"
" ڈال کر اُس کے دئے ہوئے پرچہ کے مضمون کو سوچا، تو"
" وہ واقعی ایک ایسا خط تھا، جس میں میری طرف سے محبت"
کا اظہار تھا۔ میرے پیروں تلے سے زمین نکل گئی"

" مجھے اپنی رسوائی سے زیادہ بھائی کی رسوائی کا خیال تھا،"

" اُس شخص نے دو تین خط اور بھیجے، اور اُس کا آخری "

" خط یہ ہے۔ جو میں آپ کو ابھی دکھا چکی ہوں۔ "

" میرے خیال میں ٹیلیفون کی خرابی کے باعث، اُس "

" شخص کے بجائے آپ سے میری بات چیت ہو گئی "

" قدرت کی نہ معلوم اس میں کونسی مصلحت "

" پنہاں ہے؟ "

اس داستان کے سنانے کے بعد، دوشیزہ کی آنکھوں سے گرم گرم آنسو ٹپکنے لگے، اُس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اپنی جیب سے پرچہ نکال کر، افتخار کو دیا۔ اس پرچہ میں لکھا تھا:۔

" میں تم سے تنہائی میں بات چیت کرنا چاہتا ہوں۔ اُس کے بعد تم کو میرا "

" اصل مقصد معلوم ہو گا، میں تم سے ٹیلیفون کے ذریعہ وقت اور مقام کے تعین کے "

" متعلق گفتگو کروں گا۔ تم وہاں آجانا "

" دیکھو! اگر تم نہ آئیں، تو پھر تمہارے خط کو میں لوگوں پر "

" ظاہر کر دوں گا، یہ میرا قطعی اور آخری فیصلہ ہے۔ میں "

" پھر کہتا ہوں کہ تم میری بات کو مذاق سمجھ کر ٹال نہ جانا۔ میں تمہارے "

" خط کو اخباروں میں شائع کرا دوں گا۔ جانتی ہو کہ اس "

"تشہیر کا کیا اثر پڑے گا، تم پر اور تمہارے بھائی کی شہرت"

"پر ——— ! ——— "

افتخار نے خط کو پڑھنے کے بعد کہا۔

"خاتون! آپ قطعاً متفکر اور ملول نہ ہوں۔ جس شخص کی تحریر آپ نے مجھے"

"دکھائی ہے، میں اس سے اچھی طرح واقف ہوں، آپ اس کے تمام خطوط احتیاط سے"

"رکھئے، میں اس بدمعاش اور ناپاک فطرت کی سازشوں سے خود"

"ہی نبٹ لوں گا۔ مجھے سب کچھ معلوم ہے کہ ایسے لوگوں کو کس طرح زیر"

"کیا جاتا ہے، آپ بے گناہ اور نیک نیت ہیں، آپ کے ننگ و ناموس پر کوئی حرف"

"نہیں آسکتا۔ اس نامعقول نے جو گڑھا آپ کے گرانے کے لئے کھودا ہے۔ اس"

"میں وہ خود گر کر تباہ ہو جائے گا۔

"آپ خدا کا نام لیکر بگھی میں سوار ہو جیئے، ہم کو یہاں بہت دیر تنہا کھڑے ہوئے"

"ہو گئی ہے، میں پھر کہتا ہوں کہ آپ بالکل مطمئن رہیں ——— ! "

حسین دوشیزہ، افتخار کا شکریہ ادا کرنے کے بعد بگھی میں سوار ہوئی۔ اس نے چلتے وقت افتخار سے وہ ہاتھ ملایا، جو نرم و گداز ہونے کے ساتھ بہت زیادہ گرم بھی تھا۔ افتخار، خاتون کی منت اور اس کی بے پناہ خوبصورتی سے متاثر ہو چکا تھا۔ وہ گھر کو واپس ہوا۔ اور اپنے سینہ میں اضطراب کا ایک آتش کدہ لیکر واپس ہوا ——— اس واقعہ کے دو سال بعد افتخار امپیریل سیکرٹیریٹ

میں ملازم ہو گیا۔ اور گرمیوں کی تعطیلات میں اُس کو اسی خاتون کے ساتھ کشمیر جاتے ہوئے دیکھا گیا۔ خاتون کے سوٹ کیس پر "بیگم افتخار" لکھا ہوا تھا۔

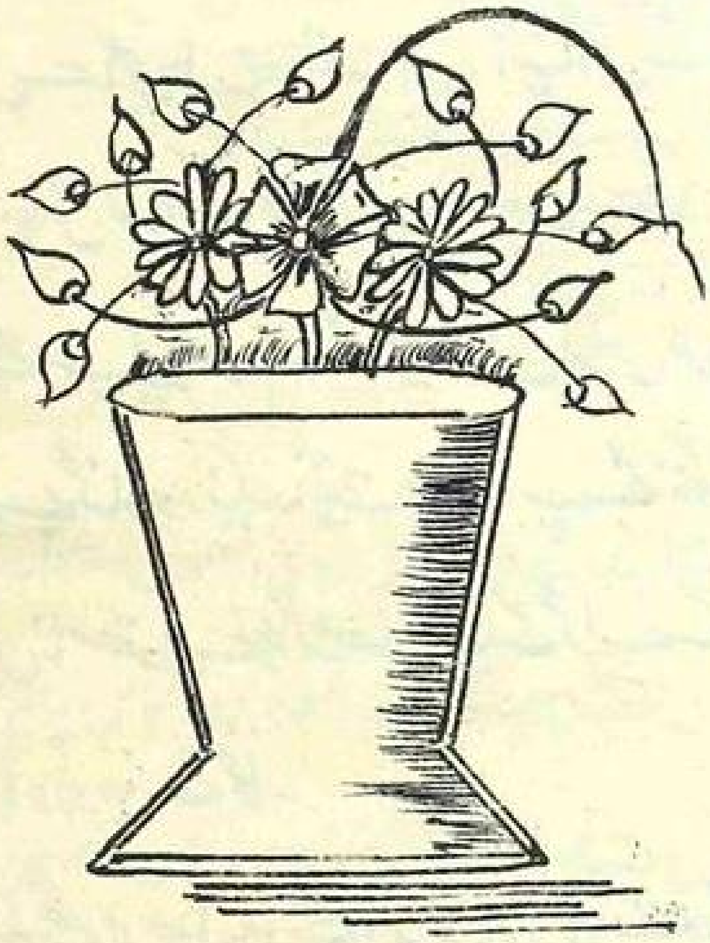

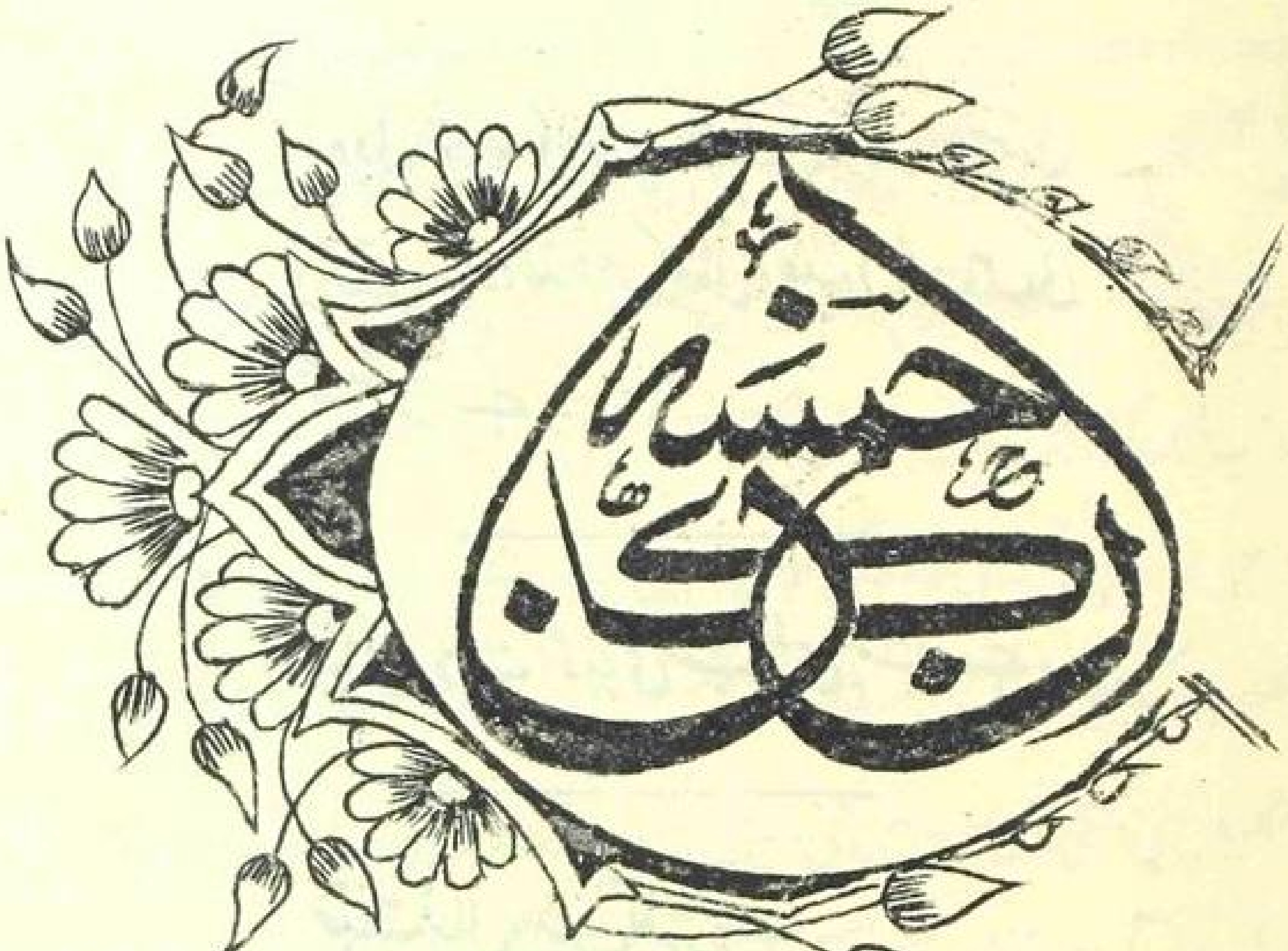

زندہ دلی، شراب کی موجوں، پھول کی پتیوں اور سورج
کی کرنوں سے اخذ نہیں کی جاتی، بلکہ دل خود اس کی
تخلیق کرتا ہے۔

ہم خیال دوست، دُنیا کی سب سے بڑی نعمت ہے۔

جدتِ خیال، بہترین تفریح ہے۔

ارکانِ خمسہ

ہم خیال مخلص دوستوں کی یکجائی دُنیا کی سب سے بڑی مسرت ہے۔ مگر اس سرد مہر اور غرض پرست دُنیا میں خلوص تو بڑی چیز ہے، خلوص کی پرچھائیاں بھی مشکل ہی سے نظر آتی ہیں، جس دُنیا میں دوستی اغراض کے تحت کی جاتی ہو، جہاں ہوس کا نام محبت اور منافقت کا نام اخلاص ہو، وہاں خلوص و وفا کی تلاش، ایسی ہے، جیسے کوئی پتھروں اور سنگ ریزوں کے ڈھیر میں گلاب کے پھولوں کے ڈھونڈنے کی کوشش کرے، ڈھونڈنے والے کو پھول تو کیا ملیں گے اُس کی انگلیاں ہی الٹی زخمی ہو جائیں گی۔ اہلِ دل نے اگرچہ دُنیا کی سرد مہری اور بیوفائی کا ہمیشہ دکھڑا رویا ہے۔ مگر اس تہذیب و تمدّن کے زمانہ میں خلوص و محبت کا جیسا قحط ہوا ہے ایسے انسانیت سوز قحط سے دُنیا کو کبھی واسطہ نہیں پڑا۔ اور یہ سب "سیاستِ جدیدہ" کی مہربانی ہے۔ یہ تمدّن کی بوقلمونیاں اور سیاست کی رنگ آرائیاں، منافقت اور تکلفات کی تبلیغ کرتی ہیں۔ تمدن و عمرانیت کا چمن لہلہا رہا ہے۔ اور اخلاق و محبت کی کھیتی سوکھ رہی ہے۔

کتنی دردناک ہیں یہ تفصیلات!

عوام کے خطوط کو اٹھا کر دیکھو، تو اُن خطوط میں تم کو "مخلص نواز، آپ کا سچا دوست،"

صرف آپ کا "وغیرہ الفاظ لکھے ہوئے ملیں گے، ان خطوط کو پڑھکر ایسا محسوس ہوگا۔ کہ خط کے لکھنے والوں نے اپنے دلوں کی دھڑکن کو لفافوں میں بند کر دیا ہے۔ اور محبت کے مارے ان لوگوں کے سینے شق ہوئے جاتے ہیں۔ مگر جب تم ان "مخلص اور فدائی دوستوں" کے تعلقات کی ٹوہ لگاؤ گے، تو پتہ چلیگا کہ خلوص و محبت کا یہ سارا کارخانہ فریب و ریاکاری کا ایک طلسم تھا۔

تمہارا دوست چھاتی پر ہاتھ مار کر کہیگا:۔

"بھائی! جہاں تمہارا پسینہ گریگا، وہاں میں"

"اپنا خون بہادوں گا۔"

مگر تم دیکھو گے کہ تمہارے جسم سے خون کے فوارے جاری ہوں گے۔ اور تمہارا "فدائی دوست" تم کو دیکھ کر، آنکھ بچا کر نکل جائیگا۔ اس خیال سے کہ کہیں اس کی دو پیسہ کی دستی، تمہاری تیمارداری کی نذر ہو کر، لہو میں تر بتر نہ ہو جائے۔ خدانخواستہ تمہارا گھر جلتا ہوگا۔ تو تمہارا یہی دوست آگ بجھانے کیلئے نہیں، تاپنے کے لئے آئے گا، اور اس کی نظریں اس دردناک منظر کے طویل سے طویل ہونیکی آرزو کریں گی۔ لوگ مزدور اور سرمایہ دار کی بحث میں الجھے ہوئے ہیں اور میں کہتا ہوں:۔

"کہ دنیا کو صرف محبت کے پیام کی ضرورت"

"ہے۔"

دنیا میں محبت ہی "مساوات" کا تخیل پیدا کر سکتی ہے۔ دنیا میں امن و آشتی پھیلانا

چاہتے ہو، تو دُنیا کو محبت کا درس دو، ایسا درس ——— کہ مزدور کے پسینہ کو دیکھ کر سرمایہ دار کی آنکھیں ڈبڈبانے لگیں۔ مگر جس تہذیب و معاشرت کا یہ نصب العین ہو کہ:۔

"ضرورت، ایجاد کی ماں ہے"

وہاں محبت و خلوص کے اس "پرانے راگ" کو سننے کی کسے فرصت ہے!

مگر فرحتی، اسلم، تنویر، سدرشن اور جمشید کی دوستی نے دُنیا پر ظاہر کر دیا کہ اس سرد مہر اور بے وفا دور میں بھی خلوص و محبت کے نقوش پائے جاتے ہیں۔ اور اس گئے گذرے زمانہ میں بھی مخلص دوست ناپید نہیں ہیں یہ پانچوں دوست شہر میں "ارکان خمسہ" کے نام سے مشہور تھے، اور ان کی دوستی نے ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ ان پانچوں میں تین مسلمان تھے، ایک ہندو اور ایک پارسی، اور یہ سب کے سب اپنے مذہب میں پکے تھے، مگر کسی نے ان کو مذہبی بحثوں میں اُلجھتے نہیں دیکھا۔ اُن کے دائرۂ محبت میں مذہبی اختلافات کی مطلق گنجائش نہ تھی۔ ان پانچوں کے ارتباط نے ایک ایسی دُنیا بنائی تھی، جہاں خلوص کے چشمے اُبلتے، محبت کے پھول کھلتے۔ اور دلچسپیوں کے چراغ جلتے تھے۔ یہ لوگ دوست تھے، ایسے دوست جو صرف "دوستی" کے لئے ایک دُوسرے کے دوست ہوں۔

یہ پانچوں دوست ایک دوسرے کے مذہبی تہواروں میں شریک ہوتے، اور آپس میں اس ہمدردی کے ساتھ پیش آتے، کہ سگے بھائی بھی اس سے زیادہ ہمدردی نہیں کر سکتے۔ فارسی میں "یک جان دو قالب" کی مثل بہت مشہور ہے۔ مگر یہاں تو پانچ قالبوں میں ایک ہی رُوح کارفرما

تھی۔ دوست کاہے کو تھے۔ خلوص و محبت کی زندہ مورتیں تھیں۔

تمنّا پاک، دل معصوم، فطرت کس قدر سادہ!

محبت سادگی ہی سادگی معلوم ہوتی ہے۔

اس شعر کی معنویت سے شاید قدرت نے اِن پانچوں کی فطرت بنائی تھی ---!

ان پانچوں دوستوں میں سے تین تو کالج کی ایک ہی جماعت میں پڑھتے تھے، اسلم ریلوے میں ملازم تھا۔ اور جمشید اپنے باپ کی نگرانی میں تجارت کا کاروبار کرتا تھا۔ ان لوگوں کو شعر و ادب سے بھی دلچسپی تھی۔ ہفتہ میں ایک دن یہ لوگ ایک جگہ جمع ہوتے، اور کسی ایک موضوع پر تقریریں ہوتیں اور مقالے پڑھے جاتے۔ یہ ادبی انجمن صرف ان ہی پانچ ارکان پر مشتمل تھی، رفیق اور سدرشن کو شعر گوئی کا بھی شوق تھا۔ ان کے تازہ ترین افکار انجمن کو اور زیادہ دلچسپ اور رنگین بنا دیا کرتے تھے۔ سدرشن کی آواز بہت سریلی تھی، وہ جو کسی نے کہا ہے کہ:۔

"تصنیف را مصنف نیکو کند بیان!"

سدرشن کے اشعار پر یہ مثل صادق آتی تھی۔ ایک مرتبہ کسی شدید ضرورت کے باعث سدرشن، انجمن کے جلسہ میں شریک نہ ہو سکا۔ اُس نے اپنی غزل بھیج دی۔ جسے رفیق نے پڑھ کر سنائی، جب رفیق غزل سُنا چکا تھا تو جمشید نے مسکرا کر کہا:۔

"بھائی رفیق! خوب گھانس کاٹتے ہو،

"اے سبحان اللہ!

اس پر تمام دوستوں نے قہقہہ لگایا۔ دوسرے جلسے میں سدرشن کی زبان سے وہی غزل سُنی گئی اور جمشید نے آخر میں کہہ دیا:۔

"آج معلوم ہوا کہ گھانس کاٹنے اور پھول برسانے"

"میں کیا فرق ہے؟"

اس پر فیض ہنستے ہوئے بولا:۔

"میری بجائے اگر تم غزل پڑھتے ہو، تو تم کو یہ بھی معلوم"

"ہو جاتا کہ پھٹے بانس کی آواز، اور بلبل نزنگ کے"

"نغمہ میں کیا فرق ہے"

سب دوست ہنسنے لگے۔

برسات کی رت تھی، آسمان پر کالی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں، زمین ہریالی کے زمردیں خزانے اُگل رہی تھی، اسی زمانہ میں "ارکان خمسہ" کی انجمن کا ایک اجلاس منعقد ہوا۔ تقریبوں اور مقالوں کے بعد، سدرشن نے ایک تجویز پیش کی:۔

"دوستو! بالکل ایک نئی بات میرے ذہن میں آئی ہے"

"بڑی دلچسپ تجویز ہے، تم لوگ سنتے ہی تڑپ جاؤ گے۔ ایسی"

"تجویز تم نے آج تک نہ سنی ہوگی، تم لوگوں کو میرے ذہن کی"

"اُپج کی داد دینی پڑے گی۔"

(ارے سدرشن! بھئی اپنی تعریف میں کب تک قصیدہ پڑھے
جاؤ گے، اصل تجویز تو بیان کرو۔)

[ایک دوست نے بیچ میں ٹوکتے
ہوئے کہا]

"صبر سے کام لیجئے جمشید جی"! سدرشن نے ہنستے ہوئے
جواب دیا اور پھر بولنا شروع کر دیا:-

"ہم کو اپنی دلچسپیوں کا موضوع بدلنا چاہیئے، تبدیلِ موضوع کی صورت"
"یہ ہے کہ ہم پانچوں میں سے ہر شخص شکل ولباس، طرزِ معاشرت و"
"گفتار، یا کسی اور مناسب طریقہ کی تبدیلی کے ساتھ، ایک دلچسپ"
"مزاح کا سامان پیدا کرے، آپ اس دلچسپ مزاح کو "دھوکے میں"
"ڈالنا" بھی کہہ سکتے ہیں۔ مگر یہ "دھوکا" "با مزاح" کوئی "
"سازش یا فریب نہیں ہے۔ یہ تو صرف ایک تفریح ہے۔"
"آیندہ اجلاس میں ہر شخص اپنے مزاح کی تفصیلات بیان کرے"
"بہترین تفصیل پیش کرنے والے کی خدمت میں، میری طرف سے "کوئی"
"ناچیز ھدیہ گذارنا جائے گا۔ وہ ہدیہ کیا ہوگا؟ اسے میں ابھی ظاہر"
"کرنا نہیں چاہتا۔

تمام دوستوں نے اس تجویز سے اتفاق کیا، سدرشن کو خوب داد ملی۔ اور اجلاس برخاست ہو گیا۔

عورت کے بھیس میں

رفیق، پانچوں دوستوں میں سب سے زیادہ کمسن تھا، اُس کی عمر مشکل سے سترہ سال کی ہوگی۔ اُس کا نقشہ بہت ہی باریک تھا، رنگ سُرخ سپید، قد متوسط، اُس کی چال ڈھال میں قدرے نسائیت بھی پائی جاتی تھی۔ اسکول کے زمانہ میں رفیق کو ڈراموں میں ہمیشہ زنانہ پارٹ دیا گیا۔ وہ زنانہ پارٹ اس خوبصورتی کے ساتھ ادا کرتا تھا۔ کہ دیکھنے والے "عش عش" کرتے تھے۔

نئے لوگوں کو تو اکثر دھوکا ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ ایک ڈرامہ میں رفیق کو طوائف کا پارٹ دیا گیا اس ڈرامہ میں شہر کے بہت سے مالدار اور معزز لوگوں کو بھی بلایا گیا تھا۔ رفیق کے ناز و انداز کو دیکھ کر ایک صاحب تو ایسے لوٹ ہوئے کہ شہر کی طوائفوں کے تمام بالاخانوں کو چھان مارا۔ مگر ڈرامہ والی طوائف کا کہیں پتہ نہ چلا۔ رفیق کے لئے، سدرشن کی تجویز کے مطابق "پُر فریب مزاح" کچھ مشکل نہ تھا۔ اُس نے ایک دن ڈاڑھی، مونچھ اس طرح صاف کرائی۔ کہ اُس کی جلد دمکنے لگی، دیکھنے والے کو ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ جیسے اس کے چہرے پر کبھی بال ہی نہیں اُگے۔ رفیق کو زنانہ کپڑے پہننے کی تو پہلے ہی سے مشق تھی، اس مرتبہ اُس نے خاص اہتمام کے ساتھ زنانہ لباس پہنا۔ پیروں میں اونچی ایڑی کا جوتا، ہاتھوں میں ہلکی ہلکی چوڑیاں، ماتھے پر قشقہ، غرض اس تمام اہتمام کے بعد جب رفیق نے اپنا منہ قدِ آدم آئینہ میں دیکھا ہے، تو اُسے خود ہنسی آگئی، وہ اپنے عکس سے خود ہی مخاطب ہو کر بولا۔

"آداب عرض ہے رفیقہ خاتون!"

رفیق نے اپنے کو لباس پہنکر بہت کچھ "زنانہ" بنا لیا تھا۔ مگر عورت اور مرد کے چہرے میں بناوٹ کے بعد بھی فرق باقی رہ جاتا ہے۔ اس فرق کے چھپانے کے لئے اُس نے ساری کے اُوپر چکن کی ایک چادر اس طرح اوڑھی کہ شریف ہندو عورتوں کی مانند، اُس کے چہرے پر خود بخود گھونگھٹ نکل آیا۔ اُس نے اپنے خوبصورت اور سبک ہینڈ بیگ میں، شیروانی، ٹوپی اور ایک جوڑی کپڑا رکھا اور اسٹیشن روانہ ہوگیا۔ اُس نے اسٹیشن پہنچکر، قلی کی معرفت، قریبی جنکشن کے لئے انٹر کلاس کا ٹکٹ منگایا۔ رفیق، بالکل عورت کے انداز میں چلتے ہوئے پلیٹ فارم پر پہنچا۔ اُس نے کن انکھیوں سے دیکھا۔ کہ مسافر اُسے بری طرح گھور رہے ہیں اور جدھر سے وہ گذر جاتا ہے، لوگوں کی آنکھیں فرش راہ بنجاتی ہیں رفیق کے کانوں نے کتنے دلچسپ فقرے سُنے:۔

"عورت کیا ہے، پری ہے پری۔"

"اس شہر کے کالبتہ گھرانے کی عورتیں بہت خوبصورت ہیں"

"کمر کی لچک پھولوں کی ڈالی کو شرماتی ہے۔"

"ظالم نے لباس بھی کتنا موزوں پہنا ہے۔"

"تنہا سفر کر رہی ہے، بڑی آزاد ہے یہ عورت!"

"ارے! پریم! تو نے اس کے ماتھے کے ٹیکے کو بھی دیکھا، آہا، اہاہا!"

"بس! ایسی عورت مل جائے، تو یہی دنیا جنت بن جائے"

"بھائی! یہ عورت بڑی چلتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔"

"ارے محمود! تو نے یہ بھی دیکھا کہ اس عورت نے میری طرف کن انکھیوں سے"

"دیکھا تھا، اور کچھ دیر مجھے دیکھ کر رُکی بھی تھی۔"

رفیق ان دلچسپ فقروں کے مزے لیتا ہوا، زنانہ درجہ کے انٹر کلاس ویٹنگ روم میں بیٹھ گیا۔ وہ بالکل دروازے کے قریب آرام کرسی پہ بیٹھا۔ دروازے کا ایک پٹ اُس نے گذرنے والوں کے دیکھنے کے لئے کھول دیا تھا۔ ایک ہندو نوجوان نے اس کمرے کے سامنے چکر لگانا شروع کئے رفیق اس انداز کے ساتھ بیٹھا رہا۔ گویا کہ نوجوان کے وہاں سے آنے جانے میں وہ دلچسپی لے رہا ہے۔ اس نوجوان نے بیشمار چکر لگا ڈالے، وہ کبھی ویٹنگ روم کے سامنے آکر سر سے ٹوپی اتار کر اپنے سنورے ہوئے بالوں کو دکھاتا۔ کبھی سگرٹ کیس سے سگرٹ نکال کر سگرٹ سلگاتا۔ کبھی کلائی کی گھڑی کو دیکھ کر کہتا۔

"آج گاڑی لیٹ ہے۔"

"مجھے گھر پہنچنے میں دیر ہوگئی تو ہزاروں کا نقصان"

"ہو جائے گا۔"

"اس لائن پر یہی رونا رہتا ہے"

کبھی دروازے کے قریب آکر سیٹی بجاتا اور کبھی اشعار گنگناتا۔ اشارے کرنیکی تو اُس کی ہمت نہ پڑتی تھی لیکن اپنی چال، ڈھال، حرکات وسکنات کے ذریعہ وہ پیام دے رہا تھا کہ

"نیاز مند عشاق کی فہرست میں میرا بھی نام لکھ لیجئے"

آجکل کے بہت سے نوجوانوں نے اسی "عارضی ہوسناکی" کا نام "محبت ناگہاں" رکھا ہے اور نفس کے اس فریب کو وہ "عشق و محبت" سے تعبیر کرتے ہیں۔ کسی حسین چہرے پر ایک نظر پڑ گئی، بس پھر کیا ہے۔ ان کا دل پہلو سے نکل ہی تو گیا، اب یہ دل و جان فدا کرنے کے لئے تیار ہیں، لب پر آہ و فریاد ہے، اور سینہ میں اضطراب کا ہیجان۔ لیکن اگر اُس "حسین" پر جو ان کی اصطلاح میں ان کا "معشوق" ہے۔ کوئی بپتا آ کر پڑ جائے، تو یہی دل و جان فدا کرنے والے عشاق، اس طرح دُم دبا کر بھاگیں کہ ان کا معشوق کہے:۔ "ٹھہرو" اور یہ ہاتھ جوڑ کر عرض کریں۔

Anjuman-e-Tarqqi-e-Urdu (India)
انجمن ترقی اردو (ھند)

"معاف فرمایئے!"

شاعر کا فیصلہ یہ ہے کہ:۔

"پہلو میں کسی شخص کے دو دل نہیں ہوتے"

اور یہ عشاق ایک گھنٹہ میں سو حسینوں پر عاشق ہو سکتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے۔ کہ بیسویں صدی عیسوی کے عاشقوں کو قدرت کی طرف سے بیشمار دل عطا کئے جاتے ہیں، جب ہی تو یہ خدا کے بندے اتنی جلد جلد عاشق ہوتے رہتے ہیں۔

اس ہمارے نوجوان کا بھی ایسے ہی عشاق میں شمار تھا، لیکن اس کو کیا کیا جائے۔ کہ اسٹیشن پر اُس وقت "رفیق" کے سوا، کوئی جاذبِ نظر چہرہ موجود ہی نہ تھا، اس لئے نوجوان کی تمناؤں کا مرکز انٹر کلاس ویٹنگ روم ہی بنا ہوا تھا، کچھ دیر کے بعد گھنٹی بجی، اور گاڑی آگئی،

رفیق اپنا ہلکا پھلکا ہینڈ بیگ لیکر انٹر کلاس کے مردانہ ڈبہ میں بیٹھ گیا، نوجوان کی خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی اُس کے پاس بھی صرف ایک سوٹ کیس تھا، اُس نے قلی کے آنے کا انتظار بھی نہ کیا، سوٹ کیس کو خود ہی اُٹھا کر، انٹر کلاس کے ڈبہ میں جا پہنچا۔ اتفاق کی بات کہ اسٹیشن سے کوئی اور مسافر اُس ڈبہ میں سوار نہ ہوا۔ نوجوان بہت خوش تھا۔ کہ قدرت کی طرف اُس کے لئے خود بخود حسبِ خواہش انتظامات ہوتے چلے جا رہے ہیں یعنی اوّل تو عورت زنانہ ڈبہ کے بجائے مردانہ ڈبہ میں بیٹھی، اور اس پر لطف یہ کہ کوئی اور مسافر سوار نہ ہوا۔ ایسی "خلوتیں" بڑی قسمت والوں کو میسر آتی ہیں۔

رفیق ایک کونہ میں سمٹ کر بیٹھ گیا، ایک شریف لڑکی کی طرح، نوجوان کچھ دیر تک تو اُس کی طرف دیکھتا رہا۔ لیکن حسین عورت کی خلوت کے تصور نے اُسے کونہ کی طرف کھینچ ہی لیا۔ وہ رفیق کے قریب کی نشست پر آکر بیٹھ گیا۔ رفیق کھڑکی کی طرف دیکھنے لگا۔ نوجوان کی آتشِ شوق کو تیز کرنے کے لئے! نوجوان کی نگاہیں اپنا کام کر رہی تھیں، رفیق کے لباس کی ایک ایک شکن پر نوجوان کی نظر تھی، وہ بے تاب ہوا جاتا تھا، اُس کے نتھنوں سے گرم گرم سانس نکل رہی تھی، یہ سب کچھ تھا۔ مگر بات کرنے کی اُس میں ہمت نہ تھی۔ رفیق نے اتنے میں نوجوان کی طرف گھونگھٹ کا ایک حصّہ اٹھا کر دیکھا، رفیق کا اتنا التفات، نوجوان کے "سمندِ عشق" کے لئے تازیانہ ہو گیا، اب اس میں ہمت پیدا ہو چکی تھی۔

"آپ کہاں جا رہی ہیں، کہاں سے آ رہی"

"ہیں۔۔۔۔۔۔۔ ـــــــ" نوجوان ایک ایک لفظ پر رکتے ہوئے بولا

رفیق نے اس کا جواب نہ دیا۔ اور وہ بالکل خاموش بیٹھا رہا۔

"کیا آپ بیجا پور جا رہی ہیں ۔۔؟" نوجوان نے قدرے تامل کے بعد پوچھا۔

رفیق نے اس پر سر ہلا دیا۔ رفیق کا سر ہلانا تھا کہ نوجوان بے قابو سا ہو گیا۔ اُس نے بے اختیاری کے عالم میں رفیق کے کپڑوں کو چھونا چاہا۔

"دور سے باتیں کرو۔ یہ چھیڑ چھاڑ"

"ابھی نہیں ——————" رفیق ذرا سنبھل کر بولا۔

"میں چھیڑ چھاڑ کرنے کی تو ہمت ہی نہیں کر سکتا، آپ"

"ذرا آپ نام بتا دیں گی ——————" نوجوان نے قدرے گھبرا کر کہا۔

"میرا نام لکشمی ہے، بس اب تو مت ہا یا کہنا"

"کہہ دیا ——————" رفیق دبی زبان سے بولا۔

"لکشمی! آہ! کتنا دلکش نام ہے" اور ہاں! یہ"

"عجیب اتفاق ہے کہ میرا نام دولت سنگھ ہے، دولت اور لکشمی! قریب قریب ایک ہی معنے رکھتی ہیں یہ دونوں لفظ ——————" نوجوان نے جواب دیا۔

رفیق نے اس بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ وہ زیادہ بات چیت کرنا نہ چاہتا تھا۔ اُس نے اپنی آواز کو بہت کچھ زنانہ بنا لیا تھا۔ مگر پھر بھی زیادہ بولنے میں، اس بناوٹ کے کھل جانے کا احتمال تھا۔

"تمہاری شادی تو نہیں ہوئی دیوی!" نوجوان نے پوچھا

رفیق نے جواب میں سر ہلا کر انکار کر دیا۔

"میری بھی شادی نہیں ہوئی، میرے والد بہت بڑے"

"زمیندار ہیں، پچیس ہزار روپیہ سالانہ منافع ہے اُن کا!"

"اور بنک میں ایک لاکھ سے کچھ اوپر جمع ہے۔ میں "

"اُن کا اکلوتا بیٹا ہوں پتا جی کی عمر ساٹھ سے کچھ اوپر"

"ہی ہے" اُن کی صحت اچھی نہیں رہتی۔ مجھے تو ان کا"

"دو ایک سال بھی زندہ رہنا مشکل معلوم ہوتا ہے۔"

"یہ بوڑھے بلدو جب جیتے جاتے ہیں۔ خیر۔! "

"تم بیجا پور میں، میرے ساتھ اُتر کر ہوٹل میں قیام کر سکو گی"

"اور —— ہاں! کس لئے —— بات چیت کرنے کے لئے" نوجوان رفیق کی طرف نظریں جماتے ہوئے بولا۔

"اُس —— کے —— بعد ——————"

"آپ اس بھید کو کسی پر ظاہر تو نہ کریں گے " رفیق نے پان کی پیک تھوکتے ہوئے کہا۔

"تمہارا بھید اور کسی سے کہہ دوں! اگر میرا سر بھی کٹ"

"جائے تو بھی ایک حرف زبان سے نہ نکلے گا " نوجوان نے خوش ہو کر جواب دیا۔

"تو میں تیار ہوں ـــــــــــــــــــــــ" رفیق نے جواب میں کہا۔

نوجوان کی مسرت کا عالم نہ پوچھئے، وہ خوشی کے مارے دیوانہ ہوا جاتا تھا۔ اُس کو یقین ہو گیا تھا کہ شکار پھنس چکا ہے، لہٰذا اپنے کردار کی بلندی اور اخلاق کی عظمت دکھانے کے لئے وہ بالکل خاموش بیٹھا رہا۔ کیونکہ چڑی مار کی بوکھلاہٹ، جال میں پھنسی ہوئی چڑیا کو کبھی اڑا دیا کرتی ہے۔ رفیق ایک آدھ بار نوجوان کو دیکھ کر مسکرایا۔ رفیق کے ہونٹ پان کی سُرخی میں ڈوبے ہوئے تھے، اُس پر صبیح و رنگین چہرہ اور ان سب پر غضب پیشانی کا شفقہ، اُس کی مسکراہٹ کو دیکھ کر نوجوان کو نشہ سا ہو گیا۔

راستہ میں دُوسرے اسٹیشنوں سے بہت سے مسافر اس ڈبہ میں چڑھے اور اُترے، نوجوان کو خلوت کا جلوت سے بدل جانا ناگوار نہ گذرا، کیونکہ بیجاپور کے ہوٹل کی خلوت کا تصور اُسے مطمئن کئے ہوئے تھا۔ شام سے کچھ پہلے بیجاپور کا اسٹیشن آگیا، نوجوان، رفیق کو لیکر اترا، اُس نے اسٹیشن سے باہر جاکر، ایک تانگہ کرایہ کیا" اپنی محبوبہ (رفیق) کو اُس میں بٹھایا، اور خود بیٹھنا ہی چاہتا تھا کہ اُس کے ایک دوست نے پیچھے سے آواز دی :-

" دولت سنگھ، او دولت سنگھ! "

نوجوان گھبرا کر پیچھے دیکھنے لگا، اتنے میں دوست آگیا۔

" دولت سنگھ! یہ زنانہ کس کا ہے؟ " دوست نے پُوچھا۔

" میں اپنی چھوٹی بہن کو لیکر آیا ہوں" نوجوان نے گھبرا کر جواب دیا۔

"کوئی ملازم بھی ساتھ نہیں لائے، اور سامان تو"

"کچھ بھی آپ لوگوں کے ساتھ نہیں ہے! ــــ" دوست نے کہا۔

"ارے بھئی! میری بہن کی پیٹھ میں زخم ہو گیا ہے،"

"اُس کا آپریشن کرانا ہے۔ تو کہ دوسری گاڑی"

"سے آرہے ہیں، میں ان کو لیکر چلا آیا۔ جلدی میں!" ــــــــ نوجوان نیچی نظریں کرکے بولا۔

"آپ دواخانہ کے ڈاکٹر موہن سنگھ سے میرا نام لے دیں۔"

"وہ آپ کو ہر امکانی مدد پہنچائیگا، اس وقت تو"

"مجھے کام ہے، شام کو میں ہسپتال آؤں گا" ــــــ دوست نے کہا

نوجوان نے برائے نام جواب دیا۔ اور تانگہ میں سوار ہو گیا۔ دوست نے بھی اُس کی بے رخی دیکھ کر بات چیت کو ختم کر دیا۔ اسٹیشن سے دو میل کے فاصلہ پر ہوٹل تھا۔ وہاں جا کر تانگہ رُکا۔ ہوٹل کے ملازم دوڑتے ہوئے آئے۔ نوجوان کے کہنے پر، ہوٹل کا ملازم ان دونوں کو دُوسری منزل کے ایک خالی کمرے میں لیکر پہنچا۔ حسینہ آرام کرسی پر سمٹ کر بیٹھ گیا۔ نوجوان نے کمرے کے آئینہ میں اپنے چہرے کو دیکھا، اس احساس کے ساتھ کہ:۔

"مجھ میں بھی مردانہ حسن موجود ہے"

چند منٹ کمرے میں خاموشی رہی۔

" آپ غسل خانہ میں جا کر کم سے کم ہاتھ مُنہ دھو"

" لیجئے، چہرہ گرد آلود ہو گیا ہوگا آپ کا ! " نوجوان نے رفیق کے چہرے سے گھونگھٹ کو قدرے ہٹاتے ہوئے کہا۔

" مجھے بھوک لگ رہی ہے، آپ خود ہی جا کر تھوڑا"

" سا کھانا لے آئیں، میں اتنی دیر میں مُنہ"

" ہاتھ دھولوں گی۔ کھانے کے بعد پھر اطمینان"

" کے ساتھ باتیں ہوں گی ———— رفیق نے جواب دیا۔

نوجوان بہت خوش تھا، کہ جو کچھ وہ چاہتا ہے، اُس کی پہل دوسری طرف سے ہوتی ہے،

" کھانے کے بعد اطمینان کے ساتھ باتیں ہونگی" یہ جملہ کیا تھا، نوجوان کے جذبات کے لئے تیز سی شراب کا ایک پیالہ تھا، وہ کھانا لینے کے لئے باہر گیا۔ ادھر رفیق نے مُنہ دھو کر، ماتھے کے قشقے کو کو چھڑایا۔ اور ہینڈ بیگ سے مردانے کپڑے نکال کر پہن لئے۔ اور زنانے کپڑے ہینڈ بیگ میں رکھ لئے۔ تھوڑی دیر میں نوجوان، خود ہی کھانا لئے ہوئے چلا آیا۔ اُس نے کسی ہوٹل کے ملازم کو بھی کھانا لانے کی زحمت نہ دی، اس جذبہ کے تحت کہ:۔

" شرکتِ غم بھی نہیں چاہتی غیرت میری"

نوجوان دراتا ہوا کمرے میں داخل ہوا، اُس نے دیکھا کہ ایک مسلمان نوجوان آرام کرسی پر بیٹھا ہوا سیٹی بجا رہا ہے۔ وہ پہلے تو یہ سمجھا کہ شاید وہ کسی دوسرے کمرے میں غلطی سے چلا آیا

مگر اپنے سوٹ کیس اور رفیق کے ہینڈ بیگ کو دیکھ کر اُس کی غلط فہمی دور ہو گئی۔

"تم کون ہو؟ یہاں کیسے چلے آئے" نوجوان نے کڑک کر پوچھا۔

"میں مسافر ہوں، ہوٹل میں ٹھہرنے کے لئے آیا ہوں" رفیق نے بے پرواہی کے ساتھ جواب دیا۔

"اس کمرے میں تو ایک عورت ٹھہری ہوئی تھی"

"وہ کہاں گئی ——————" نوجوان نے کھانے کو میز پر رکھتے ہوئے دریافت کیا۔

"وہ عورت یہیں پر ہے، اسی کمرے میں!" رفیق نے جواب دیا۔

یہ سنتے ہی نوجوان نے میز اور پلنگ کے نیچے جھانک کر دیکھا، جب وہاں کچھ نظر نہ آیا تو وہ بے تابانہ غسل خانہ میں پہونچا۔ مگر وہاں بھی مطلع صاف تھا۔

"یہاں تو عورت کہیں نہیں ہے"

"تم مذاق کر رہے ہو مجھ سے! نوجوان دیوار کے سہارے کھڑے ہو کر بولا۔

"میں مذاق تو نہیں کر رہا۔ بلکہ سچی"

"بات کہہ رہا ہوں، میں آپ جیسے"

"نوجوانوں سے مذاق نہیں کیا کرتا" —————— رفیق نے پیر ہلاتے ہوئے جواب دیا

"تو پھر وہ آخر کہاں ہے؟" نوجوان، اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے بولا۔

"وہ عورت اس ہینڈ بیگ میں ہے،" رفیق نے مسکرا کر جواب دیا۔

"ہینڈ بیگ میں عورت ہے" میاں ! ہوش میں آؤ"

"شریفوں کے ساتھ ایسا مذاق نہیں کیا کرتے ، میں"

"پولیس میں اس واقعہ کی اطلاع دے دوں گا ——— " نوجوان جھنجلا کر بولا۔

"آپ شریف بھی ہیں" رفیق نے ہنس کر کہا ، اور ہینڈ بیگ کھول کر نوجوان کے سامنے رکھ دیا ، جس میں وہی کپڑے رکھے ہوئے تھے ، جو نوجوان کی "محبوبہ" پہنے ہوئے تھی۔ نوجوان یہ دیکھ کر جو کمرے سے فرار ہوا ہے۔ تو یہ جا وہ جا ، ذرا سی دیر میں وہ نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ رفیق کو اُس کے پیچھا کرنے کی بھی کیا ضرورت تھی ، اُس کا افسانہ مکمل ہو چکا تھا ———"

رفیق بہت دیر تک آپ ہی آپ ہنستا رہا۔ اور کچھ دیر کمرے میں ٹھہر کر ، رات کی ٹرین سے مکان چلا آیا۔

شاہ صاحب

تنویر اور اسلم نے "مشترکہ مزاج" کی ایک اسکیم تیار کی ، شہر سے پانچ چھ میل کے فاصلہ پر ایک گاؤں میں اسلم کے چچا کی زمینداری تھی ، اسلم اپنے چچا کے ساتھ گاؤں آیا جایا کرتا تھا ، گاؤں کے لوگ اُس سے اچھی طرح واقف تھے ، اسلم گاؤں چلا گیا ، اور تنویر سے کہہ گیا۔ کہ تم دو تین دن بعد صوفیوں اور پیروں کا لباس پہن کر آ جانا ، میں گاؤں والوں میں اس بات کا پہلے سے پروپیگنڈا کر دوں گا۔ کہ ایک بہت ہی پہنچے ہوئے درویش آ رہے ہیں۔ تنویر نے کہا کہ میں اس کے لئے تیار ہوں ، اور تیار کیا ہوں بلکہ مجھ سے بہتر

اس پارٹ کو کوئی ادا نہیں کرسکتا، لیکن بھائی گاؤں والوں سے مجھے خوف معلوم ہوتا ہے۔ اگر مجھ سے کچھ چوک ہوگئی، تو پھر میری خیر نہیں، گاؤں والوں کی محبت جس طرح جیسے ٹھاٹ ہوتی ہے۔ اسی طرح اُن کی نفرت کی بھی کوئی پناہ نہیں ہوتی۔ اسلم نے تنویر کو مطمئن کرتے ہوئے کہا۔ کہ اس بات کا تم خوف نہ کرو، اس کا میں انتظام کرلونگا، تم ذرا سنجیدہ بنے رہنا۔ جس طرح تم ضرورت بلاضرورت ہنس دیا کرتے ہو، وہاں ہنسنا نہیں، اور جو تمہارے جی میں آئے اوُل ٹپانگ اور انٹ شنٹ بکے جانا تم نے اتنا کرلیا۔ تو پھر ہمارا تمہارا ڈرامہ مکمل ہو جائیگا۔

اسلم گاؤں چلا گیا، گاؤں کے آدمی شہر سے آئے ہوئے لوگوں سے عام طور پر خبریں پوچھا کرتے ہیں، اور اسلم سے تو ویسے ہی مانوس تھے، اسلم نے اِدھر اُدھر کی خبریں سنائیں، اُس کے بعد کہنا شروع کیا۔

"بھائیو! ایک بڑے پہنچے ہوئے درویش آپ کے یہاں آنیوالے ہیں"

"بالکل نوجوان ہیں، مگر اس چھوٹی سی عمر میں انہوں نے اتنا"

"ریاضت کیا ہے کہ سو سال کی عمر کے لوگ بھی نہیں کرسکتے" برف پڑ رہی ہے"

"اور وہ چٹیل میدان میں، ایک ٹانگ سے کھڑے ہوئے"

"یاد اللہ" کررہے ہیں۔ دھواں دھار بارش ہو رہی ہے، اور وہ"

"کھلے میدان میں مُصلے پر بیٹھ کر وظیفہ پڑھ رہے ہیں، مگر نہ تو شاہ صاحب"

"پر پانی کی ایک چھینٹ آتی ہے، اور نہ بادل کی گرج اور بجلی کی"

" کرطک سے شاہ کی توجہ ادھر ادھر ہٹتی ہے۔
" شاہ صاحب اپنے گھر کی گدی کے وارث ہیں، ان کے باپ دادا بھی"
" بڑے پہنچے ہوئے تھے۔ اپنے گھر کے علاوہ دو تین دُوسرے خاندانوں سے بھی"
" ان کو فیض پہنچا ہے۔ شاہ صاحب کی کرامت کا کیا پوچھنا، ادھر ہاتھ"
" پھیرا اور بیمار اچھا ہو گیا، ایک سیٹھ کے اولاد نہیں ہوتی تھی۔ اُس نے"
" آکر شاہ صاحب کی خدمت میں عرض، معروض کی، شاہ صاحب نے کہا جا، چلا جا"
" کہہ دیا کہ اولاد ہو جائیگی سیٹھ، شاہ صاحب کے پَیر چوم کر خوش خوش گھر"
" چلا گیا شاہ صاحب کے مریدوں نے شاہ صاحب کی خدمت میں ڈرتے"
" ڈرتے عرض کیا۔ کہ یہ سیٹھ تو کافر تھا، اس پر شاہ صاحب نے بگڑ کر"
" فرمایا:۔ خدا رب العلمین ہے۔ "رب المسلمین" نہیں ہے صوفیوں کے یہاں"
" کفر و اسلام میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ شاہ صاحب کی دُعا سے سیٹھ کے لڑکا پیدا ہوا"
" ابھی چند دن کی بات ہے۔ ایک بہت بڑے زمیندار کا اکلوتا بیٹا قتل کے الزام"
" میں گرفتار ہو گیا تھا۔ زمیندار نے کنکری کی طرح روپیہ اٹھایا۔ مگر سشن"
" جج سے اُس کو پھانسی کا حکم سنا دیا گیا۔ زمیندار نے ہائیکورٹ"
" میں مرافع (Appeal) دائر کر دیا۔ مقدمہ کے"
" دوران میں کسی نے اُسے شاہ صاحب کا پتہ بتایا اُس نے شاہ صاحب"

"کے جا کر پیر پکڑ لئے کہ بس آپ ہی کے ہاتھ عزت اور آبرو ہے، شاہ صاحب"

"کچھ دیر آنکھیں بند کئے رہے، اُس کے بعد زمیندار کا ہاتھ جھٹک کر"

"بولے "چھوڑ دیا، چھوڑ دیا، صاف چھوڑ دیا" اس واقعہ کے"

"کوئی ایک ہفتہ بعد جج نے فیصلہ سُنایا۔ جس میں زمیندار کے بیٹے

کو"

الزام سے بری کر دیا۔ جج نے فیصلہ سُنانے کے بعد اپنے دوستوں

سے قسم"

"کھا کر بیان کیا۔ کہ جب میں فیصلہ لکھ رہا تھا تو ایک نوجوان سا شخص"

"فقیری لباس میں، تلوار لئے ہوئے میرے سر پہ کھڑا تھا۔ اور کہہ رہا"

"تھا کہ اس لڑکے کو چھوڑ دے، نہیں تو تیرا سر اڑا دونگا۔ زمیندار"

"اپنے بیٹے کو لیکر شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور روپیوں کی ایک"

"تھیلی شاہ صاحب کے قدموں میں ڈال دی۔ شاہ صاحب نے تمام روپے"

"کھڑے کھڑے غریبوں میں بانٹ دئے۔"

"شاہ صاحب ماشاء اللہ تندرست نوجوان ہیں، مگر خوراک بہت"

"ہی کم ہے۔ سارے دن میں مشکل سے ایک چپاتی کھاتے ہونگے"

"شہروں میں تو شاہ صاحب کی دھوم مچی ہوئی ہے، بڑے بڑے عہدیدار"

"اور سیٹھ ساہوکار، ہاتھ باندھے کھڑے رہتے ہیں، مگر شاہصاحب"

"کہتے تھے کہ مجھے گاؤں والوں کی خدمت کرنے کا حکم ہُوا ہے۔"

"شاہصاحب کیا ہیں، رحمت کا فرشتہ ہیں۔"

اسلم نے گاؤں والوں کے دلوں میں شاہصاحب کے تقدس اور کرامت کا نقش بٹھا دیا تھا۔ گاؤں والے بھولے بھالے ہوتے ہیں۔ اور ان "پیروں" اور "شاہ صاحبوں" کے لئے تو اُن کی عقیدت کا سمندر، ہر وقت موجزن رہتا ہے۔

تنویر نے ڈاڑھی، مونچھ اور سر کو اچھی طرح گھٹوایا۔ رنگے ہوئے کپڑے پہنے، ہاتھ میں ہزار دانہ تسبیح لی، دو چار کتابوں کو ایک بوسیدہ سے کپڑے میں باندھا، اسی وضع کے ساتھ وہ گاؤں پہنچا گاؤں میں ایک دھوم مچ گئی، تنویر درویشانہ انداز میں، گاؤں کی گلیوں سے گذر رہا تھا۔ اور لوگ اُس کے پیچھے پیچھے ہاتھ باندھے ہوئے چل رہے تھے۔ گاؤں کی مسجد کے سامنے ایک چبوترہ پر نیم کا درخت تھا، اسی چبوترہ پر جاکر، تنویر بیٹھ گیا چبوترہ پر بیٹھ کر وہ تھوڑی دیر آنکھیں بند کئے رہا، اُس کے بعد مجذوبانہ انداز میں بولا:۔

"یہیں کے لئے مجھ کو حکم دیا گیا تھا بس اس"

"گاؤں سے تمام بلائیں دور کر کے رہوں گا"

گاؤں کے لوگ حیرت و مسرت کیساتھ ایک دُوسرے کا مُنہ دیکھنے لگے۔ اسلم، اس مجمع میں موجود تھا، لیکن وہ تنویر کے سامنے نہ آتا تھا کہ ممکن ہے دونوں میں سے کسی کو ہنسی آجائے۔ گاؤں

والوں کو وہ پٹی پڑھا چکا تھا، اب اُس کی رہنمائی کی ضرورت بھی نہ رہی تھی۔ گاؤں والے تنویر پر ٹوٹے پڑتے تھے۔ تنویر کی پوجا ہو رہی تھی، اُس کے تلوؤں کو لوگ شوق و عقیدت کے ساتھ چوم رہے تھے۔ ایک دفعہ تو اُس نے بڑی مشکل کے ساتھ ہنسی ضبط کی، کیونکہ ایک گاؤں والے نے اُس کے تلوے کو اس طرح چوما۔ کہ اُس کو کافی گدگدی محسوس ہوئی۔

"حضور! میری اولاد زندہ نہیں رہ سکتی، اب تک"

" کوئی چھ لڑکے اور تین لڑکیاں مر چکی ہیں" ایک گاؤں والے نے ہاتھ جوڑ کر عرض کیا۔

" اچھا اب کی دفعہ جو لڑکا پیدا ہو۔ اُس کا نام"

" اللہ رکھا" رکھنا بہتر سال سے اگر اُس لڑکے"

" کی عمر کم ہو تو اس فقیر کے پانچ جوتے مارنا۔"

" اور ہاں تو کچھ راہِ خدا میں دیا بھی کر"

" خیر خیرات سے بلیات دور ہوتی رہتی ہیں" تنویر نے ہزار دانہ تسبیح کو گھماتے ہوئے کہا۔

" قبلہ! خیرات میں کرتا رہتا ہوں۔ کوئی دو سال کا"

" عرصہ ہوا ہمارے گاؤں میں ایک شاہ صاحب آئے تھے، اُنہوں"

" نے حکم دیا تھا۔ کہ ہر مہینہ کی نوچندی جمعرات کو"

" سوا پانچ سیر آٹے کے گلگلے پکا کر، مسجد کے"

" طاقوں میں بھرا کر دو۔ گلگلے نہ ہوں تو بیوہ عورت"

" پکائے اور نہ شادی شدہ، کنواری لڑکی کو کھلائے "

" تیار کرنے چاہئیں۔ اور شاہ صاحب نے "

" یہ بھی فرمایا تھا۔ کہ گاؤں کے قبرستان میں جو پکی "

" اینٹوں کی قبر بنی ہوئی ہے۔ وہ ایک بڑے "

" کراماتی بزرگ کا مزار ہے، وہی بزرگ اس "

" گاؤں کے نفع نقصان کے مالک ہیں، اُن کی قبر پہ ہر جمعرات "

" کو لوبان سلگا کر، پھول اور بتاشے چڑھایا کرو۔ ہمارے "

" شاہ صاحب، خدا اُن کو سلامت رکھے ہیں روپیہ "

" مجھ سے لے گئے ہیں، وہ فرماتے تھے کہ میں چاندی کے چراغ بنوا کر "

" دہلی کے مزاروں پر چڑھاؤں گا۔ "

تنویر بالکل خاموش بیٹھا رہا۔ اُس نے گاؤں والے کی بات پر سر بھی نہ ہلایا۔ یہ دکھانے کے لئے کہ "وہ تمہارا شاہ صاحب ہم کو تھوڑی پہنچ سکتا ہے"۔

" حضور! میرے بیٹے پر مرگی کا دورہ پڑتا ہے "

" میں تو علاج کراتے کراتے تھک گیا۔ پیر پور "

" کے ملاں جی چھ سفید مرغے، اور دو بکریاں اب "

" تک مجھ سے لے چکے ہیں، مگر کوئی فائدہ نہیں ہوا "

" میرا یہ ایک ہی بیٹا ہے، پیرومرشد! —" دوسرے گاؤں والے نے مؤدب ہو کر عرض کیا

" بہت جلد اچھا ہو جائے گا تمہارا بیٹا، تم نماز کی"

" پابندی کیا کرو ————" تنویر نے اپنے رنگین کرتہ کی آستین

کو اُلٹتے ہوئے جواب دیا۔

" سرکار! آپ سے پہلے جو شاہ صاحب آئے تھے، وہ تو نماز"

" روزہ کا ذکر تک نہ کرتے تھے۔ اسی چبوترہ پہ وہ اکثر"

" بیٹھا کرتے تھے، نماز ہوتی رہتی اور وہ رمضان کے مہینہ"

" میں حقہ پیتے رہتے۔ وہ فرماتے تھے کہ نماز ہم پر"

" فرض نہیں ہے ——— اور ———"

یہ شخص ابھی اپنی بات پوری نہ کرنے پایا تھا۔ کہ ایک دوسرے شخص نے جو پڑھا لکھا معلوم ہوتا تھا، کہنا شروع کیا:-

" قبلہ و کعبہ! یہ شخص شاہ صاحب کی کہی ہوئی بات کو"

" پورے طور پہ بیان نہ کر سکا، شاہ صاحب نے فرمایا تھا کہ"

" نماز تو اُن لوگوں پہ فرض ہے جو "صفات" کی"

" کی منزل سے نہیں گذرے، جس کے سامنے "ذات"

" ہو، اُسے نماز کی کیا ضرورت ہے۔ یہاں تو ہر وقت "

" نماز ہوتی ہے "

تنویر آنکھیں بند کئے ہوئے تسبیح گھماتا رہا۔ اور بھولے بھالے گاؤں والے باری باری سے اپنی تمنائیں عرض کرنے لگے :۔

" میری بھینس نے دودھ دینا بند کر دیا ہے "

" میری گائے ایک مہینہ سے بیمار ہے "

" میری لڑکی سے اُس کا شوہر ہمیشہ لڑتا رہتا ہے "

" ہم دونوں بھائیوں سے ہمارا چچا بیر رکھتا ہے "

" ایک کالی بلّی میری ایک نہ ایک مرغی روز کھا جاتی ہے۔"

" مجھے اکثر قبض رہتا ہے۔ اور سر میں درد بھی ! "

تنویر اپنے کسی غمناک واقعہ کا تصور کر کے اپنے خیال کو بٹائے رہا، کیونکہ گاؤں والوں کی ایک ایک بات اُس کے پیٹ میں گدگدی پیدا کر رہی تھی، اور مسکراہٹ اُس کے ہونٹوں کو چھو چھو کر رہ جاتی تھی۔

اس کے بعد گاؤں کی عورتوں نے آکر تنویر کی دست بوسی شروع کی، بوڑھی بڑی عورتوں کی دست بوسی کو تو وہ برداشت کرتا رہا، لیکن جب جوان عورتیں اُس کے ہاتھ چومنے کے لئے بڑھیں، تو اس نے روک دیا۔ عورتیں، ٹھٹک کر رہ گئیں، گاؤں والے سمجھے کہ شاید شاہ صاحب خفا ہو گئے، انہوں نے ہاتھ جوڑ کر عرض کیا۔

"کیا حضور کسی لونڈی سے کوئی خطا ہو گئی ہے"

اس کے جواب میں تنویر بولا:۔

"ہم عورتوں سے ہاتھ نہیں ملاتے!

اس پر ایک گاؤں والے نے کہا:۔

"جن شاہ صاحب کا ابھی ابھی ذکر ہوا ہے، انہوں نے تو گاؤں"

"کی بہت سی عورتوں کو مرید کیا ہے۔ وہ تو عورتوں سے ہاتھ ملاتے"

"تھے، اور ہاتھ کیا ملاتے تھے، لڑکیاں اُن کا بدن دباتی"

"تھیں۔ وہ گھنٹوں لڑکیوں کو اچھے اچھے قصے سناتے، غزلیں"

"پڑھتے، لڑکیاں بھی شاہ صاحب کو بہت چاہتی تھیں"

"کئی لڑکیوں کو تو انھوں نے اپنی بیٹی بنایا ہے"

تنویر نے عتاب کے لہجہ میں "میں اسے پسند نہیں کرتا" کہا اور پھر خاموش ہو گیا۔ نذرانہ البتہ اُس نے قبول کر لیا تھا۔ اگر وہ نذرانہ بھی واپس کر دیتا تو اُس کی "شاہ صاحبی اور درویشی" کی ساکھ گاؤں کے لوگوں میں باقی ہی نہ رہتی۔ جو درویش نماز پڑھنے کی تاکید کرتا ہو، عورتوں سے ہاتھ ملانا بُرا سمجھتا ہو۔ اس پر اگر وہ عقیدتمندوں کی نذریں بھی واپس کر دے تو پھر اُسے "صوفی اور درویش" کون مان سکتا ہے۔

گاؤں کے لوگ دوپہر کو کھانا لیکر آئے، تنویر نے انکار کر دیا۔ شب میں البتہ اُس نے

کھانے کے لئے رضامندی ظاہر کی، اُسی چبوترے پر موٹے کھدر کی چادر بچھائی گئی، اسی چادر پر جو فرش اور دسترخوان دونوں کا کام دے رہی تھی۔ کھانے چنے گئے۔ مٹی اور تام چینی کے پیالوں میں کئی قسم کی دال جس میں چار چار انگل گھی کھڑا ہوا، موجیں لے رہا تھا۔ کئی طرح کے ساگ اور اچار گڑ کی کھیر کے پیالے، گاؤں کی یہ اعلےٰ ترین دعوت تھی، کوری ٹھلیوں میں پانی رکھا ہوا تھا۔ اسلم کو بھی گاؤں کے لوگوں نے اصرار کے ساتھ بلا کر دسترخوان پر بٹھایا۔ اسلم اور تنویر ایک دوسرے سے قصداً نظریں چرا رہے تھے، اسلم کی اتفاقی طور پر تنویر پر جو نظر پڑی تو اُس نے دیکھا۔ کہ تنویر بڑی بے صبری کے ساتھ کھانا کھا رہا ہے، اسلم نے تنویر کو ہاتھ کے اشارے سے کہا۔ کہ:۔

"بس کرو"

مگر تنویر کو ایسے کھانے روز روز کہاں میسر آتے تھے، اُس نے اتنا کھایا۔ کہ گاؤں والے بھی شرما گئے۔ کھانا کھاتے وقت وہ اپنی درویشی کو بھول گیا تھا۔ اُسے اس بات کا مطلق خیال نہیں رہا کہ بیسیوں نظریں اُس کے ایک ایک لقمہ کا جائزہ لے رہی ہیں، مگر گاؤں والے تنویر کی اس "بسیارخوری" کو بھی اُس کی کرامت سمجھ رہے تھے۔

گاؤں والوں کے شدید اصرار پر، تنویر ایک چوپال میں چلا آیا۔ جو گاؤں کی سب سے اچھی عمارت تھی۔ اس چوپال میں ایک دالان اور دو کوٹھریاں تھیں، کچی دیواروں پر پنڈول پھرا ہوا تھا۔ دیواروں کے طاق چراغ کے تیل سے کالے پڑ گئے تھے تنویر کے لئے فرش بچھایا گیا، اور اسی پر یہ صاحب۔

سجادۂ تصوف و معرفت" رونق افروز ہو گیا۔

اسی گاؤں میں اُسی دن شام کو ایک تھانہ دار، کسی تحقیقات کے سلسلہ میں آیا ہوا تھا، اُس کو جو گاؤں والوں کی زبانی یہ معلوم ہوا کہ ایک بڑے کراماتی درویش آئے ہوئے ہیں، تو وہ بھی اُن سے ملنے کے لئے پہنچا۔ تھانہ دار نے تنویر کو ادب کے ساتھ سلام کیا۔ گاؤں والوں کے دلوں میں شاہ صاحب کی اور زیادہ عظمت پیدا ہو گئی۔

"میں کچھ تخلیہ میں عرض کرنا چاہتا ہوں" تھانہ دار نے کہا۔

اس پر تنویر کوٹھری میں اٹھ کر چلا گیا اور اُس کے پیچھے پیچھے تھانہ دار پہنچا۔

"ارے داروغہ! تو کیا کہنا چاہتا ہے؟" تنویر نے بے پروائی کے ساتھ کہا۔

"حضرت پیر و مرشد قبلہ! ضلع کا کپتان میرا"

"دشمن ہو گیا ہے، وہ ایک عرصہ سے مجھے تنگ کر رہا ہے"۔

"اور اب تو اس نے مجھ پر رشوت کا الزام لگا کر"

"مقدمہ قائم کرنے کی ٹھان لی ہے، حضور! آپ دُعا"

"فرمائیں کہ کپتان کا دِل میری طرف سے صاف ہو جائے" تھانہ دار تنویر کے پیروں کو بوسہ دیتے ہوئے بولا۔

"تو کیا تم نے رشوت لی تھی،؟" تنویر نے ذرا تیز لہجہ میں پُوچھا۔

"حضور! اگر حق حقوق کا نام رشوت ہے، تو"

" میں نے واقعی رشوت لی، میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں نے آج تک "
" کسی کو ستا کر ایک پیسہ نہیں لیا۔ لوگوں کا "
" میں نے کام کیا، انہوں نے اپنی خوشی سے جو دے دیا "
" خاموشی کے ساتھ لے لیا۔ میں دوسرے تھانیداروں "
" کی طرح، رقم ٹھہرانے کا عادی نہیں ہوں جس "
" معاملہ میں یہ کرسٹان کپتان مجھے پھانسنا چاہتا ہے "
" اُس کا کچا چٹھا میں حضور کے سامنے بیان کئے دیتا "
" ہوں۔ گاؤں کے ایک زمیندار کے لڑکے نے، گاؤں کی ایک "
" چماری پر بدنیتی سے ہاتھ ڈالا تھا۔ چمار نے آکر رپٹ "
" لکھائی، میں نے زمیندار کے لڑکے کو گرفتار کر لیا۔ زمیندار نے "
" مجھے خوشی کے ساتھ سو روپیہ دیدئے، میں نے اُس کے لڑکے "
" کو چھوڑ دیا۔ "
" اب حضور ہی بتائیں کہ کیا اس کو رشوت کہہ سکتے ہیں، اوّل تو "
" اُس نے خوشی کے ساتھ روپیہ دیا۔ پھر میں نے ایک شخص کو "
" جیلخانہ جانے سے بچا دیا۔ اس سے زیادہ بھلائی اور میں کر ہی "
" کیا سکتا تھا۔ پھر یہ روپیہ، تھانہ کے بہت سے آدمیوں "

"میں حصہ رسدی تقسیم ہوا۔اسی معاملہ کو کپتان طول"

"دینا چاہتا ہے۔"

"اور شاہ صاحب قبلہ! میں یہ عرض کرتا ہوں کہ یہ کپتان اور"

"کلکٹر جو ہزاروں روپیہ کی ڈالیاں وصول کرتے رہتے ہیں، کیا"

"یہ رشوت نہیں ہے۔ میں تو کہتا ہوں اس دنیا میں"

"ان معاملات سے بچنا انسان کے لئے مشکل ہے،" تھانیدار نے جواب دیا۔

"تم کل دن میں آٹھ نو بجے میرے پاس آنا"

"اُس وقت میں تم سے کچھ کہوں گا" تنویر نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

تنویر شب کو چوپال میں سو گیا۔ اور صبح بہت سویرے لوگوں کی آنکھ بچا کر، گاؤں سے روانہ ہو کر، شہر چلا آیا۔ صبح کو لوگوں نے دیکھا تو شاہ صاحب کو ندارد پایا۔ اسلم نے کہا کہ بھئی! یہ شاہ صاحب لوگ، مہینہ دو مہینہ تھوڑی رہتے ہیں، آج اس گاؤں میں ہیں، کل اُس گاؤں میں، بس ایسے ہی فیض پہنچاتے پھرتے ہیں۔ تنویر کو گاؤں میں جو کچھ نذرانہ ملا تھا وہ اس نے شہر کے ایک یتیم خانہ کو دے دیا۔ اسلم بھی ایک دو دن کے بعد شہر چلا آیا۔ اسلم نے تنویر کو دیکھ کر کہا:۔

"السلام علیکم، شاہ صاحب قبلہ!"

"تنویر نے قہقہہ لگا کر سلام کا جواب دیا۔

بنا ہوا بھگت

سُدرشن کا بیاہ ہو چکا تھا، اُس کی بیوی میکے گئی ہوئی تھی، سدرشن اپنی بیوی سے ملنے کے لئے سسرال روانہ ہوا۔ وہ بیوی سے ملنے کے لئے بھی جا رہا تھا، اور مزاحیہ ڈرامہ کا پلاٹ بھی راستہ میں مرتب کر رہا تھا۔ وہ اپنی سسرال کے شہر کے ایک ہوٹل میں ٹھہر گیا۔ اور اُس نے ہوٹل کے ملازم کی معرفت اپنی بیوی کے چچازاد بھائی کو بلایا۔ ملازم گوری شنکر کو لیکر تھوڑی دیر میں آ گیا۔ سالے، بہنوئی میں بندگی اور پرنام کا تبادلہ ہوا۔

"گوری! میں آج ایک پُر لطف مذاق"

"کرنا چاہتا ہوں، تم میری مدد کرو گے؟" سدرشن نے کہا۔

"ضرور ضرور! آپ کی بات ٹھلا ئیں"

"ٹال سکتا ہوں ————" گوری شنکر نے جواب دیا۔

"تم اپنی بہن ساوتری کو کسی طرح یہ"

"باور کرا دو، کہ ایک سادھو شہر میں آئے"

"ہوئے ہیں، جو دلوں کا حال بتاتے ہیں"

"اور جو زبان سے کہتے ہیں۔ پورا ہو جاتا ہے"

"اس کے بعد کہنا کہ میں نے اُن سادھو جی کو آج شام میں"

"بُلایا ہے، تم بھی اُن پر اپنی کوئی"

"خواہش ظاہر کرنا ——————"

"گوری شنکر! دیکھو میں شام کو ذرا تبدیلِ ہیئت کے ساتھ"

"تمہارے یہاں آجاؤں گا۔ اور تم ساوتری کو دروازے کے"

"قریب بٹھانا۔ پردے سے گفتگو ہوگی۔"

"کہو کیسا پُرلُطف مذاق رہیگا! —————— سدرشن، گوری شنکر کے

زانو پر ہاتھ مار کر بولا۔

"بھائی صاحب! کیا کہنے آپ کے! آپ پھر آپ ہیں،"

"آپ اطمینان رکھئے، جیسا آپ نے کہا ہے، ایسا ہی"

"ہوگا —————— " گوری شنکر نے جواب دیا۔

"تھوڑی دیر ادھر اُدھر کی بات چیت ہوتی رہی" چائے پینے کے بعد گوری شنکر گھر چلا آیا

اور یہاں آکر اُس نے ساوتری کو پٹی پڑھا کر تیار کر لیا۔

دن چھپے سدرشن لباس و وضع کی قدرے تبدیلی کے ساتھ سُسرال پہنچا۔ گوری شنکر نے سدرشن کو ڈیوڑھی میں بٹھا دیا۔ اور ساوتری دروازے کی آڑ میں بیٹھ گئی۔ سدرشن نے گوری شنکر کو اشارہ کیا، اور گوری شنکر کے کہنے پر ساوتری نے اپنا ہاتھ باہر نکال دیا۔ سدرشن ساوتری کے ہاتھ کی لکیروں پر انگلی پھیرتا رہا۔ اُس کے بعد آواز کو بنا کر، آہستہ سے بولا۔

"تم کو بہت فکر رہتی ہے! یہ"

" آجکل کے بیاہ ہوتے ہی بے جوڑ سے ہیں "

" خیر! ایشور مالک ہے۔ "

سدرشن کا یہ کہنا تھا۔ کہ ساوتری اُکڑوں بیٹھ گئی، آپ بیتی سنانے کے لئے، کیونکہ ایسے مہاتما اور بھگت روز روز تھوڑی ملتے ہیں، جو دل کی بات، ہاتھ دیکھ کر بتا دیں۔ ساوتری نے کھل کر کہا:۔

" مہاراج! میری فکر کی آپ کیا پوچھتے "

" ہیں، مجھے تو دن رات نیند نہیں آتی، میرے پتی "

" ویسے تو مجھ سے خوش رہتے ہیں، مگر دن رات دوستوں کے "

" ساتھ گذرتی ہے۔ اُن کی زندگی! اور اب تو چند دن سے "

" وہ میری طرف زیادہ توجہ بھی نہیں کرتے، دن رات لکھتے "

" پڑھتے رہتے ہیں، کہتے ہیں کہ میں امتحان کی "

" تیاری کر رہا ہوں۔ آپ کوئی ایسا منتر پڑھ دیجئے کہ ایک "

" تو اُن کے دل سے دوستوں کی محبت نکل جائے۔ اور دوسرے "

" لکھنے پڑھنے سے اُن کا دل اُچاٹ ہو جائے۔ "

" اور ہاں مہاراج! ذرا شرما کر، میرے کوئی بال بچہ "

" بھی نہیں ہوا۔ شادی کو ایک سال سے کچھ اوپر ہو گیا "

" مجھے اولاد کی بڑی تمنّا ہے۔ "

" ایک بات اور رہ گئی، وہ یہ کہ میرے پتی کی ماں "

" مجھ سے سدا لڑتی رہتی ہیں۔ وہ بہت لڑاکا "

" ہیں مہاراج! مجھ سے کہتی ہیں کہ محلہ کی عورتوں سے "

" زیادہ میل جول نہ بڑھاؤ، زمانہ خراب ہے، اپنے پتی "

" سے سب کے سامنے ہنس کر بات چیت نہ کیا کرو، میری تو آفت "

" میں جان ہے اُس بڑھیا کے سبب! "

" مہاراج! میرے پتی کو مجھ سے پریم ہو جائے۔ "

" بس یہی میری سب سے بڑی تمنّا ہے۔ "

سدرشن نہایت خاموشی کے ساتھ بیوی کی گفتگو سنتا رہا۔ جب بیوی گفتگو ختم کر چکی، تو اس نے قہقہہ لگایا۔ ساوتری قہقہہ کی آواز سنکر چوکنا ہو گئی۔ سدرشن نے دروازہ کا پٹ کھولا، اور مکان میں گھس کر بیوی کو ٹہوکا دیتے ہوئے کہا:۔

" تمہارے پتی تم سے پریم نہیں کرتے "

ساوتری، سدرشن کو دیکھ کر ہکا بکا رہ گئی، وہ گھبرا کر بولی:۔

" وہ تو مجھ سے پریم کرتے ہیں "

سسرال والوں نے اس واقعہ کا حال سنکر خوب لطف لیا، سدرشن چند روز سسرال

میں رہکر گھر واپس ہو گیا،

جمشید اس عرصہ میں شدید بیمار ہو گیا۔ اس لئے وہ اِس خوش طبعی کی منزل میں اپنے دوستوں کا ساتھ نہ دے سکا۔ چند دن کے بعد ان پانچوں دوستوں کی انجمن کا اجلاس منعقد ہؤا۔ چاروں نے اپنے مزاح کے واقعات سُنائے، خوب لُطف رہا۔ سُدرشن نے پچیس روپیہ کے نوٹ میز پر رکھتے ہوئے کہا:۔

"میں نے جس انعام کا وعدہ کیا تھا، وہ حاضر ہے، یہ روپیہ"

"ایک تفریحی سفر (Excursion) میں خرچ کیا"

"جائیگا، تاکہ ہم سب متفقہ طور پر لُطف اٹھا سکیں"

"میری قوتِ انتخاب حیران ہے۔ کہ کس کے حق میں"

"فیصلہ دے، اسی لئے تو میں نے انعام کی انفرادیت کو"

"اجتماعیت سے بدل دیا۔"

دوست ہنسی خوشی اپنے اپنے گھروں کو رخصت ہوئے ؛

شہیدِ محبت

تاریک ہے افرنگ مشینوں کے دھوئیں سے
یہ وادیٔ ایمن نہیں شایانِ تجلی
ہے نزع کی حالت میں یہ تہذیب جواں مرگ
شاید ہوں کلیسا کے یہودی متولّی

(اقبال رح)

مغرب زدہ نوجوانوں
کو
دعوتِ غور و فکر

شہیدِ محبت

پرتاب کا بیاہ شکنتلا کے ساتھ نہ جانے کس منحوس گھڑی میں ہوا تھا۔ کہ دونوں میں کسی طرح بنتی نہ تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ تالی ایک ہاتھ سے نہیں دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے، مگر اقدام کرنیوالا ہاتھ، دوسرے ہاتھ کے مقابلہ میں زیادہ مجرم کہا جائیگا۔ پرتاب اور شکنتلا کا بھی بالکل ایسا ہی حال تھا، اکثر و بیشتر پرتاب ہی کی طرف سے چھیڑ چھاڑ ہوتی تھی شکنتلا آخر انسان تھی، وہ بھی کبھی کبھار پرتاب کی کسی بات کا جواب دیدیا کرتی تھی۔ پرتاب کو شکنتلا کی اتنی سی جرأت بھی ناگوار تھی، وہ تو اُس کو بے زبان لونڈی کی طرح رکھنا چاہتا تھا۔ بیوی سے بگاڑ، عام طور پر صورت اور سیرت کی خرابی کے باعث ہوتا ہے، شکنتلا میں یہ دونوں خوبیاں بدرجہ اتم موجود تھیں۔ وہ اپنے خاندان کی، جو سینکڑوں افراد پر مشتمل تھا، سب سے زیادہ حسین عورت تھی، اُس کا رنگ البتہ گندمی تھا۔ لیکن ناک نقشہ کی موزونیت اور جسم کے تناسب نے اس کو "وہ" بنا دیا تھا، جس کے صرف ایک "تِل" پر سمرقند و بخارا کو نچھاور کیا جاسکتا ہے۔ مشرقی حسن کی تمام خوبیاں اُس میں موجود تھیں، اُس کے بال اتنے لانبے اور گھنے تھے۔ کہ جب نہانے کے لئے وہ اپنے بالوں کو کھولتی، تو ایسا معلوم ہوتا۔ کہ اُس نے سیاہ

چادر میں اپنے جسم کے ایک حصّہ کو چھپا لیا ہے ، یہ تو اُس کی صورت کا عالم تھا ، سیرت کے اعتبار سے بھی وہ ہزار میں ایک تھی ، شباب کا زمانہ جوان لڑکی کے لئے بڑے چنچل پن کا زمانہ ہوتا ہے ، مگر شکنتلا میں بس اتنی ہی شوخی تھی جتنی شوخی ایک شریف اور باحیا لڑکی میں ہونی چاہئے اُس کے اخلاق بھی بہت اعلےٰ تھے ، سنجیدگی کے باوجود اُس کی باتوں میں بڑی جاذبیت اور دلکشی تھی ، ایک چیز البتہ اُس میں نہ تھی ، یعنی "مغرب زدگی" سے اُسے دلی نفرت تھی ، اور پرتاب ، مغربی تمدن کا عاشق نہیں پرستار تھا ۔ یہی چیز دونوں میں بنائے مخاصمت تھی ۔ پرتاب بیوی کو جلسوں میں لیجانا اور دوستوں سے بے تکلف کرنا چاہتا تھا ، اور شکنتلا اس کے لئے کسی قیمت پر راضی نہ تھی ۔ طبیعتوں کا اختلاف ترقی کرتا جا رہا تھا ، پرتاب نے ایک دن بیوی کو آخرالٹی میٹم دے ہی دیا ۔ وہ کسی ضرورت سے کلکتہ جا رہا تھا ، کلکتہ جاتے وقت ، وہ بیوی کو خط لکھ کر دے گیا ، جس کا مضمون یہ تھا :-

" اب میں برداشت نہیں کر سکتا ۔ میں نے تم کو بہت "
" کچھ راہ پر لانے کی کوشش کی ، مگر تم وہی مرغی کی ایک "
" ٹانگ کہے جاتی ہو ۔ مجھے ہندوستانی تہذیب سے کوئی "
" دشمنی نہیں ہے ۔ مگر میں اپنے دل کو کیا کروں کہ وہ انگریزی "
" تہذیب کی طرف بے اختیار کھنچا جاتا ہے ، اور میرے "
" دل کا اُس طرف مائل ہو جانا ، بجا بھی ہے ۔ مغربی تہذیب "

" کے اصول کچھ ایسے بہتر اور سہل العمل ہیں، کہ ایک طرف تو "
" آسانیاں ہی آسانیاں نظر آتی ہیں، اور دُوسری طرف "
" میاں، بیوی کے تعلقات خوشگوار رہتے ہیں ہر جگہ ساتھ "
" رہنا، ساتھ کھانا، ساتھ اُٹھنا بیٹھنا، ازدواجی "
" تعلقات کے لئے اس سے زیادہ اور کیا چاہیئے۔ "
" بہرحال تم کو میری تمنائیں اور خواہشوں کا خیال کرنا "
" چاہیئے، مجھے تمہارے یہ لانبے لانبے جھنڈوے اچھے "
" نہیں لگتے، میں تم سے کئی بار کہہ چکا ہوں کہ "
" ان کو ترشوادو۔ کلکتہ سے آنے کے بعد، میں تمہارے "
" سر پر انگریزی بال دیکھوں، یہی میری عین خوشی "
" ہے، اور ہاں! میں مکان آنے کے بعد، احباب کو "
" ایک پارٹی دونگا، اس میں تم کو میرے ساتھ شریک "
" ہو کر میزبانی کے فرائض انجام دینے ہوں گے۔ "
" شکنتلا! یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔ ہندو استری کو تو "
" پتی کی سیوا نہیں پوجا کرنی چاہیئے۔ "

شکنتلا پر اس خط کا بیحد اثر ہوا، وہ کئی دن تک غور کرتی رہی۔ ایک طرف ہندوستانی

تمدن کی عظمت تھی، اور دوسری طرف شوہر کی رضاجوئی، وہ بڑی کشمکش میں گرفتار تھی، ہندوستانی بیوی کی تمناؤں کا مرکز صرف شوہر ہی ہوتا ہے، وہ اپنے شوہر کی تمناؤں اور خواہشوں کی حدود سے آگے کچھ سوچ ہی نہیں سکتی، اُس نے بہت کچھ غور کیا، اور آخر، شوہر کی محبت نے تمدن کی عظمت پر غلبہ پالیا۔ اور اُس نے حجام کو بلا کر انگریزی بال ترشوالئے۔ بال ترشوانے کے بعد جو اُس نے اپنے چہرہ کو آئینہ میں دیکھا ہے، تو اس کی معصوم آنکھیں نمناک ہوگئیں، اُس کے بال، جو حجام کی بیدرد قینچی نے ذراسی دیر میں تباہ کر ڈالے۔ اُس کی برسوں کی محنت کا ثمرہ تھے، جس طرح کسی گلدستہ کی سب سے زیادہ شاداب پتیاں کتر دی جائیں، تو گلدستہ کی وہ دلکشی باقی نہیں رہتی، یہی حال شکنتلا کا ہوا، بالوں کے ترش جانے سے اُس کا رُوپ زیادہ بگڑا تو نہ تھا۔ مگر اس کی جاذبیت کو زبردست صدمہ پہنچا۔

چند دن کے بعد پرتاب کلکتہ سے واپس ہوا، اُسے بیوی کے ترشے ہوئے بال دیکھ کر، بہت مسرت ہوئی:۔

" شکنتلا! اب تم کتنی مہذب اور شائستہ "

" معلوم ہوتی ہو، اچھا ہوا کہ تم نے بالوں کے اس "

" بے ترتیب جنگل کا صفایا کر دیا ——— " پرتاب مسکرا کر بولا۔

" آپ کی قدردانی اور تعریف کا شکریہ! میں "

" اس سے زیادہ اور کیا کہہ سکتی ہوں۔ " شکنتلا نے جواب دیا۔

ایک ہفتہ کے بعد پرتاب نے دوستوں کو عصرانہ (At Home) پر مدعو کیا۔ اور اُس کے بڑے اصرار کے بعد شکنتلا بھی دوستوں کے سامنے آنے پر راضی ہوگئی۔ دوستوں کی آمد شروع ہوئی، پرتاپ نے دوستوں کا بڑی گرمجوشی کے ساتھ استقبال کیا، اُس نے شکنتلا کا اپنے دوستوں سے مسرت کے ساتھ تعارف کرایا، شکنتلا شرم کے مارے زمین میں گڑی جاتی تھی، اُس کی نگاہیں نیچے سے اُوپر نہ اٹھتی تھیں۔ جب اُس کے مغرب زدہ شوہر نے اپنے دوستوں سے شکنتلا کا شیک ہینڈ کرایا ہے۔ تو شکنتلا کو فرطِ غیرت سے پسینہ آگیا سب لوگ ہنسی خوشی باتیں کرتے رہے۔ اور شکنتلا اُس کبوتر کی طرح سکڑی ہوئی بیٹھی رہی، جو اولے اور بارش کے طوفان میں، کسی ٹوٹی دیوار کے سہارے پر سمیٹ کر بیٹھ جاتا ہے۔ عصرانہ ختم ہونے کے بعد شکنتلا نے اطمینان کی سانس لی۔ وہ بہت غمگین تھی، اور مجرم کے دِل کی طرح اُس کا دل اوپر نیچے ہو رہا تھا۔

شکنتلا کا پردہ ٹوٹ چکا تھا، اور اب وہ شوہر کے ساتھ دعوتوں اور جلسوں میں جانے لگی تھی۔ پرتاب کے دوستوں میں سے ڈاکٹر گوپی ناتھ نے پرتاب کے عصرانہ کے بعد اُس کے یہاں بہت زیادہ آنا جانا شروع کر دیا۔ گوپی ناتھ کو شکنتلا سے دلچسپی ہوگئی تھی، اور یہی دلچسپی اُس کو بار بار کھینچ کر لاتی تھی۔ ڈاکٹر گوپی ناتھ، شکنتلا کو بے تکلف کرنے کی بہت کچھ کوشش کر رہا تھا، شکنتلا، ڈاکٹر کے تیور دیکھ کر بہت گھبراتی تھی۔ مگر اُس کے گھبرانے سے کیا ہوتا تھا پرتاب کی تو عین تمنا تھی کہ اُس کی بیوی، اُس کے دوستوں سے بے تکلف ہو جائے۔ شکنتلا

اپنے دل کی بات کسی سے کہہ بھی نہ سکتی تھی، اور وہ کہتی بھی تو کس سے کہتی، شوہر تو خود اسی بے تکلفی کا متمنی تھا۔ شکنتلا کے سینہ میں اضطراب اور نفرت کا ایک سمندر موجیں لے رہا تھا۔ مگر وہ بالکل مجبور تھی۔

شکنتلا کی صحت بہت اچھی تھی، مگر بچپن سے اُسے سینہ کے درد کی شکایت تھی۔ ایک دن جاڑے کے موسم میں اُس کے سینہ میں درد ہونے لگا، شکنتلا کے لئے ایک ڈاکٹر نے ایک سفوف تجویز کیا تھا، جس سے سینہ کے درد کو اکثر افاقہ ہو جایا کرتا۔ اُس نے گرم پانی کے ساتھ سفوف پھانکا، مگر درد میں کمی کے بجائے، اور زیادتی ہو گئی، اُس نے بہت کچھ ضبط کرنے کی کوشش کی لیکن درد برابر بڑھ رہا تھا، اُس نے گھبرا کر ایک بار زور سے چیخ ماری۔ پرتاب اپنے کمرے میں فوٹو دھو رہا تھا۔ بیوی کے چیخنے کی آواز سن کر وہ بھاگا ہوا آیا۔ اُس نے دیکھا کہ شکنتلا پلنگ پر مچھلی کی طرح تڑپ رہی ہے۔ اُس نے گھبرا کر پوچھا۔

"شکنتلا! کیا ہوا؟"

شکنتلا نے سینہ کی طرف انگلی کا اشارہ کیا، اور جس انگلی سے اشارہ کیا تھا، وہی انگلی اُس نے دانتوں میں دبالی۔ پرتاب نے صحن میں جا کر ملازم سے کہا کہ ڈاکٹر گوپی ناتھ کو بلا لاؤ۔

گوپی ناتھ کو تو پرتاب کے گھر آنا عید سے کم نہ تھا۔ نوکر نے حال بیان کیا۔ اور وہ خوشی خوشی آلہ جیب میں رکھ کر پرتاب کے یہاں ذرا سی دیر میں آ گیا۔

" ڈاکٹر صاحب! شکنتلا کے سینہ میں "

" بڑے زور کا درد ہو رہا ہے، یہ بے چین "

" ہوئی جا رہی ہیں، فوری تسکین کی کوئی دوا "

" دیدیجئے ——————— پرتاب بولا۔

" گھبرایئے نہیں پرتاب! میں آلہ لگا کر "

" ان کے سینہ کو دیکھتا ہوں، "

" ہاں! بہن شکنتلا تم ذرا اپنے سینے سے "

" کپڑا تو ہٹا لو ———————" ڈاکٹر نے آخری جملہ شکنتلا کی طرف مخاطب ہو کر کہا۔

شکنتلا بدستور لیٹی رہی، اُس نے کچھ جواب نہ دیا۔

" شکنتلا! ڈاکٹر صاحب تمہارے سینہ کا امتحان "

" کرنا چاہتے ہیں قمیص کے بٹن کھول دو نا! " پرتاب نے کہا۔

شکنتلا نے سر کے اشارے سے انکار کیا۔

" کیسی ناسمجھ ہو تم! ڈاکٹر صاحب آلہ لئے کھڑے "

" ہیں، اور تم سے ذرا قمیص کے بٹن نہیں کھولے "

" جاتے ——————— لاؤ میں "

" کھولے دیتا ہوں، تمہاری قمیص کے بٹن!" پرتاب بڑھتے ہوئے بولا۔

" میں سینہ کا امتحان کرانا نہیں چاہتی، ٹھوڑی

دیر میں درد کم ہو جائیگا " شکنتلا نے ہلکی سی کروٹ لیکر جواب دیا

" تمہاری منطق بالکل میری سمجھ میں نہیں

آتی، تم پارے کی طرح بیقرار ہوتی جا رہی ہو،"

" اور ڈاکٹر کو سینہ کے امتحان سے روکتی

ہو۔ کیا آج تک کسی ڈاکٹر نے تمہاری

نبض بھی نہیں دیکھی، عجیب شرمیلی اور

غیرت مند واقع ہوئی ہو تم! ——— پرتاب نے جھنجلا کر کہا۔

" ڈاکٹروں نے میری نبض بھی دیکھی ہے، میرے

سینہ کا امتحان بھی کیا ہے، لیکن ان ڈاکٹر

صاحب سے اپنے سینہ کا امتحان کرانا نہیں

چاہتی ——— اور اب تو میرا درد بھی کم

ہوتا جا رہا ہے ——— شکنتلا قدرے سکون کیساتھ بولی۔

ڈاکٹر گوپی کے کانوں میں آلہ لگا ہوا تھا۔ اور اُس کی انگلیاں شکنتلا کا سینہ چھونے کے لئے بے چین تھیں۔ اس جواب کو سن کر اُس نے آلہ جیب میں رکھ لیا، اور اُس کی بے چین

انگلیاں، یخ بستہ سی ہو کر رہ گئیں۔ اُس نے جھینپ اُتارنے کے لئے کہا۔

" مسٹر پرتاب! بھائی، گھر کے لڈو، گڑ کی "

" ڈلیوں کی برابر ہوتے ہیں، خود میرے گھر کی عورتیں، مجھ سے "

" علاج نہیں کرائیں، فیس دے کر دوسرے ڈاکٹروں کو بلاتی "

" ہیں۔ گھر کی چیز کی کون قدر کرتا ہے۔ آپ کی شکنتلا "

" کے لئے میں گھر جا کر ایک دوا بھیجدونگا۔ اس دوا کے چار "

" قطرے، پاؤ ڈیڑھ پاؤ پانی میں ملا کر پلا دینا۔ ذرا "

" دیر میں سکون ہو جائے گا۔

ڈاکٹر کے چلے جانے کے بعد پرتاب نے کہا:۔

" شکنتلا! تمہاری قدامت پرستی کسی طرح دور ہی نہیں ہوتی "

" تم کو تو کوروں، پانڈوں کے زمانہ میں پیدا ہونا چاہیئے تھا "

" اس زمانہ میں ایشور نے نہ جانے کیوں تم کو پیدا کر دیا "

" تمہارے آج کے طرزِ عمل نے مجھے ایک نہایت مخلص اور "

" سچے دوست کے سامنے ذلیل کیا۔ خیر۔ ! "

شکنتلا نے شوہر کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ اُس کا درد کم ہو گیا تھا، مگر جس طرح قافلہ کے گذر جانے کے بعد، راستہ میں اُس کے نشان باقی رہ جاتے ہیں۔ بالکل اسی طرح درد جانے

کے بعد بھی اپنے نقش چھوڑ جاتا ہے، اسی کو عوام کی اصطلاح میں "کسک" کہتے ہیں۔

شکنتلا نے اپنے کو بہت کچھ تبدیل کر دیا تھا، مگر وہ پرتاب کی مرضی کے مطابق ابھی تک نہ ہو پائی تھی۔ آج کے واقعہ نے پرتاب کو بہت کچھ مکدر کر دیا تھا۔ اور وہ بیوی سے کچھ کھنچا کھنچا رہتا تھا۔

شکنتلا کے بھائی رام راؤ، ریلوے میں تین سو روپیہ کے ملازم تھے، نوکری سے علیحدہ ہو جانے کے بعد اُن کو کئی ہزار کی رقم ملی، رام راؤ کے اولاد نہ تھی، فقیروں اور سادھوؤں سے ملنے کا اُن کو جوانی ہی سے شوق تھا۔ بڑے ہو کر یہ شوق اتنا بڑھا کہ نوکری سے علیحدہ ہوتے ہی وہ کاشی جی چلے گئے۔ اور روپیہ کا ایک بڑا حصہ اپنی بہن شکنتلا کے نام سے بنک میں جمع کر دیا۔

یا تو پرتاب، بیوی سے خفا تھا۔ اور اب جو بیوی کے نام سے ہزاروں روپیہ بنک میں جمع ہوا...، تو وہ بیوی کی طرف یک لخت مائل ہو گیا۔ شکنتلا بہت سمجھدار تھی، مگر شوہر کے اس میلان اور رجحان کو وہ نہ سمجھ سکی۔ بات یہ ہے کہ ہندوستان کی شریف عورتیں، شوہر کی محبت اور میلان طبع پر غور کرنے کی عادی نہیں ہوتیں۔ وہ محبت اور نفرت کے سوا، بیچ کی کسی چیز کو جانتی ہی نہیں وہی پرتاب، جو شکنتلا سے سیدھے منہ بات بھی نہ کرتا تھا، اب کہنے لگا:۔

"شکنتلا، تم مجھے دنیا کی ہر چیز سے زیادہ عزیز ہو"

"میں تمہارا اور صرف تمہارا ہوں۔"

"تم کتنی حسین ہو شکنتلا، میں اپنی قسمت پر فخر کرتا ہوں"

" شکنتلا! کیا تم بھی اتنا ہی چاہتی ہو — مجھے —!"

" تم ہی میری سب کچھ ہو، پیاری!"

ان بناوٹی باتوں نے بھولی بھالی شکنتلا کا من موہ لیا تھا۔ وہ غریب اس سے بے خبر تھی کہ پیار، محبت کی اس کائی کی تہہ کے تلے، فریب اور ریاکاری کا دریا ہلکورے لے رہا ہے۔ وہ سمجھتی تھی، اور یقین کے ساتھ سمجھتی تھی کہ اُس کا شوہر اب اُس سے واقعی پریم کرنے لگا ہے پرتاب نے جھوٹی محبت کے سہارے، شکنتلا سے بہت سا روپیہ حاصل کر لیا۔ پرتاب سے ممکن ہے عام نوجوانوں کی طرح نوجوانی میں کوئی بھول چوک ہو گئی ہو۔ مگر ہم اُس کو آوارہ نہیں کہہ سکتے لیکن محنت و مشقت کئے بغیر، جو روپیہ آدمی کو ملتا ہے۔ وہ خود آدمی کو آوارگی سکھاتا ہے، بیوی کے روپیہ نے اُسے آوارگی کی طرف مائل کر دیا تھا، اب وہ گھر سے غائب رہنے لگا تھا۔ اور اُس کے طور، طریق کچھ بدلے نظر آتے تھے۔ شکنتلا نے کبھی ٹوکا، تو پرتاب نے یا تو کوئی بہانہ بنا دیا، یا ذرا آنکھیں بدل کر سخت سا جواب دے دیا۔ شکنتلا اب بھی بدگمان نہ ہوئی۔ وہ تو اب بھی یہی سمجھتی تھی۔ کہ اُس کا شوہر اُس پر جان چھڑکتا ہے۔

ایک پارٹی میں شکنتلا کو جانے کا اتفاق ہوا۔ شکنتلا نے محسوس کیا۔ کہ ایک اینگلو انڈین لڑکی سے پرتاب بہت دلچسپی کے ساتھ بات چیت کر رہا ہے، پرتاب نے شکنتلا کی موجودگی کے باعث، لڑکی کی طرف سے بہت کچھ بے تعلق رہنے کی کوشش کی، لیکن دل کی بے چینی کو کہیں بناوٹی سنجیدگی چھپا سکتی ہے۔ عورت کے دل میں قدرت نے عجیب تاربرقی لگا دی ہے کہ رقابت

کی خبر کھٹ سے اُس تک پہنچ جاتی ہے۔ وہ بڑے غور کے ساتھ پرتاب اور اُس لڑکی کی ایک ایک حرکت کو دیکھ رہی تھی، اُس نے محسوس کیا کہ پرتاب نے چلتے وقت لڑکی سے بڑی گرمجوشی اور دلچسپی کے ساتھ ہاتھ ملایا۔ پارٹی ختم ہونے کے بعد جب وہ گھر کو روانہ ہوئی ہے۔ تو اُس کے جذبات کے جلو میں بدگمانی اور رقابت کی ایک فوج تھی۔

اُس کے دل میں پرتاب کی طرف سے بدگمانی پیدا ہوگئی تھی، لیکن بدگمانی اور یقین میں بہت فرق ہے۔ اس لئے شکنتلا کی محبت کی دنیا میں کوئی انقلاب پیدا نہیں ہوا تھا۔ ایک دن پرتاب، شام سے کچھ پہلے کہیں جانے کے لئے غیر معمولی تیاری کر رہا تھا، شکنتلا نے دریافت کیا تو اُس نے کہا کہ آج شب کو کلکٹر صاحب نے مجھے کھانے پر بلایا ہے۔ شہر میں جو سیاسی گڑبڑ ہو رہی ہے۔ اس کے متعلق کلکٹر صاحب تبادلہ خیالات فرمائیں گے۔ شکنتلا خاموش ہوگئی وہ اگرچہ پرتاب کی طرف سے بدگمان تھی، لیکن ایسے سنجیدہ اور بے لاگ جواب سے اُسے بدگمانی ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ پرتاب چراغ جلنے سے کچھ پہلے بن سنور کر روانہ ہوگیا۔ پرتاب کے چلے جانے کے بعد شکنتلا کسی کام سے پرتاب کے کمرے میں آئی، اُس نے دیکھا۔ کہ کرسی کے نیچے ایک رومال اور رومال کے نیچے ایک لفافہ پڑا ہوا ہے۔ رومال اور لفافہ دونوں اس انداز سے پڑے ہوئے تھے، جیسے کوئی چیز کسی کی جیب سے گھبراہٹ میں ناوانستہ طور پر گر جاتی ہے۔ شکنتلا نے رومال اور لفافہ اٹھا لیا۔

اُس نے لفافہ سے پرچہ نکال کر پڑھا جس میں لکھا تھا۔

"ڈیر پرتاب! آج شام کو میں کارلٹن"

"ہوٹل میں انتظار کرونگی، تم سات بجے تک ضرور"

"آجانا۔ دیکھو بھولنا نہیں۔"

تمہاری "ایل - ڈی"

اس خط کو پڑھکر شکنتلا غم وغصہ کے مارے بے قابو ہوگئی، وہ شدتِ پیچ وتاب میں بڑبڑانے لگی:۔

"اتنا کھلا ہؤا فریب! اب میں صبر نہیں کرسکتی"

"مجھے انتقام لینا چاہیئے ——— ہائیں! میں"

"کیا کہہ رہی ہوں، انتقام کس سے لُوں گی؟ وہ میرے"

"دشمن تھوڑی ہیں، انتقام تو دشمن سے لیا"

"جاتا ہے، مگر مجھے آخر کچھ نہ کچھ کرنا تو چاہیئے"

وہ صحن میں ٹہلتے ہوئے سوچنے لگی، وہ ٹہلتے ٹہلتے یکایک، پرتاب کے کمرے میں پہنچی۔ اُس نے الماری کھولکر، پرتاب کا سوٹ نکال کر پہنا، اور اپنے ترشے ہوئے بالوں پر نائٹ کیپ" اوڑھلی آجکل فیشن نے لڑکے اور لڑکی کو ہیئت وضع کی ایک ہی سطح پر پہنچا دیا ہے اور اب تو سُنا ہے کہ تبدیلِ جنسیت بھی شروع ہوگئی ہے، اس لئے جب شکنتلا کارلٹن ہوٹل پہنچی ہے۔ تو اُسے کسی نے بھی غور وفکر کی نگاہ سے نہیں دیکھا۔ ہوٹل کے ہال میں بہت سی عورت، مرد بیٹھے ہوئے تھے، شکنتلا کی نگاہیں تو کسی اور ہی کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ اُس نے

دیکھا کہ ہال کے مرمریں ستون کے قریب پرتاب، اینگلو انڈین لڑکی کے ساتھ بیٹھا ہوا باتیں کر رہا ہے ستون کے شمال میں ایک خالی میز پڑی ہوئی تھی، شکنتلا اس میز کے قریب کی کرسی پر جا کر بیٹھ گئی، پرتاب اور اُسکے درمیان بس ایک ستون کا فاصلہ تھا، اور وہ آسانی کے ساتھ اُس طرف کی باتیں سن سکتی تھی، شکنتلا کے کرسی پر بیٹھتے ہی، ہوٹل کا ملازم دوڑتا ہوا آیا:۔

" آپ کے لئے کیا چیز لاؤں جناب!" ملازم نے دریافت کیا۔

" آئس کریم کی نصف پلیٹ " شکنتلا نے آہستہ سے کہا۔

" نصف پلیٹ تو اس ہوٹل میں "

" نہیں ملتی، یہ کارلٹن ہوٹل ہے"

" علیم خاں کی سرائے نہیں ہے ——" ہوٹل کا ملازم تن کر بولا۔

" پوری ہی پلیٹ لے آؤ، اور ہاں!"

" قینچی کی سگرٹ کی ایک ڈبیہ بھی!" شکنتلا نے گھبرا کر جواب دیا۔

شکنتلا نے دونوں کی بات چیت کو سُنا۔

" پیاری! تم سے مل کر مجھے بڑی مسرت ہوتی ہے۔"

" آپ کی محبت کا شکریہ! "

" تمہاری بیوی کو میں نے ایسٹر کی پارٹی "

" میں دیکھا تھا، وہ تو بڑی خوبصورت ہے!"

"تم مذاق کر رہی ہو، کیا خاک خوبصورت ہے، رنگ بھی تو"

"گورا نہیں ہے، ناک نقشہ کچھ اچھا ہے، مگر مجھے اتنی کھلی ہوئی"

"پیشانی اور اتنا چھوٹا دہانہ پسند نہیں ہے،"

"کہیں تم کو پہنچی جاتی ہے وہ میری ——— !"

"یہ رشتہ میرے باپ نے اپنی مرضی سے کیا ہے، میں تو"

"ہندوستانی لڑکی سے شادی کرنا ہی نہیں، چاہتا تھا۔"

"اور اب بھی کیا بگڑ گیا ہے۔"

"پرتاب تمہارا دھیان میرا کسی وقت پیچھا نہیں چھوڑتا"

"اسکول میں، گھر میں، سینما ہال میں، ہر جگہ تم ہی تم"

"نظر آتے ہو، اور ہاں! تم نے میری کلائی کی گھڑی"

"ابھی تک نہیں منگائی۔"

"تمہاری گھڑی کے لئے میں نے تار کے ذریعہ"

"پیشگی روپیہ بھیج دیا ہے۔ بھلا یہ ہو سکتا ہے کہ"

"تم کسی بات کو کہو، اور میں اسے ٹال دوں"

شکنتلا کے کانوں میں اس گفتگو کا ایک ایک لفظ زخم ڈال رہا تھا۔ آئس کریم کھانے کا کسے ہوش تھا۔ تمام آئس کریم پلیٹ میں گھل کر رہ گئی شکنتلا، ملازم کو بل کی رقم دیکر

ہوٹل سے روانہ ہوئی۔ ملازم نے شکنتلا کا حیرت کے ساتھ منہ دیکھا۔ ملازم کو اس قسم کے گاہک سے بالکل پہلی مرتبہ سابقہ پڑا تھا۔ کہ سگرٹ کی ڈبیہ اور آئیسکریم کی پوری پلیٹ چھوڑ کر چلتا بنا اور ہوٹل میں اس طرح بیٹھا رہا۔ جیسے اس کے کوئی نشتر چبھو رہا ہے۔ مکان آنے کے بعد شکنتلا نے پرتاب کے کپڑے اتار کر احتیاط سے الماری میں رکھ دئے۔ رات کو آدھی رات گئے پرتاب ہوٹل سے واپس ہوا۔

"کہئے کیا رہا، کلکٹر صاحب کی میٹنگ میں!" شکنتلا نے پوچھا۔

"کیسی کلکٹر صاحب کی میٹنگ ؟ ——— ارے"

"ہاں! میں بعض وقت کتنا غائب"

"دماغ ہو جاتا ہوں، شہر میں ایک بڑے لیڈر"

"آنے والے ہیں، اُن کے استقبال کے لئے پبلک"

"بڑے شاندار پیمانہ پر انتظامات کر رہی ہے، کلکٹر صاحب"

"کی خواہش ہے کہ استقبال ناکامیاب رہے۔"

"اسی پر آج غور ہوتا رہا ——— پرتاب کوٹ اتارتے ہوئے بولا۔

"کلکٹر صاحب نے اور کتنے لوگوں کو بلایا تھا۔" شکنتلا نے انجان بن کر دریافت کیا۔

"میرے علاوہ، آٹھ آدمیوں کو اور بلایا تھا۔" پرتاب نے جواب دیا۔

" تو پھر اس جلسہ کی اطلاع اخباروں میں "

" آئے گی ——————" شکنتلا نے پوچھا۔

" ایسے راز کے جلسوں کی اخبارات میں اطلاع "

" نہیں دی جایا کرتی۔ شکنتلا! میں تھکا "

" ہوا ہوں، مجھے سو جانے دو، تم نے تو اخبار کے "

" نمائندوں کی طرح سوالات شروع کر دئے " پرتاب پلنگ پر لیٹتے ہوئے بولا۔

پرتاب آرام کے ساتھ سو گیا۔ اور شکنتلا رات بھر انگاروں پر لوٹتی رہی۔ ہوٹل کی باتوں کو جب وہ یاد کرتی تھی، تو اُس کا سینہ پھٹنے لگتا تھا۔

ڈاکٹر گوپی ناتھ، پرتاب کے یہاں برابر آتا جاتا رہتا تھا۔ شکنتلا، پرتاب پر بیک وقت تمام راز ظاہر کرنا چاہتی تھی، اس اسکیم کو پورا کرنے کے لئے وہ ڈاکٹر سے اب ذرا بے تکلفی کے ساتھ ملنے جلنے لگی۔ ڈاکٹر کی خوشی کا کیا پوچھنا، وہ تو سمجھتا تھا۔ کہ بس اب کچھ دن میں معرکہ سر ہوا جاتا ہے۔ ایک جلسہ میں شکنتلا کی ڈاکٹر سے ملاقات ہوئی، چلتے ہوئے ڈاکٹر نے ذرا کھل کر شکنتلا سے گفتگو کی، شکنتلا نے کہا کہ اس وقت بات چیت کا موقع نہیں ہے، تم مکان جا کر تفصیلی خط لکھ دینا۔ ڈاکٹر کو یقین ہو گیا۔ کہ شکنتلا اُس سے محبت کرنے لگی ہے ڈاکٹر نے گھر پہنچتے ہی مکتوب محبت لکھ ہی توڑ ڈالا:۔

" پیاری شکنتلا!

" دامنِ ضبط میرے جذبات کے ہاتھوں سے "چھٹا"
" جا رہا ہے، ہائے! پریم کی چنگاری کتنی تباہ کُن "
" ہوتی ہے۔ "
" تم جس دِن وقت مقرر کرو گی، اُسی دِن میں آؤنگا، "
" لیکن میں ——————————— "
" تمہارا ڈاکٹر گوپی "

اس خط کو بھی شکنتلا نے اینگلو انڈین لڑکی کے خط کے ساتھ حفاظت سے رکھ لیا شکنتلا اب بہت ہوشیار ہو گئی تھی، اُس نے اینگلو انڈین لڑکی کے حالات دریافت کئے تو معلوم ہوا کہ اُس کے شوہر کی یہ محبوبہ ریلوے گارڈ کی لڑکی ہے اس کا چال چلن نہایت درجہ خراب ہے، اور وہ اسی طرح نوجوانوں کو اپنے دام میں لاکر، دونوں ہاتھوں سے لوٹتی ہے۔ اس کی شادی ابھی تک نہیں ہوئی، لفظ "مس" (Miss) کا پردہ اُس کی دوشیزگی کے مکروہ مجسمے پر پڑا ہوا ہے۔ شکنتلا نے اپنے ملازم اور اس لڑکی کے باپ کے ملازم میں یارانہ پیدا کرا دیا تھا۔ اسی ملازم کی معرفت اُس نے ایک خط حاصل کیا، جو لڑکی نے اپنے ایک آشنا کو لکھا تھا:۔

" پیارے کبوتر!
" تمہارے پیار کی باتیں اب تک یاد آ رہی ہیں، کتنے "

"گرم اور نازک ہیں تمہارے ہونٹ! اب کب"

"ملوگے؟ تاریخ سے اطلاع دینا ——"

صرف تمہاری

"مِس۔ ایل ڈوڈ"

شکنتلا کے پاس اس خط سمیت تین خط ہو گئے تھے۔ اور اب وہ کسی مناسب موقعہ کی منتظر تھی۔

ایک دِن شام کو پرتاب پھر بن سنور کر باہر روانہ ہوا، شکنتلا نے بھی ان تینوں خطوں کو لیکر اُس کا پیچھا کیا۔ پرتاب سڑک پر خراماں جارہا تھا۔ شکنتلا سے ضبط نہ ہوسکا۔ وہ سڑک کے نکڑ پر آگے بڑھکر، پرتاب کے سامنے آگئی۔

"کیا آج بھی کلکٹر صاحب کے یہاں"

"مٹینگ ہے؟ ——" شکنتلا نے دریافت کیا۔

"شکنتلا! باز آرہیں ایسی باتیں"

"نہیں کیا کرتے، تم اب اپنی حد سے"

"گذری جارہی ہو ——" پرتاب نے آگے بڑھتے ہوئے جواب دیا۔

"میں روکتی نہیں ہوں، تم شوق سے چلے جانا"

"مگر ذرا ان خطوں پر تو ایک نظر ڈالتے جاؤ" شکنتلا نے پرتاب کے ہاتھ میں خط دیتے ہوئے کہا۔

پرتاب نے خطوں کو پڑھنا شروع کیا، اُس کے چہرے کا رنگ متغیر ہوتا جا رہا تھا۔ وہ تیسرے خط کو آدھے کے قریب پڑھنے پایا تھا، کہ راستہ سے ایک گھوڑا بھاگتا ہوا آیا۔ پرتاب تو ایک طرف کو بچ گیا۔ مگر شکنتلا وہیں کھڑی رہی، گھوڑا پوری قوت کے ساتھ دوڑ رہا تھا۔ اُس کے آگے کا حصہ شکنتلا سے ٹکرایا، شکنتلا دھڑام سے زمین پر گری، پرتاب نے اُس کے سر کو جس سے خون بہ رہا تھا۔ اٹھا کر اپنے زانو پر رکھا، شکنتلا کا جسم کانپ رہا تھا۔ اُس کے ماتھے کی لکیریں جلد جلد بے ترتیب ہو رہی تھیں، اُس نے آنکھیں کھول کر۔

"میں اب بھی تمہاری ہوں پرتاب!"

کہا، اور بہت قوت کے ساتھ ایڑیاں رگڑ کر خاموش ہو گئی، تینوں خط اُس کے لہو میں ڈوب کر سُرخ ہو گئے تھے، پرتاب کی آنکھوں سے صرف آنسو بہہ رہے تھے، اور شکنتلا کے ٹھنڈے جسم سے اب بھی خون جاری تھا۔

افسانوں کی تلاش

افسانے، برقپاروں کی طرح فضا میں تیرتے
پھرتے ہیں، مگر ہم اُن کو محسوس نہیں کرتے،

شہر کی گلیاں، بازار، چائے خانے اور
دوکانیں، افسانوں کی کانیں ہیں۔

معاشرت کی برائیوں کو مٹانا، ملک کی
سب سے بڑی خدمت ہے۔

افسانوں کی تلاش

انجم ایک کامیاب اور ہر دلعزیز افسانہ نگار تھا، اُس کے افسانوں کی پبلک میں دھوم مچی ہوئی تھی، جس رسالہ میں اُس کا افسانہ شائع ہوتا، وہ رسالہ ہاتھوں ہاتھ بک جاتا۔ اُس کی بہت سی کتابیں پبلک کے سامنے آچکی تھیں، اور ایک ایک کتاب کے کئی کئی ایڈیشن نکل چکے تھے، انجم نہ تو میکسم گورکی کا مقلد تھا۔ اور نہ چیخوف سے متاثر تھا، اُس کی طبیعت میں اُپج تھی، اس لئے اُس کے افسانے ابداعی اور اوریجنل ہوا کرتے تھے، انجم افسانے کاہے کو لکھتا تھا۔ واقعات کی ہو بہو تصویر کھینچتا تھا۔ نفسیات انسانی کا وہ زبردست ماہر تھا جو بات لکھتا، پڑھنے والے کے دل میں اترتی چلی جاتی، ایسا دل لگتا اسلوب نگارش ماہر نفسیات ہی کا ہو سکتا تھا۔ اُس کے افسانے عام انسانوں کی زندگی کے علم واقعات سے متعلق ہوتے تھے جن میں اُس کے اپنے ذاتی تجربہ اور مشاہدہ کو بہت بڑا دخل تھا۔ وہ سنی سنائی باتوں سے افسانہ بنانے کو افسانہ کی توہین سمجھتا تھا۔ ایک مرتبہ کسی رسالے کے ایڈیٹر نے اُس کو لکھا کہ کوئی عشقیہ افسانہ لکھ کر بھیجدو، پہلے کی طرح معاوضہ روانہ کر دیا جائیگا، انجم نے اس کے جواب

میں ایڈیٹر کو لکھا:۔

" ایڈیٹر صاحب! عشقیہ افسانے میں نے لکھے ہیں، اور اب بھی جب کوئی "

" واقعہ، محبت مجھے متاثر کرتا ہے۔ تو اس نوع کا افسانہ مرتب ہو ہی "

" جاتا ہے۔ مگر میں کسی تاثر کے بغیر افسانہ لکھنے کا عادی نہیں ہوں "

" اس قسم کے افسانے ممکن ہے دماغ کو تھوڑی دیر کے لئے خوش کر سکیں "

" لیکن دل تو اُن سے متاثر نہیں ہو سکتا۔ دل تو اُسی بات سے متاثر ہوتا ہے "

" جو دل سے نکلتی ہے۔ میں ایسے افسانوں کو پسند نہیں کرتا، جن میں "

" ہوسناکی کے سوا کوئی اور بات بیان ہی نہیں کی جاتی۔ آپ کہیں گے کہ "

" یہ کیسا ظالم انسان ہے جو "محبت" کو "ہوسناکی" سے تعبیر کرتا ہے۔ "

" لیکن میں آپ سے انصاف کا واسطہ دے کر دریافت کرتا ہوں، کہ افسانوں میں عام طور "

" جو واقعات بیان کئے جاتے ہیں، وہ "ہوسناکی" کے سوا اور کیا ہوتے ہیں! "

" جن افسانوں کے بیشتر حصے سڈول شانوں کی کپکپی، لبوں کے ارتعاش، "

" سینہ کے تناؤ، چال کی محشر خرامی، چومنے چاٹنے کے چٹخاروں اور بھینچ "

" بھینچ کر پیار کرنے کے واقعات سے بھرے ہوئے ہوں، اُن کو آپ عشقیہ افسانے کہہ کر "

" عشق و محبت کی توہین کر رہے ہیں! آہ! کہ دنیا محبت کے مفہوم ہی سے "

" واقف نہیں ہے، دنیا والوں کے نزدیک تو محبت کی کامیابی اس میں ہے کہ "

" مسہری پر گجرے بکھرے ہوئے پڑے ہوں اور بستر "

" پر شکن ہو، جس پر کوئی نازنین رات کے جاگنے کے "

" باعث انگڑائیاں لے رہی ہو "

" افسانہ نگار، اسی خیال کو پھیلا کر بیان کرتے ہیں، اور یہی خیال پھیلتے پھیلتے "

" عشقیہ افسانہ بن جاتا ہے "

" ہندوستان کے بہت سے افسانہ نگار، نوجوان مردوں کو نوجوان عورتوں پر عاشق "

" کراتے رہتے ہیں کسی مرد نے کسی عورت کو ریل یا موٹر میں دیکھ لیا۔ "

" اور وہ ایک سانس میں اُس کا عاشق ہو گیا۔ کسی مرد سے کسی عورت کی "

" کسی پارٹی یا جلسہ میں ملاقات ہو گئی، عورت بات کرتے میں ذرا مسکرائی اور "

" فرہاد و مجنوں کے اس چچازاد بھائی نے اپنا دھڑکتا ہوا دل اس طرح عورت کو "

سونپ دیا، جیسے وہ اپنے دل کو مٹھی میں لیے پھرتا تھا۔ یہی چند گنے چنے "

" پلاٹ ہیں، جو خفیف تبدیلی کے ساتھ مختلف افسانوں میں نظر "

" آتے ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا۔ کہ افسانہ نگار، ایک دوسرے کا پلاٹ چرا کر اپنے "

" الفاظ میں ڈھال لیتے ہیں، بات یہ ہے کہ جب ہر افسانہ نگار کا مطمح نظر "

" عشق و محبت کے واقعات کی ترجمانی ہو گی، تو لامحالہ خیالات میں توارد ہو گا "

" اور یہ سب لوگ ملتی جلتی باتیں بیان کریں گے، کوئی شک نہیں کہ "

" عشق عاشقی کی باتیں بڑی رنگین ہوتی ہیں، مگر زمانہ کا کاروبار اور "
" دُنیا کی معاشرت صرف ان رنگینیوں ہی کا نام نہیں ہے۔ دُنیا میں "
" روزانہ ایسے بیشمار واقعات ظہور پذیر ہوتے رہتے ہیں، جو اگرچہ رنگین نہیں "
" ہوتے، مگر اُن کے حیطۂ تحریر میں لانے سے، ادب کو بُہت کچھ فروغ ہو سکتا ہے!"
" اور صرف ادب ہی کو نہیں بلکہ انسانیت کے چہرے کے لئے یہ واقعات، "
" خوشنما غازے کا کام دے سکتے ہیں۔ "
" ایڈیٹر صاحب! یہ ہوٹلوں اور بازاروں کی چہل پہل، اسٹیشن کے مسافر خانوں اور "
" پلیٹ فارموں پر مسافروں کی بھاگ دوڑ، قلیوں اور تانگہ والوں کی باتیں، "
" مزدور کے پھٹے ہوئے کپڑے، کسان کی ٹوٹی جھونپڑی، فقیروں کی "
" صدائیں اور اُن کے بھیک مانگنے کے بہلاوے، دفتروں میں کلرکوں کی مصروفیت، "
" چپراسیوں کی مستعدی، مدرسوں اور کالجوں کی زندگی، مہتروں، چماروں، قصابوں "
" اور چوڑی بیچنے والوں کے مخصوص کردار، یہ سب افسانے نہیں تو اور کیا ہیں "
" افسانہ نگار تو ان ہی روزانہ کی چیزوں میں سے افسانہ کے لئے مواد فراہم کرتا ہے "
" افسانے تہذیب و معاشرت کی تصویریں ہیں، ہمارے موجودہ افسانوں "
" میں اگر معاشرتی افسانوں کا اضافہ نہ ہوا، اور یہ بدستور، آئندہ نسلوں تک پہنچ گئے۔ تو "
" ہماری آئندہ نسلیں یہی نتیجہ اخذ کرینگی۔ کہ اُن کے آباو اجداد کو عاشق ہونے کے "

"سوا اور کوئی کام ہی نہ تھا۔"

"افسانوں سے ذہنیت بدلی جا سکتی ہے، خیالات میں انقلاب پیدا کیا جا سکتا ہے"

"معاشرت اور تمدن کی اصلاح افسانوں کے ذریعہ بہترین طریقہ پر ہو سکتی ہے۔"

"یہ افسانے نصیحت و ہدایت کی کڑوی گولیوں کیلئے شہد کا کام دیتے ہیں"

"کہ گولیاں بھی حلق سے اتر کر معدہ میں پہنچ گئیں اور زبان نے تلخی کے بجائے"

"حلاوت محسوس کی۔ افسانہ نگاروں پر قوم و ملک کی طرف سے عظیم الشان ذمہ داری"

"عاید ہوتی ہے، افسانوں کے ذریعہ قوم کو بیباک اور جری بنایا جا سکتا ہے، افسانے"

"قوم و ملک میں بیداری کی روح پھونک سکتے ہیں۔ روس کی بیداری میں بڑی"

"حد تک افسانوں کا ہاتھ ہے۔ اب آپ ہی بتائیے کہ جب"

"افسانہ قوم و ملک کی اتنی عظیم الشان خدمت کر سکتا ہو تو اس کو محض "بازیچۂ عشق"

"بنا دینا کہاں تک روا ہے۔ عشق و محبت کے چٹخاروں کی جاذبیت اپنی"

"جگہ مسلم، مگر ان رنگینیوں اور جاذبیتوں سے کوئی قوم بیدار تو نہیں ہو سکتی۔ اور"

"اس قسم کے افسانے، تمدن و تہذیب کے چہرے سے تو ہلکی سے ہلکی نقاب بھی نہیں"

"اٹھا سکتے۔ رنگینیوں اور رومانیت زائیوں نے دنیا میں کبھی انقلاب پیدا"

"نہیں کیا ——————————"

"مجھے آپ کی فرمائش کو رد کرتے ہوئے افسوس ہو رہا ہے، لیکن میں اپنے ضمیر کے"

" خلاف کسی اقدام کے لئے تیار نہیں ہوں۔ میں افسانوں ہی کی تلاش میں "
" عنقریب وطن سے باہر جانیوالا ہوں، اس " افسانوی سفر " سے واپسی کے بعد "
" آپ سے مُراسلت کروں گا۔ خدا کرے آپ میرے خط کا خلوص و محبت کی "
" روشنی میں مطالعہ فرمائیں۔ "

انجم نے کئی مہینہ سے کوئی افسانہ نہیں لکھا تھا۔ ایڈیٹروں اور کتاب شائع کرنیوالے اداروں کے خط پر خط چلے آرہے تھے، مگر انجم بالکل خاموش تھا۔ افسانوں ہی کی تلاش میں انجم گھر سے نکلا۔ اور اُس نے ایک بڑے شہر میں جا کر، سینما ہاؤس کے ایک ہوٹل میں ملازمت کر لی۔

ہوٹل اور سینما ہاوس کی زندگی کا بہتر طور پر اندازہ، ادنیٰ درجہ کی ملازمت ہی کے بعد ہو سکتا تھا۔ انجم ہوٹل میں ایک ادنےٰ ملازم کی حیثیت سے کام کرنے لگا۔ اُس کو روزانہ نئے نئے گاہکوں سے سابقہ پڑتا تھا۔ اُس کے دل و دماغ پر نفسیات انسانی کے بہت سے جدید ابواب کھلتے جا رہے تھے۔ وہ نوجوان گاہکوں کی باتیں خاص طور پر سنتا تھا، ایک دن چند نوجوان ایک جگہ بیٹھے ہوئے، چائے پی رہے تھے، انجم ان کے قریب کھڑا ہو کر، ان کی باتیں سننے لگا:۔

" ارے محمود! سیتا دیوی کی آنکھوں کا میں تو فدائی ہوں، آنکھیں "
" کیا ہیں شراب کے چھلکتے ہوئے پیالے ہیں مسکراہٹ "
" بھئی خوب ہے اس قتالۂ روزگار کی! بھئی عورت کیا ہے۔ حسن کی "
" مورت ہے ——————— "

" تمہاری باتوں سے مجھے اتفاق ہے۔ سروپ! لیکن میں مادھوری کو"

" سیتادیوی پر ترجیح دیتا ہوں۔ سیتادیوی کے پاس بس آنکھیں ہی"

" آنکھیں ہیں، اور مادھوری تو حسن و شباب کی جیتی جاگتی تصویر ہے"

" عورتیں، سگرٹ پیتے ہوئے اچھی نہیں لگتیں، مگر یہ مادھوری جب"

" سگرٹ پیتی ہے تو اُس کے عظمتِ حسن میں چار چاند لگ جاتے ہیں"

" میں نے بہت سے کھیل اس مادھوری کے دیکھے ہیں، کس انداز کے ساتھ"

" ظالم تھپیڑ مارتی ہے، میرے رخسارے تو تڑپتے رہ جاتے ہیں"

" دوستو! مجھے تو نسیم پسند ہے، کمسن، سنجیدہ، بھولی اور"

" شائستہ! لہجہ اتنا شیریں کہ ایک ایک لفظ پہ اگر بس چلے"

" تو ہونٹ چوم لوں۔ نسیم واقعی نسیم ہے، اُس کے مسکراتے ہی دلوں"

" کی کلیاں کھل جاتی ہیں ———————————— "

" ارے یارو! یہ صنوبر کوئی نئی ایکٹرس اسٹیج پر آئی ہے۔ بھئی کیا"

" ناچتی ہے، اوہو، ہو! کمر اور سینہ کو اس قدر لچکاتی ہے کہ "

" دیکھنے والے کہیں سے کہیں پہنچ جاتے ہیں۔ "

" ارے! میں تو دو تین ایکٹرسوں کے پاس بیسیوں خط بھیج چکا ہوں، مگر"

" کسی خدا کی بندی کو جواب دینے کی توفیق نہیں ہوئی، بڑی مغرور اور"

" متکبر ہوتی ہیں یہ فلمی پریاں ۔ ! "

" بھئی ! میں تو اب کے گرمیوں کی چھٹیوں میں بمبئی جا کر رہوں گا ، میری دو غزلیں "

" وہاں کے فلمی پرچوں میں چھپ چکی ہیں ، ایکٹرسوں کی نظر سے میری "

" غزلیں ضرور گذری ہوں گی ۔ بس میرے وہاں ذرا پہنچنے کی دیر ہے ، پھر کیا ہے "

" فلمی کمپنیوں کے ڈائرکٹر مجھے دعوتیں دینگے ، "

" کاش ! میں مالدار ہوتا ، اتنا مالدار کہ دو تین ایکٹرسوں "

" کی فرمائشیں پورا کر سکتا ، پھر کیا تھا ؟ مگر ہائے ! قسمت ، وائے "

" نصیب ! عاشقوں کو سدا مفلس دیکھا لیکن سدا یکساں زمانہ "

" نہیں رہتا کبھی ہمارا بھی زمانہ آئیگا ۔ "

" ارے تم سب کے سب بیوقوف ہو ، میرے پاس تو کئی "

" ایکٹرسوں نے اپنے دستخطی فوٹو بھیجے ہیں ۔ میں نے اُن کو لکھا تھا کہ "

" میں ایکٹرسوں کے سوانح حیات مرتب کر رہا ہوں ۔ اپنی تصویریں "

" بھیجدو ، اس خط کے دیکھتے ہی ایکٹرسوں نے اپنی تصویریں بھیجدیں "

" بھائی ہوا آجکل عشق عاشقی بھی سیاست کے بغیر ، بیوقوفی ہے "

" بیوقوفی ۔ ! "

" بھئی صنوبر کے رقص طاؤس کا کیا کہنا ، کتنی حسین "

"ہے یہ عورت ۔ ! واہ ۔ وا ۔ !

انجم ان دل پھینک نوجوانوں کے قریب کھڑا غور سے گفتگو سن رہا تھا۔

"تم کیا سن رہے ہو جی اپنا کام دیکھو" ایک نوجوان نے انجم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"حضور! خطا معاف، صنوبر ......!" انجم نے مصنوعی جھجک کے ساتھ جواب دیا

"کہو کہو کیا کہنا چاہتے ہو، تم آدمی تو"

"سمجھدار نظر آتے ہو ———" نوجوان خوش ہو کر بولا۔

"حضور! میں صنوبر کے یہاں بمبئی میں نوکر رہا"

"ہوں، دو تین سال میں نے اس کے نوکری"

"کی ہے، مجھ سے وہ بہت خوش تھی، اس کے بھائی"

"سے میری ایک بات پر کھٹ پٹ ہو گئی، اور مجھے"

"وہاں سے علیحدہ ہو جانا پڑا" انجم نے دیوار کا سہارا لیکر جواب دیا۔

"بھئی! خوب ملے تم، یہ صنوبر جیسی فلم کے"

"پردے پر نظر آتی ہے، کیا سچ مچ ایسی ہی ہے؟" نوجوان نے چائے کی پیالی میز پر رکھتے ہوئے پوچھا۔

"صاحب! فلم میں یہ زیادہ اچھی نظر نہیں آتی"

"آپ اس کو دیکھیں گے، تو حیران رہ جائیں گے، ہاں"

" اس کا قد زیادہ لانبا نہیں ہے " انجم نے کہا۔

" میں نے سُنا ہے، اس کی ابھی تک شادی "

" نہیں ہوئی، اور وہ شادی کرنا بھی نہیں چاہتی " ۔ نوجوان نے گھبرا کر دریافت کیا۔

" ہاں! اس کی شادی ابھی تک نہیں ہوئی، لیکن "

" شادی تو وہ کرنا چاہتی ہے، مگر میں نے اُسے کہتے "

" ہوئے سُنا ہے کہ میں روپیہ پیسہ کی بھُوکی نہیں ہوں "

" جس سے دل مل جائیگا، اُسی سے بیاہ کر لوں گی ۔ " انجم نے جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا۔

" تو تم کوئی ترکیب بتاؤ، اُس سے ملنے کی! ۔ " نوجوان نے دریافت کیا۔

" ترکیب بہت سہل ہے، آپ اپنا فوٹو "

" اُس کے پاس بھیج دیجیے، اس طرح خط و کتابت کا "

" سلسلہ ہو جائے گا، ایک مہینہ بعد میں ہٹی جاؤں گا "

" آپ میرے ساتھ چلیئے، میں اُس سے آپ کو "

" ملا دوں گا " انجم نے انتہائی سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا۔

" آپ مجھے اُس سے ملا دیں گے، واقعی! آپ سچ "

" کہہ رہے ہیں؟ اچھا اب مجھے کتنا خرچ کرنا پڑے گا"۔ نوجوان کرسی سے ذرا اٹھتے ہوئے بولا۔

" پہلے آپ بتایئے، کہ آپ کتنا خرچ کر سکتے ہیں"۔ انجم نے جواب دیا۔

" بھئی! میں صاف آدمی ہوں، جھوٹ اور مبالغہ میرا شیوہ"

" نہیں، میرے پاس پچیس روپیہ تو اس وقت"

" موجود ہیں، پچیس کا اور انتظام ہو سکتا ہے، اور ہاں!"

" دس پانچ روپیہ اور بھی مل سکتے ہیں، اس طرح پچاس"

" ساٹھ ہو جائیں گے، میرے خیال میں اتنے روپیہ تھوڑے"

" نہیں ہیں، یہاں سے تو میں تیسرے"

" درجہ میں جاؤنگا، بمبئی سے دو ایک اسٹیشن پہلے"

" سیکنڈ کلاس کا ٹکٹ لے لیا جائے گا۔ " نوجوان بولا۔

" بہت اچھا میاں! آپ خدا کا نام لیکر اپنی"

" تصویر تو بھیج دیجئے، وہاں سے جواب آنے پر پھر"

" بمبئی چلنے کی تاریخ مقرر کریں گے " انجم نے چائے کی کشتی میز سے اٹھاتے ہوئے جواب دیا۔

نوجوان اٹھ کر چلے گئے، اور انجم اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ کھیل کے دوران میں انجم

چائے، سوڈا اور دوسری کھانے پینے کی چیزیں لیکر سینما ہال میں بھی جاتا تھا۔ ایک دن وہ زنانہ کمرہ کے بہت قریب کھڑا تھا۔ کھیل شروع ہوچکا تھا۔ اُس نے اپنے کانوں سے ایسے فقرے سنے جن سے عورتوں کی دلچسپی اور بے چینی کا پتہ چلتا تھا۔ فقرے ادھ کٹ اور الفاظ قدرے مبہم تھے۔ مگر ان ہی ناتمام نقوش سے ایک مکمل تصویر مرتب کیجا سکتی ہے،

انجم نے سُنا۔

"ہائیں! آہ — ! اُف، ف ف! محبت، پریم"

"ارے! یہ نوجوان، کتنا شرمیلا — ! اونہہ، پیار بھی"

"لینا — ! خبر — ! وصل کی رات ہے یہ!"

"جوانی دِوانی، — ! بھئی واہ — ! مجھے پسینہ کیوں آرہا ہے"

"ہندی گیت اور ایسے نوجوان کے منہ سے! ——————"

زنانہ کمرے میں چوڑیاں بج رہی تھیں، جیسے بہت سی عورتیں انگڑائیاں لے رہی ہیں۔ گرم گرم سانسوں کی بھبک انجم نے بھی محسوس کی، اُس نے یہ بھی دیکھا کہ وقفہ کے ختم ہوتے ہی ایک نوجوان نے سینما ہال کے زینہ پر آکر سیٹی بجائی، ایک لڑکی زنانہ کمرہ سے نکل کر زینہ میں آئی، اور اُن دونوں میں آہستہ آہستہ باتیں ہونے لگیں،

ہوٹل کی زندگی میں انجم کو کوئی آرام نہ تھا، مگر یہ سب پابندیاں اور پریشانیاں تو اس نے اپنی خوشی سے برداشت کی تھیں، وہ تو معاشرت کے مختلف مناظر دیکھنے کے لئے یہاں آیا تھا

ہوٹل کے مینجر کی ایک مرتبہ اُسے ایک لات بھی کھانی پڑی، لیکن وہ بدستور کام کرتا رہا، اُس کا افسانہ ابھی مکمل نہیں ہوا تھا۔ ایک دن چند نوجوان بڑے کمرے میں بیٹھے ہوئے، زور زور سے بات چیت کر رہے تھے، انجم آئس کریم کی مشین کے قریب بیٹھا ہوا، برف توڑ رہا تھا۔ نوجوانوں کی آواز سُنکر وہ وہاں سے آکر، کمرے کی میزیں صاف کرنے لگا، اُس کا مقصد نوجوانوں کی گفتگو سننا تھا۔ نوجوانوں کی گفتگو کتنی دلچسپ تھی:۔

"ارشد! بھئی میں نے تو ابھی تک غزل نہیں کہی مشاعرہ"

"سر پر آپہنچا، عزت، آبرو خدا کے ہاتھ ہے ————"

"میرے تو چھ شعر ہو گئے ہیں، بس ایک مقطع رہ گیا ہے، وہ"

"گرتے پڑتے ہو ہی جائیگا۔ دو شعر تو ایسے ہو گئے ہیں ارشد!"

"کہ قسم خدا کی مشاعرہ کی چھت اڑ جائیگی۔ لیکن میں"

"مشاعرہ سے پہلے ایک شعر بھی نہیں سُناؤں گا، تمہیں معلوم ہے"

"کہ پچھلی مرتبہ میں نے مشاعرہ سے پہلے غزل سُنا دی تھی، اور"

"میرے ایک کرمفرما نے، میرے تین شعر مشاعرے میں پڑھ"

"دئے تھے۔"

"طاہر صاحب! میری غزل کے تین شعروں پر تو استاد قبلہ نے"

"خوب لکھ دیا ہے، بڑے محبت کے ساتھ اصلاح فرماتے ہیں"

" ہمارے استاد ! "

" ارے یارو! میرے والد آج مجھے بُرا بھلا کہنے لگے کہ تو شاعری "

" کے پیچھے کیوں پڑ گیا ہے، تباہ ہو جائے گا! میں نے جواب دیا کہ "

" شاعر تباہ حال ہی ہوتے ہیں۔ شاعری تو تباہی اور "

" پریشاں حالی کے بغیر ہو ہی نہیں سکتی، اس پر والد خاموش ہو گئے! "

" خوب جواب دیا تم نے رفیق! اجی، شاعری کا لطف "

" کوئی ہمارے جی سے پوچھے، قسم خدا کی دو دو وقت فاقے گذر جاتے ہیں "

" مگر بندہ برابر شعر کہے جاتا ہے۔ چچا جان کہتے تھے کہ رفیق "

" روپیہ پیسہ پیدا کرنے کی بھی کوئی تدبیر کرو، آجکل روپیہ، "

" پیسہ ہی سے عزت ہے، میں نے صاف کہہ دیا کہ چچا جان! ہماری "

" دولت بھی شاعری ہے، شاعروں کو اور روپیہ پیدا کرنے سے "

" کیا واسطہ! اجی دولت اور عزت تو اُن کے گھر کی لونڈی ہے "

" ارے جمیل! ابھی تو نے اس مہینہ کا رسالہ، باغ و بہار "

" بھی دیکھا، میری اُس میں ایک غزل چھپی ہے، ایڈیٹر صاحب نے "

" شکریہ کا خط بھی لکھا ہے۔ دیکھنا! ایک سال کے اندر تمام ہندوستان "

" پر چھا جاؤں گا! "

" اور ہاں! بھائی، میری ایک غزل تو سُنا ہے شہر کی بہت سی "

" طوائفیں گانے لگی ہیں، بھئی! چلیں گے کسی دن طوائفوں کے "

" بالاخانوں پہ! "

" ارے تو طوائفوں کو لئے پھرتا ہے، میری غزل نور کا رڈ "

" میں آ گئی ہے۔ شہر کے ہر ہوٹل میں میری غزل والا "

" رکارڈ بجایا جاتا ہے، ایک صاحب فرما رہے تھے۔ کہ اس زمین میں "

" غالب کی غزل کے ہم پلہ ہے۔ یہ ہمارے شہر کے نوجوان شاعر کی غزل! "

" یہ اخباروں اور رسالوں کے ایڈیٹر عجیب "

" منکیر واقع ہوئے ہیں کہ خطوں کا جواب ہی نہیں "

" دیتے، میں دسیوں غزلیں چھپنے کے لئے بھیج چکا ہوں، مگر "

" آج تک ایک غزل شائع ہوئی۔ اور نہ اُن "

" خدا کے بندوں نے کوئی جواب دیا۔ آخر کب تک "

" صبر کیا جائے، صبر کی کوئی حد بھی ہونی چاہیئے "

" بھائیو! مشاعرے میں اپنے لوگوں کے پاس بیٹھنا "

" اپنے دوستوں کی غزلوں کو چمکانا، آپ ہی لوگوں کے "

" ہاتھ ہے "

انجم نے مشاعرہ کی تاریخ اور مقام کا پتہ لگا لیا تھا، وہ شب میں ہوٹل کے منیجر سے رخصت لیکر مشاعرے میں پہنچا۔ مشاعرہ ہال تماشائیوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ شعرا ایک طرف کو سب سے الگ بیٹھے ہوئے تھے، شعرا کی تعداد سامعین کے مقابلہ میں نصف سے کچھ زیادہ ہی ہوگی، ان شاعروں میں ڈاکٹر، وکیل، حکیم، لوہار، درزی، انجینئر انگریزی اور عربی مدرسوں کے طلبا اور اساتذہ، شہر کے عمایدین، غرض ہر پیشہ کے لوگ موجود تھے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہو کہ ہر پیشہ اور ہر قوم کے نمائندے شاعر یہاں تشریف فرما تھے۔ انجم ایک طرف خاموشی کے ساتھ بیٹھ گیا۔ جس جگہ شعراء صاحبان تشریف فرما تھے، اُس کے مشرقی حصہ میں ایک بڑی چوکی بچھی ہوئی تھی، جس پر میلا سا قالین پڑا تھا۔ جو غالباً شاعروں کے لئے مخصوص تھا۔ چوکی کے ایک طرف اُگالدان رکھا تھا۔ اور دوسری طرف گیندے کے پھولوں کا گلدستہ تھا۔ مشاعرے کے دعوتی کارڈوں میں "ٹھیک آٹھ بجے" کا وقت لکھا تھا، مگر بڑی مشکل سے بعد، دس بجے مشاعرہ شروع ہوا۔ اور دس بجے بھی بعض اساتذہ کرام تشریف نہ لائے معلوم ہوا کہ استاد لوگ قصداً دیر سے تشریف لاتے ہیں۔ دس بجے کے قریب ایک صاحب نے ایک شاعر کا نام پکارا اور ایک بہت ہی کمسن لڑکا، چوکی پر جاکر بیٹھ گیا۔

"یہ آپ کا فرزند ہے، مولوی صاحب!" ایک شاعر نے دوسرے شاعر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں! بندہ زادہ ہے،" شاعر نے جواب دیا۔

اس لڑکے کا شاید پہلا موقع تھا مجمع کو دیکھ کر وہ مرعوب سا ہوگیا، وہ اتنا کمسن تھا کہ

ابھی مسیں غالباً بھیگنی بھی شروع نہ ہوئی تھیں۔ اُس نے گھبرا کر والد کی طرف دیکھا، والد نے آنکھ سے اشارہ کیا، والد قبلہ کے اشارے نے اُس کی ہمّت بڑھائی،

اُس نے گھبرائی ہوئی آواز میں یہ مصرعہ پڑھا:۔

"کوچۂ قاتل بھی اک دن آسماں ہو جائے گا"

اُس کی آواز یکا یک پست ہوگئی، دوسرا مصرعہ اُس سے پڑھا نہ جاتا تھا، اُس پر ایک بوڑھے شاعر نے فرمایا:۔

"میاں! سبحان اللہ! کیا طبیعت پائی ہے"

"ہاں! مصرعۂ ثانی پڑھیئے، خدا نظرِ بد سے"

"بچائے۔"

"میاں فاخر! تم مصرعہ اٹھاتے رہو، ابھی"

"بیچارہ بچہ ہے، اس سن و سال پر اتنی ہمّت"

"کی ہے! باپ کا فیض ہے"

لڑکے نے رو رو کر غزل تمام کی اور بڑے بوڑھے شاعر اُس کی حوصلہ افزائی فرماتے رہے، جب وہ غزل پڑھکر چوکی سے اترا ہے تو ابا جان نے اُس کو گلے لگا لیا۔ اگلے زمانہ میں بچوں کی جھجک نکالنے کے لئے تیغ و خنجر اور اسپ و چوگاں کی مشق کراتے تھے، مگر اس بیسویں صدی میں وہ نظریہ بدل گیا ہے۔ آجکل مشاعروں میں غزلیں پڑھوا کر بچہ کو بیباک بنایا جاتا ہے۔

اس لڑکے کے بعد دُوسرے شاعروں نے غزل خوانی کی بعض نوجوانوں نے اس قدر سریلے سروں میں غزلیں پڑھیں کہ اگر کلکتہ والی گوہر زندہ ہوتی، تو وہ بھی ایک بار اللہ ہو" کہکر رقص کرنے لگتی۔ ترنم کے ساتھ پڑھنے والے شعراء کو بہت زیادہ داد ملی معلوم ہوا کہ بہت سے لوگ مشاعروں میں ان گا نیوالے لڑکوں ہی کا گانا سننے کے لئے آئے تھے۔اس گانے کو آجکل کی شاعرانہ موسیقی کی اصطلاح میں "ترنم" کہتے ہیں۔

انجم لُطف کے ساتھ یہ تماشا دیکھ رہا تھا، عام لوگوں کی داد کا طرز شعراء اور خصوصاً اساتذہ صاحبان کی داد کے طرز سے جُدا تھا۔

"واہ انصیر صاحب، سبحان اللہ، کیا شعر فرمایا ہے۔"

"بے پناہ شعر ہے، اللہ غنی!"

"بھئی اس شعر کو پھر دہرانا قسم خدا کی لطف آ گیا"

"یہ قافیہ تو آپ ہی کا ہو گیا اصغر صاحب!"

"دُوسرا آدمی ایسا شعر کہے تو قسم خدا کی کلیجہ پھٹ جائے، منہ سے خون آنے لگے!"

"مسّی کو کلی سے تشبیہ دیکر، شعر کو عرش سے بھی بلند کر دیا"

"جوان بنا دینے والی غزل پڑھی ہے آپ نے بھائی شاکر!"

"آئے! ہائے! مار ڈالا ظالم، اُف ——!"

"ساری عمر یاد رہیگا آپ کا مصرعۂ ثانی ! "

"یہ شعر تو وجدان کو اپیل کرتا ہے "

اساتذہ صاحبان کی داد کو انجم نے بہت زیادہ غور وخوض کے ساتھ سُنا:۔

"میاں! ایک بار پھر تو پڑھ دو اس شعر کو، ——"

"شریف! ردیف سے خوب کام لیا ہے —— "

"جیتے رہو، کیا غزل سنائی ہے، "

"قبلہ چھمن صاحب! اس شعر کے تیور دیکھئے ! "

"صنعت لف ونشر مرتب اور پھر اس بے تکلفی کے ساتھ! واہ! "

"کیا کہنے صاحبزادے! آخر ہو بھی تو اُستاد ہی کے بیٹے ! "

"حقیقت کو مجاز سے کس قدر علیحدہ کر دیا ہے۔ "

"کتنے مشکل مسئلہ کو آسان بنایا ہے "

"قافیہ کتنا مبتذل تھا، اور تم نے اِسی ابتذال میں حسن پیدا کر دیا "

مشاعرے میں کئی ٹولیاں بیٹھی ہوئی تھیں، اور ہر ٹولی اپنے شاعر کو بڑھا رہی تھی، نومشق شعرا غزلیں پڑھ چکے تھے، اب استاد باقی رہ گئے تھے۔ حاضرین آواز دینے لگے:۔

"نظمیں پڑھوایئے، نظمیں پڑھوایئے"

مشاعرے کے منتظمین نے مشاعرہ کا رنگ دیکھ کر، دو تین نوجوانوں سے نظمیں پڑھوائیں

یہ نظمیں "کسان" "مزدور" اور ایسے ہی دوسرے عنوانوں پر تھیں، نوجوان طبقہ نے خوب داد دی۔ مگر اساتذہ صاحبان بالکل خاموش بیٹھے ہوئے پان چبا چبا کر اُگالدانوں میں تھوک رہے تھے اُن کی پیشانیوں کی لکیریں نفرت و حقارت کا اظہار کر رہی تھیں، زبان سے کہنے کی تو ہمت نہ پڑتی تھی، مگر اُن کے تیور زبانِ حال سے کہہ رہے تھے:۔

"بکواس کر رہے ہیں یہ لونڈے!

نظمیں ختم ہی ہوئی تھیں کہ ایک صاحب حاضرین کی صف سے نکل کر، چوکی کے قریب پہنچے، اور فرمایا۔

"اگر اجازت ہو تو میں بھی کوئی نظم عرض کروں"

"فرمائیے، شوق سے فرمائیے"

مجمع نے آواز دی۔

اس شخص نے بغل سے بیاض نکال کر جو پڑھنا شروع کیا ہے، تو مسلسل ایک گھنٹہ تک پڑھتا رہا۔ قومی نظم تھی، جس میں تمام دُنیا کے مسائل پر شاعر صاحب نے تبصرہ فرمایا تھا۔ حاضرین نے سیٹیاں بجانی شروع کیں، جب اس پر بھی وہ شخص باز نہ آیا۔ تو لوگوں نے فقرے کسنے شروع کئے اس پر وہ تن کر بولا:۔

"میں اسی مشاعرہ کے لئے دس کوس پیدل چلکر

"آیا ہوا ہوں، قسم خدا کی نظم کا ایک شعر بھی کم "

" نہ پڑھوں گا خواہ تم لوگ کتنے ہی چیخو ! "

مجمع نے قہقہے بلند کئے، مشاعرہ کے ایک نوجوان منتظم نے یہ رنگ دیکھ کر، اس "قصیر القامت" اور " طویل البیان " شاعر کے قریب پہنچکر آہستہ سے کہا:۔

" اب ختم کر دیجئے، مولوی صاحب ! "

شاعر نے بیاض کے ورق الٹتے ہوئے جواب دیا:۔

" بس کوئی پندرہ بند باقی رہے ہیں، ابھی ختم کئے "

" دیتا ہوں۔ "

مشاعرے سے چیخ پکار کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں، اور یہ شخص پڑھے جا رہا تھا۔ انجم نے لطف لینے کے لئے کھڑے ہو کر کہا:۔

" حضرت ! اس بند کو مکرر ارشاد فرمائیے "

حاضرین نے انجم کی طرف فخر کی نگاہوں سے دیکھا، شاعر کا کیا پوچھنا۔ اُسے بھی تو اک داد ملی تھی، اُس نے بند کو دہراتے ہوئے کہا:۔

" یہ ہی ایک سمجھدار شخص ہے، اس مشاعرے میں ! "

بڑی مشکل کے بعد اس شخص نے اپنی نظم ختم کی،

اس ہنگامہ کے بعد پختہ مشق شعرا کی باری آئی، ایک ادھیڑ عمر شاعر نے غزل پڑھی، اور اُس پر خوب داد ملی، اُس کے آخری شعر پر، ایک بوڑھے شاعر نے کہا:۔

"شعر تو خوب ہے لیکن "صحرا" کا الف دبتا ہے"

اس پر شاعر نے جواب دیا:-

"ایسی جگہ "الف" کا دبنا جائز ہے۔ عروض بھی پڑھی ہے آپ نے؟"

اس پر بحث شروع ہو گئی، اور فرقہ بندی کے ہاتھوں، اسی بحث نے "جنگِ عظیم" کے قریب قریب صورت اختیار کر لی، انجم اپنے قریب کے آدمیوں کو اُکسا رہا تھا۔ اور خود خاموش بیٹھا تھا۔ بڑی مشکل کے بعد یہ ہنگامہ فرو ہوا۔ اگر شہر کے ایک بااثر شخص خوشامد درآمد کر کے شعرائے کرام کو خاموش نہ کرتے تو یہ مشاعرہ پانی پت کا میدان بن جاتا۔ اس کے بعد دوسرے شعرا نے غزلیں پڑھیں، اور آخر میں شہر کے سب سے بڑے شاعر کی باری آئی۔

مشاعرہ کا دستور یہ تھا کہ شاعر کا نام پکارا گیا، اور شاعر بلا کسی توقف کے چوکی پہ آ کر غزل پڑھنے لگا۔ مگر یہ اُستاذ الاساتذہ، نام پکارے جانے کے بہت دیر بعد چوکی پر تشریف لائے۔ اور چوکی پہ بیٹھ کر

"السلام علیکم"

فرمایا۔ انگرکھے کی جیب سے عینک نکالی، اور آنکھوں میں لگی ہوئی عینک کو اُتار کر، جیب سے نکالی ہوئی عینک لگالی۔ اس کے بعد سارے مجمع پہ ایک نظر ڈالی، اور پھر مسلسل کئی مرتبہ اُگالدان میں تھوکا۔ ایک شاگرد نے ادب کے ساتھ بیاض پیش کی، استاد بیاض لیکر، بہت دیر تک اوراق اُلٹتے رہے۔ ایک ورق کو الٹ کر، رُک گئے، اور سر ہلایا۔ اس کے بعد آہستہ سے بولے۔

"فرصت کہاں تھی مجھے۔! خیر...... اچھا"

اُستاد نے غزل شروع کی، اور مطلع کا مصرعہ اولیٰ پڑھنے بھی نہ پائے تھے، کہ ارادتمند شاگردوں نے واہ واہ کے نعرے بلند کرنے شروع کئے۔ ہر شاگرد پوری قوت کے ساتھ داد دے کر شاگردی کا حق ادا کر رہا تھا۔ استاد کی غزل شاگردوں کی واہ واہ کے نعروں میں گھل مل کر رہ گئی، حاضرین کے پلّے ایک شعر بھی نہ پڑا۔ شاگردوں کے اصرار پر استاد نے دو ایک غزلیں اور سنائیں اور مشاعرہ کا ہال "واہ، واہ، سبحان اللہ" کے نعروں سے گونجتا رہا۔ قریب کی مسجد سے اذان کی آوازیں آ رہی تھیں۔ اور یہاں داد و ستائش کے نعرے بلند ہو رہے تھے۔ یہاں تک کہ دن نکل آیا۔ اور مشاعرہ بدستور جاری رہا۔ ان ہی حاضرین میں وہ لوگ بھی تھے جو رمضان کے مہینہ میں مسجد کے ملاؤں اور حافظوں سے اس بات پر جنگ کرتے ہیں کہ تراویح میں قرآن شریف کا ایک پارہ سے زیادہ نہ پڑھا کرو، تکان ہو جاتی ہے اور مشاعرے میں یہ خدا کے مقبول بندے آٹھ بجے سے صبح کے سات بجے تک بیٹھے رہے۔

مشاعرہ ختم ہونے کے بعد انجم ہوٹل پہنچا، اور اپنا کام کرنے لگا۔ تین چار دن کے بعد اُسے وہی نوجوان شاعر ملا، جس نے مزدور کی حمایت میں نظم اس ناز کے ساتھ پڑھی تھی۔ کہ گویا مزدور کے درد و غم کے مارے اس کا کلیجہ پھٹا جاتا ہے۔ یہی مزدور کا غمخوار انقلابی شاعر ایک مزدور سے مزدوری دینے پر جھگڑا کر رہا تھا۔ مزدور کہتا تھا۔ کہ چھ پیسے کم ہیں، دو پیسے اور دو، اور یہ کہہ رہا تھا لینا ہے تو لو، نہیں تو پھر ان چھ پیسوں سے بھی ہاتھ دھونے پڑیں گے۔ انجم نے شہر کے

شاعروں کی زندگی کے حالات کی ٹوہ لگائی، تو اسے معلوم ہُوا کہ بُہت سے نوجوان شاعروں نے بعض شاعروں کے اتباع میں شراب پینی شروع کردی ہے۔ان میں سے اکثر آوارہ اور لفنگے ہیں، جن کا دن رات کا مشغلہ شعر سناتے پھرنا اور داد حاصل کرنا ہے۔ ان میں شعراء کی بہت بڑی تعداد جاہل ہے جو اُردو الفاظ کا املا بھی صحیح طور پر نہیں لکھ سکتی۔ اس جہل پر دعوےٰ یہ ہے کہ بین الاقوامی مسائل کا حل ان سے بہتر کوئی نہیں جانتا۔ اشتر کیت اور رفاسطیت اور پاربیمانی دستور کو ان سے بہتر کوئی سمجھ ہی نہیں سکتا۔ ان ہی شاعروں میں سے بعض "انقلابی" کہے جاتے ہیں جو مذہب کے منکر ہیں، اور مُنکر ہی نہیں بلکہ مذہب کا مذاق اڑاتے ہیں۔ یہ لوگ مذہب کے مبادی سے بھی واقف نہیں ہیں، اور کسی مذہبی کتاب کے مطالعہ کی بھی صلاحیت نہیں رکھتے، لیکن ڈنکے کی چوٹ کہتے ہیں کہ:۔

"مذہب انسانوں میں تفریق پیدا کرتا ہے۔"

انجم اشارات (Hints) کے طور پر اپنے تجربات اور مشاہدات کو لکھتا جاتا تھا۔ شعراء کے سلسلہ میں اُس نے نوٹ کیا۔

نوجوانوں کا ایک خطرناک گروہ"

"شعر و ادب کی گمراہیاں"

انجم کو یہ بھی معلوم ہوا کہ، ان ہی شعراء میں سے جو سرمایہ داری کی مخالفت کیا کرتے ہیں" بہت سے ایسے شعراء بھی ہیں، جن کے دل و دماغ پر ہر وقت دولت و عیش کے تصوّرات چھائے رہتے ہیں، جو کنجوس بنیوں سے بھی زیادہ لالچی ہیں، اور دولتمندوں کی چشم التفات کے لئے جن کی شاعرانہ

عظمت اور انقلابی خودداری ہر وقت سرگرداں اور متجسس رہتی ہے۔یہی انقلابی شاعر، بہتر سے بہتر لباس پہنتے اور اچھے سے اچھا کھانا کھاتے ہیں، اور اپنی خواہشوں کی تکمیل کے لئے اپنے ضمیر کی بڑی سے بڑی قربانی دے سکتے ہیں،

شہر میں اسمبلی کے انتخاب کا ہنگامہ گرم تھا۔شہری حلقہ سے دو مسلمان رُکنیت کے لئے کھڑے ہوئے تھے، ایک تو شہر کے رئیس خان بہادر شیخ رفیع احمد تھے، اور دُوسرے رُکن خواجہ کمال تھے، جو اگرچہ خان بہادر صاحب کے مقابلہ میں بہت غریب تھے، مگر ان کی قومی خدمات نے ان کو ہر دلعزیز بنا دیا تھا۔انجمؔ نے ہوٹل کی ملازمت چھوڑ دی، اور تھوڑی کوشش کے بعد وہ خان بہادر صاحب کے یہاں ملازم ہوگیا۔انجم نے خان بہادر کو باور کرا دیا تھا، کہ وہ بہت سے انتخابات لڑ چکا ہے، اور اس فن میں اُس کا ثانی شہر میں تو مشکل ہی سے نکلے گا۔خان بہادر صاحب کنجوس تو نہ تھے، مگر ہاں محتاط ضرور تھے، بہت ہی دیکھ بھال کر پیسہ خرچ کرتے تھے، لیکن انتخاب میں کھڑے ہونے ہی وہ انتہائی دریا دل بن گئے۔گذشتہ سال شہر کی جامع مسجد کی مرمت کا مسئلہ پیش ہُوا تو خان بہادر صاحب نے پچاس روپیہ کی رقم بہت ہی مشکل سے دی، وہ بھی صاحب ضلع نے سفارش کردی تھی، مگر اب تو انہوں نے تھیلیوں کے مُنہ کھول دئے تھے، مسجدوں، یتیم خانوں، مدرسوں اور خانقاہوں کی امداد کی جارہی تھی، غرباء کو کھانا تقسیم ہوتا تھا، خان بہادر کے یہاں انجمؔ کے علاوہ اور بہت سے نئے آدمی نوکر ہوگئے تھے، شہر کے بعض چلتے پرزے لوگوں کی تو چاندی تھی، وہ تو خان بہادر کے ساتھ سایہ کی طرح لگے پھرتے تھے۔انجمؔ نے دیکھا کہ الوداع کے جمعے سے ایک ہفتہ قبل، ایک ماسٹر نے جو خان بہادر

کے بچوں کو پڑھاتا تھا ایک تقریر لکھ کر خان بہادر کو دی، خان بہادر نے چھ سات دن اس تقریر کی خوب مشق کی، پھر بھی جمعہ کے دن جب وہ تقریر کرنے کھڑے ہوئے ہیں۔ تو کئی جملوں پر زبان پٹنے لگی، خان بہادر کی تقریر کا خلاصہ کتنا دلچسپ ہے :۔

"میں قوم وملت کی خدمت کے لئے کھڑا ہو رہا ہوں"

"میں اسلام کے لئے اپنے خون کا آخری قطرہ پیش"

"کر دوں گا۔ میں اپنی ہر چیز قوم وملک پر قربان"

"کرنے کے لئے تیار ہوں، اسمبلی میں جا کر آپ کے حقوق"

"کی ترجمانی مجھ سے بہتر اور کوئی کر نہیں سکتا۔ میں نے"

"جس خاموشی کے ساتھ قوم کی خدمت کی ہے۔ وہ آپ لوگوں"

"سے پوشیدہ نہیں ہے، میں خدا کے گھر میں ان باتوں"

"کا اعلان کر رہا ہوں ——— حضرات ——— !"

خاں بہادر کی حمایت میں قدِ آدم پوسٹر شائع کئے گئے جن میں خان بہادر کی "بے پناہ قومی خدمات" کا ذکر تھا، اور جن میں بتایا گیا تھا۔ کہ ان سے بہتر نمائندہ شہر کو مل ہی نہیں سکتا شہر میں ایک عالم کا بہت اثر تھا، سینکڑوں مسلمان اُن کے مرید تھے، انجم نے ان ہی شیخ طریقت کے رام کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ انجم مولوی صاحب کے یہاں پہنچا۔ مولوی صاحب زنانہ میں تھے اور اُن کے مرید خانقاہ میں بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے انجم نہایت ہی ادب کے ساتھ سلام کر کے، ایک

کونے میں بیٹھ گیا۔ مرید خوش ہوئے کہ ایک اور ارادت مند کا اضافہ ہوا۔ مریدوں نے مولوی صاحب کے زہد و ورع کے افسانے سنانے شروع کیے۔ اور اس میں یہاں تک مبالغہ کیا۔ کہ اپنے پیر و مرشد کو امام ابو حنیفہؒ سے بھی بڑھا دیا۔ انجمؔ خاموشی کے ساتھ سب کی باتیں سنتا رہا۔ ایک گھنٹے کے بعد مولوی صاحب کے زنانخانہ سے اطلاع آئی کہ حضرت کے سر میں درد ہے۔ عصر کے بعد باہر تشریف لائیں گے، انجمؔ مولوی صاحب کے اہل جائیداد کی ذہنیتوں کا اندازہ کر چکا تھا۔ اُس نے خان بہادر صاحب کی طرف سے دو چار دن میں اُن لوگوں کی تین چار دعوتیں کر دیں، اب یہ لوگ رام ہو چکے تھے۔ انجمؔ اُن کو سب کچھ سمجھا چکا تھا کہ مولوی صاحب سے کیا کام لینا ہے؟ ایک دن صبح کے وقت انجمؔ مولوی صاحب کے یہاں پہنچا۔ مولوی صاحب ایک نہایت ہی بھڑکیلے قالین پر تشریف فرما تھے، اور مریدین اس طرح مؤدب بیٹھے تھے کہ اب کچھ دیر میں یہ لوگ سجدہ میں جھکنے والے ہیں، انجمؔ نے السلام علیکم کہا، مولوی صاحب تو خاموش بیٹھے رہے، مگر اور لوگوں نے سلام کا جواب دیا۔ مولوی صاحب نے آنکھ کا اشارہ کیا! اور انجمؔ ایک طرف کو سُکڑ کر بیٹھ گیا۔

"قبلہ! یہی صاحب، خان بہادر کی طرف سے

آئے ہیں" ایک مُرید نے ہاتھ جوڑ کر عرض کیا۔

"ہاں۔! میاں تمہارا کیا نام ہے؟" مولوی صاحب نے انجمؔ سے دریافت کیا۔

"بندۂ درگاہ کا نام عزیزالدین خاں ہے" انجمؔ نے جواب دیا۔

"تم کو خان بہادر نے بھیجا ہے۔" مولوی صاحب نے عمامہ کے پیچوں کو چھوتے

ہوئے کہا۔

" جی حضور! خان بہادر صاحب ہی نے بھیجا ہے۔ خان بہادر صاحب"

" اسمبلی کی رکنیت کے لئے کھڑے ہوئے ہیں، حضور کی"

" امداد کی ضرورت ہے ــــــــــــــ" انجم یہ کہتے ہوئے کھڑا ہو گیا

" میں خان بہادر کی امداد کے لئے تیار ہوں، مگر میں نے"

" سُنا ہے کہ یہ خان بہادر، وہابی عقاید رکھتا ہے"

" اور میرے عقیدے میں تو جو شخص مزار پر چادر چڑھانے"

" بزرگانِ دین سے امداد مانگنے اور تیجا چالیسواں"

" کرنے کو اچھا نہیں سمجھتا، کافر ہے کافر! اُن باتوں"

" کا انکار کرتے ہی اُس شخص کی بیوی پر طلاق پڑ"

" جاتی ہے۔ "مولوی صاحب نتھنے پھُلا کر بولے،

" قبلہ! یہ آپ سے خان بہادر کے کسی دشمن نے غلط واقعہ"

" بیان کر دیا ہے۔ خان بہادر صاحب تو پکّے مسلمان ہیں"

" شہر کا کوئی مزار ایسا نہیں ہے جس پر ہر جمعرات کو"

" خان بہادر صاحب کی طرف سے چادر نہ چڑھائی جاتی ہو۔"

" خان بہادر کو میں نے اپنی آنکھوں سے مزاروں کی چوکھٹ

" پر سر رگڑتے دیکھا ہے۔ وہ تو اکثر فرمایا کرتے ہیں"

" کہ خواہ ایک وقت کی نماز قضا ہو جائے، مگر مزاروں کی "

" حاضری ناغہ نہیں ہو سکتی۔ خان بہادر کا تو سارا گھرانا"

" مذہبی ہے۔ خان بہادر کے چچا نے تو اپنی جائداد "

" رہن رکھ کر، اپنی مرحومہ بیوی کا چالیسواں اس دھوم سے کیا"

" کہ سارے شہر میں واہ واہ ہوئی۔ "

" خان بہادر کی مذہبیت اور پختگیٔ ایمان کی کہاں تک "

" تعریف کروں ایک مرتبہ ایک بزرگ کے عرس کے موقعہ پر وہ فرماتے "

" لگے کہ اللہ میاں کے ساتھ گستاخی ہو جائے، تو زیادہ ہرج نہیں، مگر "

" ان بزرگانِ دین کے ادب میں، اگر ذرا سا بھی فرق آگیا، تو ایمان کی "

" خیر نہیں، غیرتِ الٰہی جوش میں آجاتی ہے۔ خان بہادر صاحب تو فخر "

" کے ساتھ اپنے کو "بدعتی" کہا کرتے ہیں " انجم نے نہایت ادب کے ساتھ جواب دیا "

" سبحان اللہ! خان بہادر کی مذہبیت کا حال معلوم کرکے "

" بڑی خوشی ہوئی۔ فخراہم اللہ خیر الجزا۔ آجکل عقیدے کی "

" ایسی ہی سختی کی ضرورت ہے، "

" بھائی! میں تو اللہ واسطے اُن کی امداد کروں گا، اور "

"ہاں اسمبلی میں ان کے جانے سے مسلمانوں کا کیا فائدہ ہوگا؟" شاہ صاحب نے قالین کی سلوٹ نکالتے ہوئے دریافت کیا۔

انجم جواب دینا ہی چاہتا تھا کہ ایک مرید صاحب بیچ میں ٹپک پڑے:۔

"قبلہ و کعبہ! اسمبلی میں جا کر خان بہادر صاحب مسلمانوں"

"کے حقوق کی حفاظت کریں گے، اُن کی بہتری کے لئے"

"تدبیریں بتائیں گے ——————— مرید نے کہا۔

"حقوق کی حفاظت سے تمہارا کیا مطلب ہے "مولوی صاحب نے پوچھا،

"اسمبلی کے رُکن بنتے ہی، خان بہادر صاحب کا حکام میں رسُوخ"

"بڑھ جائیگا۔ اور وہ حکام سے بہُت کچھ کام لے سکتے ہیں مثلاً قبلہ کے داماد کا جو مقدمہ دیوانی میں چل رہا ہے"

"شاہ صاحب، حکام سے کہہ سن کر، اس میں بہت کچھ کر سکتے ہیں" مرید ٹوپی تھامتے ہوئے بولا۔

"اگر ایسا ہُوا تو خاں بہادر صاحب قوم و ملک کی بہُت بڑی"

"خدمت انجام دیں گے، اچھا ہمارے تمام مریدوں میں اعلان"

"کر دو کہ وہ اپنی رائے خان بہادر صاحب کو دیں، خان بہادر کے"

"سوا کسی دوسرے کو رائے دینا از روئے شرع گناہ، بلکہ،"

"قریب کفر ہے" شاہ صاحب نے گاؤ تکیہ کا سہارا لیتے ہوئے جواب دیا۔

انجم تھوڑی دیر بعد بیٹھ کر چلا آیا۔ خان بہادر کا حریف اگرچہ غریب آدمی تھا، مگر اس کی قومی خدمات سب پر روشن تھیں، اور شہر میں وہ کافی ہر دلعزیز تھا۔ خان بہادر دولت کے بھروسہ پر کھڑے ہوئے تھے، اور وہ شخص خلوص و اعتماد کے سہارے انتخاب کی مہم میں شامل ہوا تھا۔ خواجہ کمالؔ بہت اچھا مقرر تھا، اور دستوری مسایل سے اُس کو خاص واقفیت تھی۔ خان بہادر جس حلقہ میں کنکری کی طرح پیسہ اُٹھاتے، وہاں خواجہ کمالؔ کی ایک تقریر کافی تھی، عین انتخاب کے دن انجم غائب ہو گیا، اور افسانوں کے بہت سے خاکے لیکر وطن واپس ہُوا، اُس نے وطن آکر، اخبار کے اُسی ایڈیٹر کو خط لکھا جس نے انجم سے عشقیہ افسانہ طلب کیا تھا، انجم نے لکھا:۔

"میں سفر سے واپس آگیا ہوں، نہایت ہی پُر لُطف"
"اور دلچسپ پلاٹس کو افسانوں کا جامہ پہنا رہا ہوں"
"عنقریب ایک افسانہ بھیجدوں گا۔"

مخلص "انجم"

عاشقی سے توبہ

"بہت سی دانائی کی باتیں غیر دلچسپ، اور بہت سی حماقت کی
باتیں دلچسپ ہوتی ہیں"۔

"جس نقطۂ نگاہ سے علم کو "حجابِ اکبر" کہا گیا ہے، اُسی
نقطۂ نگاہ سے، دانائی بھی "حماقتِ مکمل" کہی جا سکتی
ہے" ——————

عاشقی سے توبہ

حضرت ذوقؔ کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے، کتنی سچی بات کہہ گئے ہیں:-

گلہائے رنگ رنگ سے ہے زینتِ چمن
اے ذوقؔ اس جہاں کو ہے زیب اختلاف سے

جس طرح انسان، بہ اعتبارِ شکل و صورت ایک دوسرے سے مختلف ہیں، بالکل اسی طرح طبیعتوں اور مزاجوں میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے، ایک ہی ماں اور باپ کے دو بیٹوں کی طبیعتوں اور مزاجوں کا آپ اندازہ لگائیں گے، تو آپ دونوں کی طبیعتوں میں کچھ نہ کچھ اختلاف ضرور محسوس کریں گے، ذہین، غبی، عقلمند، بیوقوف، سخت مزاج، نرم خو، بردبار، کمینہ، شریف وغیرہ وغیرہ) یہ تو وہ چند مشہور لقب ہیں، جن کو ایک گنوار سے گنوار آدمی بھی جانتا ہے۔ ان ناموں میں سے ہر نام کو اگر "نوع" قرار دیا جائے تو ہر "نوع" کی بیشمار صنفیں بن سکتی ہیں ماہرینِ نفسیات نے اگرچہ انسانوں کی، مزاجوں اور طبیعتوں کے اعتبار سے مجموعی طور پر تقسیم کی ہے، لیکن یہ تقسیم ہر اعتبار سے نامکمل ہے جس طرح آسمان کے تاروں درختوں کے پتوں اور زمین کے ذروں کی گنتی نہیں ہو سکتی، اسی طرح انسانی طبائع اپنے اختلافات کے لحاظ

سے شمار میں نہیں آسکتیں۔

آپ کسی جلسہ یا پارٹی میں، بہت سے آدمیوں کو تھوڑی دیر غور سے دیکھئے۔ تو آپ کو پتہ چلیگا۔ کہ ہر شخص ایک دوسرے سے مختلف انداز رکھتا ہے۔ کوئی آپ کو پیر ہلاتا ہوا ملیگا، کوئی مونچھوں کو بار بار تاؤ دیتا ہوگا، کوئی ناخن کی کور کھٹکتا ہوگا، کوئی اپنے شانوں کو ہلاتا ہوگا۔ کوئی جلد جلد سگرٹ پیتا ہوگا، غرض ہر شخص میں ایک امتیازی خصوصیت نظر آئے گی، ان حرکات کو آپ معمولی، اور عارضی اور غیر اہم سمجھ کر نظر انداز نہ فرمادیجئے، ان حرکات سے ان لوگوں کی نفسیات کا پتہ چلتا ہے۔ مطلب عرض کرنیکا یہ ہے۔ کہ اسی آسمان کے نیچے اور اسی زمین کے اوپر، بھانت بھانت کے انسان پائے جاتے ہیں، جو شکل وصورت اور مزاج طبیعت کے اعتبار سے مختلف ہیں۔

شکل وصورت اور طبایع کے اختلاف نے، دنیا کو بہت زیادہ متنوع اور دلچسپ بنا دیا ہے۔ اگر یہ تنوع اور اختلاف نہ ہوتا۔ تو یہ آباد دنیا بڑی ہی غیر دلچسپ ہوتی۔ اس تنوع اور بوقلمونی کے بعد تو انسان کا یہ عالم ہے۔ کہ ایک جگہ بہت دن تک رہنے کے بعد، اُس کا جی اُکتا جاتا ہے، اور اگر کہیں یہ رنگارنگی نہ ہوتی، تو نہ معلوم کتنے آدمی ہر منٹ خود کشی کی موت مرجایا کرتے۔ قدرت نے انسان کو فطری طور پر "تنوع پرست" بنایا ہے، وہ ایک حال پر قانع نہیں رہتا۔ وہ تتلی کی طرح ایک ایک پھول کے رس کا مزہ لینا چاہتا ہے۔ اُس کا دل پریوشوں کے جھرمٹ سے بھی اکتا جاتا ہے، اور پھولوں کی سیج پر بھی وہ بے چین نظر آتا ہے، ہم نے اس تنوع پرستی کے ہاتھوں، عالیشان قصروں کے رہنے والوں کو، بیابان جنگلوں میں گھومتے ہوئے دیکھا ہے۔

حماقت اور سادہ لوحی کو ہم اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتے، حالانکہ ان ہی حماقتوں سے ہم دانائی کی باتیں سیکھتے ہیں، اور یہی احمق لوگ، ہم کو عقلمند بناتے ہیں۔ یہ تو خیر ایک فلسفیانہ زاویۂ نگاہ ہے معاشرت کی سیدھی سادھی دُنیا میں آکر دیکھئے تو حماقت کی بہت سی باتیں، دلچسپ ہوتی ہیں، جن سے ہم لطف لیتے ہیں۔ اگر دُنیا میں سب عقلمند ہی عقلمند ہوتے، اور ہر شخص دانائی اور حکمت کی باتیں کیا کرتا، تو میرا خیال نہیں، بلکہ یقین ہے کہ دانائی اور حکمت سے انسان نفرت کرنے لگتا۔ اور یہ دُنیا سقراط کی کوٹھری اور فیثا غورث کا نہ خانہ بن کر رہ جاتی۔

"کتنی وبال جان ہوتی یہ "حکمت زدہ زندگی"۔!

سادہ لوح انسان حقیقت میں بہت ہی قابلِ قدر ہستیاں ہیں، معاشرت، ان کی اہمیت کا انکار نہیں کر سکتی۔ ہماری زندگی کی بہت سی دلچسپیاں ان ہی لوگوں کی "احمقانہ حرکات" کے سبب قائم ہیں۔ ہماری نفریحی گفتگو کے بہت سے موضوعات، ان ہی لوگوں کی باتیں ہوتی ہیں، قدرت نے دانائی اور حماقت میں کتنا دلچسپ تناسب قائم فرمادیا ہے! حماقت اور سادہ لوحی کی بہت سی قسمیں ہیں، اور پھر ہر قسم اپنی بیسیوں ذیلی اصناف رکھتی ہے۔ اُن لوگوں کو چھوڑیئے۔ جو واقعی "بیوقوف اور سادہ لوح" ہوتے ہیں۔ میں اُن عقلمندوں اور مفکر لوگوں کا ذکر کرتا ہوں، جو دانائی اور قابلیت میں اپنی آپ نظیر ہیں، ایسے لوگ بھی کبھی نہ کبھی سادہ لوحی کی باتیں کر جاتے ہیں۔ لہٰذا ان لوگوں کو "مستقل بیوقوف" نہیں تو "عارضی بیوقوف" ضرور ماننا پڑے گا۔

قاسم بھی ایک ایسا ہی سادہ لوح انسان تھا، جس کی باتیں لوگوں کے لئے دلچسپی کے

سامان مہیا کرتی رہتی تھیں۔ اُس کی حماقت میں اُس کی غیر حاضر دماغی کو بہت دخل تھا۔ اب آپ اس غیر حاضر دماغی کو خواہ نگاہ کی چوک کہیے، یا ذہن و حافظہ کی بھول اور کمزوری سے تعبیر کیجئے۔ محلہ کے بڑے بوڑھے لوگوں کا بیان تھا کہ قاسم کے دادا بھی ایسے ہی "ابوالہول" قسم کے تھے۔ ایک مقدمہ میں گواہ تو تھے مدعی کے، اور گواہی دے آئے مدعا علیہ کے موافق، نتیجہ یہ ہوا کہ دعویٰ خارج ہو گیا۔ قاسم کے باپ کے بارے میں بھی یہی مشہور تھا۔ کہ وہ سادہ لوحی میں اپنے باپ کے جانشین تھے، ایک انگریز کو انہوں نے ایک مرتبہ آموں کی ڈالی بھیجی، اور ہر آم چکھ چکھ کر ٹوکرے میں رکھا۔ وہ جو ڈاکٹر اقبال نے کہا ہے کہ:۔

باپ کا علم نہ بیٹے کو اگر ازبر ہو

پھر پسر قابلِ میراثِ پدر کیونکر ہو

تو قاسم ہر اعتبار سے میراثِ پدر کا اہل تھا۔ قاسم کے باپ دادا کے متعلق جو کچھ میں نے اوپر کہا ہے۔ وہ میرے الفاظ نہیں ہیں۔ بلکہ میں نے روایت کو بلفظہٖ نقل کر دیا ہے۔ لہٰذا "گناہ بر گردنِ راوی" کے تحت، مجھ پر کوئی الزام عاید نہیں ہو سکتا۔ بلکہ میں تو اس سلسلہ میں اتنا اور اضافہ کرتا ہوں۔ کہ جب کوئی شخص اچھا کام کرتا ہے۔ اور اُس کے چرچے ہونے لگتے ہیں، تو لوگ اُس شخص کے باپ، دادا کی اچھائیاں بیان کر کے کہتے ہیں:۔

"اس کے باپ دادا بھی ایسے ہی شریف"

"اور عالی حوصلہ تھے۔"

اب اگر وہی شخص بدنام ہوجاتا ہے، تو اُس کے پورے خاندان میں عیب نکالے جاتے ہیں خدا کرے

قاسم کی سادہ لوحی کا سلسلہ دور تک نہ پہنچا ہو۔

(۱)

ایک مرتبہ قاسم کرایہ کی سائیکل لیکر بازار گیا، کپڑے کی دوکان پر پہنچکر، اُس نے سائیکل دوکان کے قریب کھڑی کی اور دوکان میں گھس گیا تھوڑی دیر کے بعد وہ دوکان سے باہر آیا۔ اور ایک دوسرے شخص کی سائیکل کو جو اسکی سائیکل کے قریب کھڑی تھی لیکر چلتا ہوا سائیکل کی دوکان پر پہنچکر، اُس نے سائیکل واپس کی،

"ارے! یہ کس کی سائیکل ہے؟" سائیکل والا، سائیکل کو غور سے دیکھتے ہوئے بولا۔

"آپ ہی کی دوکان کی سائیکل ہے؟" قاسم نے جیب سے رومال نکالتے ہوئے جواب دیا

"یہ سائیکل ہماری دوکان کی نہیں ہے۔"

"آپ کس کی سائیکل لے آئے؟" سائیکل والے نے کہا۔

"عجیب مشکل ہے، ارے بھئی! ذرا غور سے دیکھو"

"کہیں تمہاری نگاہ دھوکا تو نہیں دے رہی؟" قاسم انگلی کی انگوٹھی کو گھماتے ہوئے بولا

"میں، بھلا اپنی سائیکل کو بھول سکتا ہوں، اوّل"

"تو یہ ٹیکسی سائیکل ہی نہیں ہے، ٹیکسی سائیکل کے نمبر"

"کی پلیٹ کا رنگ سُرخ ہوتا ہے، اور اس سائیکل"

"کی پلیٹ کا نمبر پیلا ہے۔ پھر میری تمام سائیکلیں"

"نئی ہیں، اور یہ سائیکل تو ایک دو سال کی چلی"

"ہوئی معلوم ہوتی ہے۔"

"مولوی صاحب! آپ میری سائیکل لاکر دیجئے نہیں تو"

"مجھے پولیس کو اطلاع دینی ہوگی" سائیکل والا ذرا ترش ہو کر بولا۔

قاسم کو پولیس کا نام سنکر پسینہ آگیا، قاسم سائیکل پر سوار ہو کر، بازار کی طرف بھاگا، قاسم جس شخص کی سائیکل لے کر چلا آیا تھا، اس نے پولیس کے تھانہ میں اطلاع کردی تھی، اور وہ تھانہ سے باہر نکل ہی رہا تھا۔ کہ قاسم اس کے قریب سے تیزی کے ساتھ گذرا۔ وہ شخص قاسم کی طرف جھپٹا اور زور زور سے کہنے لگا:۔

"چور ہے، چور ہے، پکڑ لو، دیکھو"

"جانے نہ پائے"

قاسم نے مڑ کر دیکھا، تو ایک شخص بے تحاشہ اس کے پیچھے بھاگا چلا آرہا تھا۔ قاسم گھبرا کر سائیکل سے اتر پڑا۔ سائیکل کے مالک نے، قاسم کے ہاتھ سے سائیکل چھین کر قاسم کو زور سے جھٹکا دیا۔

"دیکھئے آپ شرافت کی حد"

"گذرے جا رہے ہیں۔" قاسم گھبرا کر بولا۔

"سائیکلوں کی چوری کرتا ہے، اور اس پر شریف"

"بنتا ہے۔" ــــــــــــــــــــــــ سائیکل کے مالک نے جواب دیا۔

اتنے میں کچھ لوگ جمع ہو گئے۔ اور پولیس کا ایک سپاہی بھی آ گیا۔ بیچ سڑک پر تیزی کی گفتگو ہونے لگی۔ قاسم سپاہی اور سائیکل کے مالک کو کپڑے کی دوکان پر لے گیا۔ وہاں ٹیکسی سائیکل رکھی ہوئی تھی، جب کہیں جا کر معاملہ رفع دفع ہوا۔ نہیں تو میاں قاسم، پولیس کے مہمان ہو ہی گئے تھے قاسم سائیکل لے کر سائیکل کی دوکان پر پہنچا۔ اور سائیکل واپس کرتے ہوئے بولا:۔

"تمہاری سائیکلیں بہت منحوس ہیں"

"جب لیجاتا ہوں کوئی نہ کوئی بات ہو جاتی ہے"

سائیکل والے نے ہنسکر جواب دیا۔

"بہت اچھا! تو آئندہ سے آپ کسی ایسی دوکان پر تشریف لے جایا کیجئے، جہاں کی سائیکلیں خوش نصیب اور مبارک ہوں"

قاسم، سائیکل کا کرایہ دے کر گھر چلا آیا۔

(۲)

ایک دن دوپہر کو قاسم اپنے مکان کے چھوٹے کمرے میں، دروازہ بند کر کے سو رہا تھا۔ قاسم کی بیوی دالان میں بیٹھی ہوئی سینے کی مشین چلا رہی تھی۔ اسی کمرے میں پہلے سے ایک بلی سو رہی تھی۔ قاسم کے خراٹوں نے بلی کو نیند سے ہشیار کر دیا۔ بلی دروازے پر پہنچی تو دروازہ بند تھا۔ بلی نے گھبرا کر پنجوں سے کواڑوں کو کھرونچنا شروع کیا۔

بلّی دروازہ کھولنے کی جتنی کوشش کرتی تھی، اتنا ہی اُس کی گھبراہٹ میں اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ وہ تھک کر ہانپنے لگی، کواڑوں کے بجنے کی آواز سُنکر، قاسم کی آنکھ کھل گئی، اُس نے دیکھا کہ ایک موٹی سی بلّی مار مار کر کواڑوں کو پنجوں سے کھرونچ رہی ہے، وہ گھبرا کر اٹھ کر بیٹھ گیا، بلّی نے اُس کو گھبرائے ہوئے انداز میں دیکھا، بلّی کا دیکھنا تھا کہ قاسم چیخ مار کر، کونے میں رکھی ہوئی میز پر چڑھ گیا۔ شوہر کے چیخنے کی آواز سُنکر بیوی دالان سے دوڑی ہوئی آئی۔

" کیا ہوا۔ خیر تو ہے ؟ " قاسم کی بیوی نے گھبرا کر پوچھا۔

" بیگم مجھے بچاؤ، بڑا نازک معاملہ ہے۔"

" بس کوئی دیر میں بلّی مجھ پر حملہ کرنے ہی"

" والی ہے"

قاسم کی بیوی نے جو اندر جھانکا۔ تو کیا دیکھتی ہے۔ کہ قاسم میز پر کھڑا ہوا تھر تھر کانپ رہا ہے اور اُس نے اپنی باہوں سے چہرے کو چھپا رکھا ہے، بلّی دروازے کے کھولنے کی کوشش کر رہی ہے

" اے ہے! کیسے مردوئے ہو، گھر کی رہنے والی"

" بلّی سے ڈرتے ہو۔ " قاسم کی بیوی نے کہا۔

" بیگم! اس وقت نصیحت کرنے کا وقت نہیں ہے۔"

" خوف کے مارے میرا بُرا حال ہوا جاتا ہے۔ میرا دل خدا کی"

" قسم بیٹھا جا رہا ہے " قاسم نے ٹکڑے ٹکڑے کرکے

بات پوری کی،

قاسم کی بیوی تنومند عورت تھی، پھر شوہر کے بچانے کے خیال نے اُس کو زیادہ طاقت ور بنا دیا تھا۔ اُس نے کواڑوں کو زور زور سے دھکے دئے چوتھی لات میں زنجیر ٹوٹ گئی، بلّی کے پنجے تو کواڑوں سے چمٹے ہی ہوئے تھے، اُس نے دروازے کے پٹ کو پنجوں سے پکڑ کر کھینچا۔ تو دروازہ کھل گیا اور وہ اس طرح گھبرائی ہوئی نکل کر بھاگی، جیسے کوئی گورا سپاہی سرحد پر بندوق کی آواز سُنکر بھاگ پڑتا ہے۔ قاسم کی بیوی، اندر داخل بھی نہ ہونے پائی تھی۔ کہ قاسم میز سے کود کر، دروازے کے قریب آگیا۔

"بیگم! تم نے بڑا کام کیا، بھئی، بڑی بہادر"

"اور عقلمند نکلیں ——— تم تو ——! " قاسم نے قدرے گھبرا کر کہا۔

"تم مرد ہو کر ایسی باتیں کرتے ہو، مجھے بڑا اچنبھا"

"ہو رہا ہے، کوئی دوسرا اس واقعہ کو سنیگا، تو کیا کہیگا؟" بیوی نے جواب دیا۔

"بیگم! یہ بہادری اور مردانگی دکھانے کا موقعہ"

"نہ تھا۔ تم نہیں جانتیں کہ گھری ہوئی بلی اژدہبرنی"

"ہوتی ہے۔ اور پھر میں خالی ہاتھ بھی تو تھا۔ " قاسم دروازے کی چوکھٹ پر پیر رکھتے ہوئے بولا۔

"اچھا! تم نے باہوں سے اپنے چہرہ کو کیوں"

"چھپالیا تھا" بیوی نے دریافت کیا۔

"تم کو بلی کے متعلق ذرا بھی معلومات نہیں ہے"

"یہ ظالم، آدمی کے چہرے پر حملہ کر کے، پنجوں سے"

"آنکھوں کو پھوڑ دیتی ہے، میں نے اسی لئے چہرہ"

"کو چھپالیا تھا، کہ اگر اُس نے حملہ کیا، تو بس باہیں"

"زخمی ہوجائیں گی، چہرہ اور آنکھوں"

"کو کوئی صدمہ نہ پہنچے گا" قاسم نے بیوی کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

"تم بھی عجیب متضاد قسم کے آدمی ہو، کل ہی کی بات ہے"

"کہ تم غدر کے حالات پڑھتے وقت، غصہ سے بے تاب ہو کر"

"کہہ رہے تھے، اگر میں ہوتا۔ تو جان پر کھیل جاتا۔ ان مردود کافروں"

"کو مزا چکھا دیتا۔ جو شخص بلی کو دیکھ کر کانپنے"

"لگتا ہے، گولیوں کی بوچھاڑیں بھلا وہ کیا ٹھہر سکتا ہے" بیوی آنچل سر پر ڈالتے ہوئے بولی۔

"بھئی سچ کہا تھا کل مولوی صاحب نے اپنے وعظ میں کہ عورتیں"

"ناقص العقل ہوتی ہیں۔ بیگم! اتنی معمولی سی بات تمہاری"

"سمجھ میں نہیں آتی، ارے بھئی! کافروں سے جنگ کرنے اور"

"بلی سے لڑنے میں، تمہارے نزدیک کوئی فرق ہی نہیں ہے؟"

"یہ بلی اور کتے جیسے ذلیل جانور بھلا کہیں اس قابل ہیں کہ ان سے"

"جنگ کیجائے۔ پھر جان کو ہلاکت میں ڈالنا بھی تو مذہب اور"

"دانائی کے خلاف ہے۔ آیا تمہاری سمجھ میں ۔۔؟" قاسم نے قدرے مسکرا کر جواب دیا۔

"میں بات کو بڑھانا نہیں چاہتی، لیکن اتنا کہے دیتی ہوں"۔

"کہ کسی سے اس واقعہ کا ذکر نہ کر بیٹھنا، تم سے زیادہ مجھے پشیمانی ہوگی" بیوی کھانستے ہوئے بولی۔

"بیگم! تم نے کیا مجھے بیوقوف سمجھ رکھا ہے، گھر کی باتیں کہیں"

"باہر والوں سے کہی جاتی ہیں۔ میرے، تمہارے اور اُس"

"قطامہ بلی کے سوا، کسی چوتھے کو خبر نہ ہوگی۔ تم اطمینان رکھو" قاسم نے جواب دیا۔

قاسم کی بیوی مسکرا کر صحن میں چلی گئی۔ اور قاسم دالان میں کرسی پر بیٹھ کر کتاب پڑھنے لگا۔

(۳)

قاسم جس دفتر میں ملازم تھا، اُس دفتر کے ایک عہدیدار وظیفہ پر علیحدہ ہو رہے تھے اُن کے اعزاز میں دفتر والوں نے ایک رخصتی جلسہ کا انتظام کیا۔ جلسہ کا انتظام دفتر کے ایک منتظم کے سپرد کیا گیا تھا۔ قاسم اسی منتظم کا مددگار تھا۔ آرائش، فوٹو، دعوتی رقعوں اور کھانے پینے کی چیزوں

کا انتظام تو منتظم نے کر لیا تھا، بس اب ایک تقریر کرنیوالے کی تلاش ہو رہی تھی، منتظم نے قاسم سے مشورہ کیا۔ قاسم نے کہا کہ مجھے تقریر کی اچھی خاصی مشق ہے، میں تقریر کر دوں گا۔ منتظم نے دیکھا کہ ایک اچھا خاصہ معقول آدمی ایک بات کا پختہ وعدہ کر رہا ہے۔ وہ مطمئن ہو گیا۔ بدگمانی اور بے اطمینانی کی کوئی وجہ بھی نہ تھی۔ قاسم نے جو منتظم سے تقریر کرنے کا وعدہ کیا تھا، اُس میں اُس کی حماقت کے سوا خود غرضی بھی شامل تھی، وہ سمجھتا تھا کہ مجمع میں تقریر کرنے سے مجھے دفتر کے لوگوں میں ایک نمایاں امتیاز حاصل ہو جائیگا۔ جلسہ میں دو دن باقی رہ گئے تھے، قاسم نے اپنے محلہ کے ایک ماسٹر کو تقریر کا مسودہ لکھنے پر راضی کیا۔ ماسٹر نے ایک دن تو یوں ہی ٹال دیا۔ جلسہ کے دن جب قاسم نے اصرار کیا۔ تو اُس نے ایک تقریر لکھ کر اُسے دیدی، قاسم، تقریر کا کاغذ لیکر گھر پہنچا۔ اور کاغذ دیکھ کر تقریر یاد کرنی شروع کی، اِسی عرصہ میں اُس کو رفع حاجت کے لئے جانا پڑا۔ قاسم کے دل و دماغ پر تو تقریر چھائی ہوئی تھی، وہ کاغذ لئے ہوئے پاخانہ میں پہنچا۔ اور وہاں بیٹھ کر زور زور سے پڑھنے لگا۔ بیوی کو کسی کام سے صحن میں آنا پڑا، اُس کے کان میں، کتاب کے پڑھے جانے کی سی آواز آئی، اُس نے پاخانہ کی دیوار کے قریب جا کر سُنا تو قاسم زور زور سے پڑھ رہا تھا۔

"یہ تم کو مالیخولیا ہو گیا ہے کیا، لاحول ولا قوۃ۔۔! "

"اب تم نئی نئی باتیں کرنے لگے ہو، اُس دن بلّی"

"کو دیکھ کر آفت اُٹھائی تھی، آج پاخانہ میں بیٹھ کر"

"کتاب پڑھ رہے ہو۔ واہ۔ !" بیوی نے تیز لہجہ میں کہا۔

قاسم نے بیوی کو کوئی جواب نہیں دیا، وہ کئی بار کھانسا، اور کئی دفعہ "اونہہ" کرکے رہ گیا، تھوڑی دیر بعد وہ پاخانہ سے نکل آیا۔

"یہ تم پاخانہ میں کس سے باتیں کر رہے تھے؟" بیوی نے دریافت کیا۔

"باتیں کرنیکی بھی ایک ہی کہی، بیگم! میں تقریر یاد کر رہا تھا،"

"آج شام کو ہمارے دفتر میں جلسہ ہو رہا ہے" قاسم، لوٹا زمین پر رکھتے ہوئے بولا۔

"پاخانہ بھی بھلا کوئی تقریر یاد کرنے کی جگہ ہے۔ کوئی دوسرا"

"اس بات کو سن سے، تو کیا کہے تم کو ——!" بیوی نے پیاز کاٹنے کا چاقو ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔

"بیگم! وقت بہت ہی کم رہ گیا ہے، اور مجھے پورے چار صفحے ازبر"

"کرنے ہیں، تم کو معلوم نہیں ہے کہ بڑے آدمی پاخانے"

"میں بیٹھ کر بھی کام کاج کیا کرتے ہیں۔ والسرائے بہادر تو"

"اخبار پاخانہ میں ہی بیٹھ کر پڑھتے ہیں" قاسم نے جواب دیا۔

"اچھا! تم نے میری بات کا جواب کیوں نہیں دیا" بیوی نے دریافت کیا۔

"بیگم! پاخانہ میں بیٹھ کر بات چیت کرنا منع ہے" قاسم تھکتے ہوئے ازار بند کو تھامتے ہوئے بولا۔

"اور تقریر کو زور زور سے یاد کرنا جائز ہے، عجیب"

"بیوی نے مسکراتے ہوئے کہا، "ہیں تمہاری باتیں ۔ !

"بھئی! تم تو بال کی کھال نکالتی ہو، تم تو ناحق بیوی "

"نہیں، تم کو تو بیرسٹر ہونا چاہیئے تھا ——— !"

قاسم ابھی کچھ کہہ ہی رہا تھا کہ دروازے پر دفتر کے چپراسی نے آکر آواز دی کہ منتظم صاحب آپ کو اسی وقت بلا رہے ہیں۔ قاسم نے جلدی جلدی کپڑے پہنے، اور تقریر کے کاغذ کو جیب میں رکھ کر، چپراسی کے ساتھ دفتر روانہ ہو گیا۔ وہ راستہ بھر تقریر والے کاغذ کو جیب میں سے نکال نکال کر پڑھتا گیا۔ قاسم پر گھبراہٹ طاری تھی، وہ جو کچھ یاد کرتا تھا، اُسے فوراً ہی بھول جاتا تھا۔ دفتر میں پہنچکر وہ دوسرے کاموں میں لگ گیا، اور اُس کی جیب کا پرچہ کہیں گر پڑا۔ قاسم کو اطمینان تھا۔ کہ جلسہ گاہ میں وہ تقریر کاغذ میں دیکھ کر پڑھ دیگا، جلسہ شروع ہونے کے بعد، جب اُس کی باری آئی، تو وہ گھبرایا ہوا اسٹیج پر پہنچا۔ اسٹیج پر پہنچکر اُس نے جیب میں ہاتھ ڈالا، تو کاغذ موجود نہ تھا۔ وہ گھبرا گیا، اور دو تین منٹ خاموش کھڑا رہا۔ اُس کو بہرحال بولنا تھا۔ اُس نے ہمت کر کے، بولنا شروع کیا:۔

"معزز صاحبان و خواتین ۔ !"

اتنا کہہ کر وہ رُکا اور لاحول ولا قوۃ کہہ کر، کہنے لگا، غلطی ہو گئی، پہلے خواتین کہنا چاہیئے ——

ہاں! تو معزز خواتین و صاحبان ——— ! اس پر حاضرین نے تالیاں بجائیں، تالیوں کی آواز نے قہقہوں کی گونج کے ساتھ جلسہ گاہ میں ایک عجیب سماں پیدا کر دیا۔ قاسم نے اس کے بعد کہا:۔

"یہ جلسہ ہمارے معزز و محترم عہدیدار، جو یہاں بدقسمتی سے"

"تشریف فرما ہیں —————!"

اس پر مجمع سے ایک آواز آئی :-

"بدقسمتی سے شاید آپ کا خوش قسمتی مطلب ہے۔"

قاسم نے گھبرا کر جواب دیا :-

"شکریہ آپ کا، آپ کی رائے سے مجھے بالکل اتفاق ہے"

"ہاں! تو میں اپنے محترم عہدیدار صاحب کا ذکر کر رہا تھا۔"

"بڑے مہربان اور ہمدرد ہیں ہمارے پنڈت جی خوب"

"کہا ہے کسی شاعر نے :-"

"خدا معلوم دنیا جلوہ گاہِ ناز ہے کس کی

ہزاروں اٹھ گئے پھر بھی رونق ہے مجلس کی"

اس شعر پر تو حاضرین نے بے اختیار ہو کر قہقہہ لگایا۔ اور وہ عہدیدار جس کے اعزاز میں یہ دعوت دی گئی تھی، پشیمان سا ہو کر، قاسم کا منہ دیکھنے لگا۔ ایسی ہی اٹکل بے جوڑ باتیں کہہ کر، قاسم اسٹیج سے اتر آیا۔ حاضرین نے اس عجیب و غریب تقریر کے اختتام پر خوب زور زور سے تالیاں بجائیں۔

(۴)

قاسم ایک اور پر لطف حماقت میں مبتلا تھا جس کو ہم فلسفہ کی اصطلاح میں "جنون خودی"

کہہ سکتے ہیں۔ وہ اپنے کو غیر معمولی حسین انسان سمجھتا تھا، قاسم کا رنگ سانولا تھا، اور چہرے پر چیچک کے خوب گہرے نشان تھے۔ جب وہ مدرسہ میں پڑھتا تھا، تو مدرسہ کے لڑکے اُس کو "نقشین" کہا کرتے تھے، اُس کا قد بہت زیادہ پست تھا، پیشانی کوتاہ تھی جس پر بہت سی سلوٹیں پڑی ہوئی تھیں۔ اُس کی آنکھیں البتہ خوبصورت اور چمکدار تھیں، مگر اس قد اور ناک نقشہ پر یہ چمکیلی آنکھیں بھی، ایک مضحکہ بن کر رہ گئی تھیں۔

اس قسم کے لوگ جو حسین نہیں ہوتے لیکن اپنے کو حسین سمجھتے ہیں، خوب بن ٹھن کر رہتے ہیں، قاسم بھی دن رات چھیلا بنا رہتا تھا۔ وہ روزانہ اپنے ہاتھ سے ڈاڑھی مونڈتا، ڈاڑھی کیا مونڈتا تھا، رخساروں کو کھرچتا تھا بعض وقت تو اُس کے نقشین اور پچکے ہوئے گالوں سے خون بہنے لگتا تھا حسینوں کی سفاکی اور خونریزی تو مشہور ہے۔ قاسم کا "حسن جہاں سوز" پہلے قاسم کے رخساروں سے ہی خونریزی کی ابتدا کرتا تھا، حجامت سے فارغ ہو کر، صابون سے خوب مل مل کر منہ دھوتا، اُس کے بعد رخساروں پر کئی کئی طرح کی کریم (Cream) لگاتا پھر بال سنوارتا، بال سنوارنے کے بعد بہت دیر تک آئینہ میں اپنا چہرہ دیکھتا۔ اور اپنی خوبصورتی کی آپ ہی داد دیتا۔ اسکو فوٹو کھنچوانے کا بھی خبط تھا اُس کو فوٹو گرافروں سے ہمیشہ شکایت رہتی تھی، کہ اُس کی تصویر میں کچھ نہ کچھ نقص رہ جاتا ہے

قاسم کی بیوی زیادہ حسین تو نہ تھی، مگر قاسم سے لاکھ درجہ اچھی تھی، لانبا قد، گداز جسم، گندمی رنگ، شربتی آنکھیں، پھر صحت اور جوانی ان تمام باتوں نے اُس کو قبول صورت بنا دیا تھا۔ قاسم اپنی بیوی کے سامنے ہمیشہ ایسی باتیں کرتا تھا جس سے اُس کے حسن کی بڑائی اور بیوی کے حسن

کی توہین ہوتی تھی :-

" میرا پہلا پیغام تو ایک ڈپٹی کلکٹر کے یہاں سے آیا تھا۔"

" اُن کی ایک ہی لڑکی تھی۔ میں نے اُس لڑکی کو اپنی آنکھ سے "

" دیکھا ہے۔ آہاہا! کیا حسن تھا، گلاب کا "

" پھول تھی، بلکہ اس سے بھی بڑھکر۔ اور ہاں! پہلے "

" اُس لڑکی نے مجھے ایک شادی میں دیکھ لیا تھا، اُسی نے "

" اپنے بھائی سے کہہ کر ہمارے یہاں پیغام بھجوایا تھا — مگر "

" میری قسمت تو تمہارے ساتھ لڑی تھی! قسمت کے لکھے کو کون "

" میٹ سکتا ہے "

" بچپن میں میری ماں نے خدا اُن کو جنت نصیب کرے "

" اپنی آنکھوں میں رکھ کر پالا ہے، میری گردن تعویذوں سے "

" بھری رہتی تھی مجھے اکثر نظر لگ جاتی تھی، میری ماں "

" مجھے "چاند" کہکر پکارتی تھیں۔ وہ فرمایا کرتی تھیں "

" کہ میں اپنے "چاند" کی جوڑ کی دُلہن لاؤں گی "

" اللہ نے مجھے بچا دیا۔ شہر کی بہت سی طوائفوں نے مجھ پر ڈورے "

" ڈالے۔ اور اس کیکاؤس جی پارسی کی لڑکیوں نے تو میرا "

"ناطقہ بند کر رکھا تھا۔"

"ہمارے مُلاجی کہا کرتے تھے۔ کہ خوبصورت مردوں کو بدصورت"

"بیویاں ملتی ہیں، نہ جانے یہ کہاں تک صحیح ہے!"

قاسم کی بیوی یہ سب باتیں لہو کے گھونٹ پی پی کر سنتی، اور ایک لفظ منہ سے نہ نکالتی۔ ایک قاسم پر ہی کیا منحصر ہے، قریب قریب تمام مردوں کا یہ حال ہے، اور حال کیا ہے۔ بلکہ یہ تو ایک دستور سا ہو گیا ہے کہ بدصورت سے بدصورت مرد کے لئے حسین سے حسین عورت تلاش کی جاتی ہے۔ یہ کوئی نہیں دیکھتا۔ کہ آخر عورت بھی اپنے پہلو میں دل رکھتی ہے، اُس کے بھی آخر آنکھیں ہیں، جو خوشنما اور بدنما چہروں میں تمیز کرتی ہیں۔ یورپ میں عورت کو جو آزادی دی گئی ہے وہ بہر آئینہ ٹھکرا دینے کے لائق ہے، لیکن یہ تو بالکل ایک فطری بات ہے۔ جس کو ہر صاحب عقل تسلیم کریگا، کہ بیاہ شادی کے معاملات میں، لڑکے کی طرح، لڑکی کے جذبات و احساسات کا بھی خیال رکھنا چاہیئے۔ پھر ستم یہ ہے کہ مرد آزادی کے ساتھ بیویوں کی شکل، صورت میں عیب نکالتے ہیں، اور اگر کوئی بیوی اپنے خاوند کی شکل، صورت کے متعلق ایک لفظ بھی زبان سے نکال دے، تو قیامت بپا ہو جائے۔ غریب ناصرہ (قاسم کی بیوی) نے بھی اپنے بدصورت شوہر کی شکل، صورت پر کبھی تنقید نہیں کی۔ اُس کی شرافت و پاکبازی نے حسن صورت کے معاملہ میں اُس کے زاویۂ نگاہ کو بدل دیا تھا۔

قاسم اور اُس کی بیوی، جب کسی تقریب میں شرکت کر کے، مکان واپس آتے، تو قاسم اپنی

بیوی سے جو بات چیت کرتا، اور اُس کی جو بیوی جو کچھ جواب دیتی۔ اُس کا خاکہ کتنا دلچسپ ہے :-

"تم نے چھت پر سے مجھے دیکھا تھا، میں صحن میں کھڑا ہوا تھا۔

"ہاں! آپ ستون کے قریب کھڑے تھے"

"تمہارے ساتھ اور بہت سی عورتیں بھی تو صحن کے مردوں کو"

"دیکھ رہی تھیں ——————"

"جی ہاں! دیکھ تو رہی تھیں ——————"

"مجھے بھی اُن عورتوں نے دیکھا ہو گا۔ "

"صحن میں بہت سے مرد تھے، ممکن ہے آپ پر بھی کسی عورت کی"

"نظر پڑ گئی ہو ——————"

"میرے متعلق کسی عورت نے تم سے کچھ پوچھا تھا——— "

"آپ کے متعلق کسی عورت نے کچھ نہیں پوچھا"

اس قسم کی گفتگو سے قاسم اپنے ذوقِ خود بینی کو تسکین دینا چاہتا تھا۔ وہ اس فریب میں مبتلا تھا، کہ اُس کے حسن میں ایک خاص کشش پائی جاتی ہے اور عورتیں اُس کو دیکھ کر بس لوٹ ہی تو جاتی ہیں۔ ناصرہ بھولی بھالی سہی، مگر اتنی بیوقوف نہ تھی، قاسم کی گفتگو کو وہ اچھی طرح سمجھتی تھی۔ مگر وہ ہمیشہ انجان بنی رہی۔ اُس نے اپنے دِل کی بات کبھی زبان پر نہ آنے دی۔

شہر میں ایک سرکس آیا ہوا تھا جس میں بہت سی حسین لڑکیاں کرتب کرتی اور ناچتی تھیں، ہاتھی ببر اور طرح طرح کے بندروں کے علاوہ، گینڈا اور کنگارو بھی سرکس والوں کیساتھ تھے سرکس کا پنڈال بہت بڑا تھا جس کے اندر کئی قسم کا جوا ہوتا تھا۔ شہر کے لوگ گروہ در گروہ آ آ کر جوا کھیلتے، اور گھروں کو خالی ہاتھ واپس ہوتے، شہر کی دولت دن دہاڑے لٹ رہی تھی، اور کوئی روک ٹوک کرنیوالا نہ تھا، بات یہ تھی۔ کہ سرکس کا مالک انگریز تھا اور انگریز کی سرپرستی میں جو مہذب اور شائستہ قمار بازی ہوگی، اُس کو اول تو "قمار بازی" کہنا، قدامت پرستی اور بے دانشی کی دلیل ہے، پھر ایسی قمار بازی قانونی گرفت میں نہیں آسکتی۔ اور انگریز تو قانون قاعدے کے بغیر تنکا بھی نہیں توڑتا۔ ہزاروں انسانوں کو سیاسی شورش میں جو جیلخانہ کے مصائب اٹھانے پڑے ہیں، پولس کے ڈنڈوں نے جو سینکڑوں انسانوں کے جسموں کو لہولہان کیا ہے۔ اور یہ فلسطین میں جو کچھ ہو رہا ہے، یہ سب قانون و قاعدہ کے تحت ہی تو ہو رہا ہے۔ انگریز تو کبھی غلطی کرتا ہی نہیں، اور اگر اس سے بھول چوک ہو بھی جائے، تو اس کو غم ہی کیا ہے۔ حضرت مسیح، پوری امت کے لئے کفارہ بن کر ایک ایک عیسائی سے فرما چکے ہیں:————

"تو مشقِ ناز کر خونِ دو عالم میری گردن پر"

قاسم بھی سرکس دیکھنے کے لئے گیا۔ اور پنڈال میں زنانہ درجے کے قریب بیٹھا۔ وہ بار بار سگرٹ نکال کر پیتا، بالوں کو سلجھاتا، کلائی پہ بندھی ہوئی گھڑی کو دیکھتا اُس کو یقین تھا، کہ اُس کا حسن اور اُس پہ یہ شوخ ادائیں، عورتوں کو بے چین کئے ڈالتی ہیں۔ سرکس ختم ہونے کے بعد وہ

باہر نکل کر آیا۔ چوراہے کے قریب ایک بگھی میں اُس نے ایک حسین لڑکی کو دیکھا جو چلمن کی آڑ سے جھانک رہی تھی۔ لڑکی بے پروائی کے ساتھ باہر کی طرف دیکھتی رہی، ایک آدھ نظر اُس نے قاسم کو بھی دیکھا۔ قاسم ذرا تیزی کے ساتھ چلنے لگا، لیکن گھوڑے کی رفتار بہت تیز تھی، تھوڑی دیر میں بگھی، اُس کی آنکھوں سے اوجھل ہو گئی۔ مکان واپس ہونے کے بعد اس نے اپنے دوستوں سے اس واقعہ کا تذکرہ بہت کچھ بڑھا چڑھا کر کیا۔ اُس نے کہا:۔

"میں سرکس کے پنڈال سے نکل کر، چوراہے پر کھڑا تھا، کہ ایک بگھی"

"میرے قریب آکر کھڑی ہو گئی، میں نے جو بگھی پر نظر ڈالی تو چلمن کو"

"ہلکی سی جنبش ہونے لگی، میں بے پروائی کے ساتھ چلنے لگا،"

"بگھی بھی میرے ساتھ ساتھ چلنے لگی، میں نے چلمن کو دوبارہ جو دیکھا"

"تو ایک نوجوان لڑکی، جھانک کر مجھے گھور رہی تھی، مجھے دیکھ کر"

"وہ کچھ مسکرائی بھی، اور دبی زبان سے اُس نے کچھ کہا بھی تھا"

"میں نے نہ تو کوئی جواب دیا اور نہ اشارہ کیا، تھوڑی دیر بعد"

"بگھی روانہ ہو گئی۔ ——————"

قاسم نے جس مجمع میں اس خود تراشیدہ افسانہ کو دہرایا تھا، اُس میں ایک نوجوان شخص نے جس کو لوگ احمد میاں کہہ کر پکارتے تھے، قاسم سے سوال کیا:۔

"بگھی کے گھوڑے کا کیا رنگ تھا، اور اس نوجوان کا حلیہ"

"بھی آپ کو یاد ہے ؟

قاسم نے جواب نہ دیا۔

"گھوڑا سپید تھا، اُس کی گردن کے بال سُرخ رنگ میں رنگے"

"ہوئے تھے، کوچوان بہت بوڑھا تھا، اُلجھی ہوئی سفید داڑھی"

"تھی، اُس کے سر پر موٹا سا پگڑ رکھا ہُوا تھا۔"

جس نوجوان لڑکی کے متعلق قاسم نے ذکر کیا تھا، اور جس کی بگھی اور گھوڑے کی نشاندہی کی تھی، وہ لڑکی احمد میاں کی قریبی عزیزہ تھی۔ احمد میاں اُس لڑکی کے چال چلن سے اچھی طرح واقف تھا قاسم کی حماقتوں اور بدتمیزیوں سے بھی اُسے بخوبی آگاہی تھی۔ مگر پھر بھی اُس نے اپنی اُسی عزیزہ سے جس کے متعلق قاسم نے ایک افسانہ تراش لیا تھا، سرکس اور راستہ کے حالات کے متعلق سوالات کرکے، پوری طرح اپنا اطمینان کرلیا۔

احمد میاں نے اپنے دوستوں سے کہا کہ یہ قاسم بلا وجہ پاکدامن عورتوں کو بدنام کرتا پھرتا ہے۔ اُس کو اس کی مکروہ اور خباثت آمیز حماقت کا مزہ چکھانا چاہیئے۔ احمد میاں نے اس سلسلہ میں ایک کامیاب اسکیم بھی پیش کردی، جس کو تمام دوستوں نے نہ صرف منظور کیا۔ بلکہ احمد میاں کی ذہانت کی داد دی۔ ایک دوست، لڑکی کی طرف سے پیامبر بنا۔ جو قاسم تک لڑکی کا پیام پہنچایا کرتا تھا۔ یہی فرضی پیامبر کبھی قاسم سے اُس کا فوٹو لیجاتا، کبھی لڑکی کی طرف سے کوئی رومال محبت کی حسین نشانی کے طور پر اُس کو لاکر دیتا۔ قاسم دل کھول کر

تحفہ پر تحفے بھیج رہا تھا، قاسم کے دوستوں نے اُس کو یقین دلادیا تھا کہ لڑکی اس پر دل و جان سے فریفتہ ہے۔ نامہ و پیام کی رسم بڑی دلکش اور دلچسپ رسم ہے۔ مگر عشاقِ جانباز، اس دلچسپی اور دلکشی پر قناعت کب کرتے ہیں۔ قاسم کی طرف سے ملاقات کا مطالبہ ہوا، اور بیچ کے آدمی نے جواب میں کہا کہ وہ تو دل سے چاہتی ہیں، بس وقت اور موقعہ کا انتظار ہے، جس دن موقعہ ملیگا آپ کو مطلع کر دیا جائے گا۔

ادھر ان لوگوں نے ہوٹل کا ایک کمرہ کرایہ پر لے لیا۔ اور اسی لڑکی کا ایک عزیز، عورت کا لباس پہن کر کمرے میں بیٹھ جانے پر راضی ہوگیا۔ قاسم کے خاص دوستوں کو اس ڈرامہ کی خبر نہ تھی، ان لوگوں میں اُس کے چند شناسا اور احمد میاں کے عزیز شامل تھے، پیامبر نے قاسم کو دن، وقت اور جگہ کی اطلاع دی، قاسم نے اُس دن بڑے اہتمام کے ساتھ بناؤ سنگھار کیا۔ یہاں ہوٹل میں پہلے سے ایک نوجوان کو زنانہ لباس پہنا کر بٹھا دیا گیا تھا، دوسرے لوگ قریب کے کمرے میں دروازہ بند کرکے بیٹھے ہوئے تھے۔ قاسم وقتِ مقررہ پر ہوٹل کے کمرے میں پہنچا۔ اُس کمرے میں قاسم، اُس کی فرضی معشوقہ اور پیامبر کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ قاسم کو اپنے حسن کی کامیابی پر غیر معمولی گھمنڈ ہوگیا تھا۔ وہ اس خیال میں تھا کہ عورت ہی کی طرف سے گفتگو کا اقدام ہوگا۔ پیامبر نے ادھر اُدھر کا ذکر نکال کر، دونوں کی بات چیت کرائی، قاسم اب ذرا بے تکلف ہونے لگا۔ اُس نے اپنی فرضی چاہنے والی کی طرف ہاتھ بڑھا کر کہا۔

"یہ حجاب آخر کب تک رہیگا۔"

نوجوان نے کھٹ سے گھونگٹ اٹھا دیا۔ قاسم ڈاڑھی مونچھ کے آدمی کو دیکھ کر ہکا بکا رہ گیا، پیامبر نے تالی بجائی، اور چھ سات ہٹنڈوں نے کمرے میں گھس کر جو قاسم کو پیٹنا شروع کیا ہے، تو بقول شخصے سویرا کر دیا۔ قاسم نے ہاتھ جوڑ کر کہنا شروع کیا:۔

"میں توبہ کرتا ہوں، خدا کے لئے مجھے چھوڑ دو، میں"

"عہد کرتا ہوں کہ آج سے کسی عورت پر عاشق نہیں"

"ہوں گا۔"

قاسم پٹ پٹا کر جب گھر پہنچا ہے، تو اس کا منہ سوجا ہوا تھا، چہرے پر بری طرح ہوائیاں اڑ رہی تھیں، بال بکھرے ہوئے تھے، بیوی نے اس کو اس حال میں دیکھ کر مذاق کے انداز میں کہا:۔ کیا کہیں سے پٹ کر آئے ہو۔"

قاسم نے گھبرا کر جواب دیا:۔

"ارے! تم کو بھی خبر ہو گئی —— لیکن یہ خبر غلط ہے!"

قاسم نے لاکھ بہانے بنائے، مگر بیوی سر ہو گئی کہ تم کو بتانا پڑیگا، قاسم نے جب دیکھا کہ بیوی کسی طرح مانتی ہی نہیں، تو اس نے فوراً ایک قصہ گھڑ کر سنا دیا۔

"بیگم! تم بڑی ضدی ہو، مردوں کی باتیں مرد جانتے ہیں، عورتوں"

"کو ان کے جاننے کی کیا ضرورت ہے، خیر تم نہیں مانتی ہو"

"تو میں تم کو بتائے دیتا ہوں۔"

"یہ جو سیدوں کے محلہ میں اکرم اور اعظم دو بھائی رہتے ہیں"
"ان سے میری ہمیشہ کی دشمنی ہے یہ میونسپلٹی کی ممبری کا حال"
"تم کو معلوم ہے کہ میں نے مولوی صاحب کی طرف سے کوشش کی تھی"
"اور یہ لوگ سید صاحب کی طرف سے کام کر رہے تھے"
"مولوی صاحب الیکشن جیت گئے، ان لوگوں کی"
"دشمنی اور زیادہ بڑھ گئی۔ آج بڑی مسجد کے قریب ان لوگوں سے"
"الیکشن کے متعلق بات چیت ہونے لگی، بات چیت میں"
"کچھ ذرا گرمی پیدا ہوئی، یہاں تک کہ ہاتھا پائی کی نوبت آ گئی، وہ چار پانچ"
"آدمی تھے، میں اکیلا تھا، مگر میں نے بھی وہ ہاتھ مارے ہیں کہ"
"یہ سیدوں کے بچے یاد کرتے ہوں گے۔ اجی ان میں سے"
"ایک کو تو ادھ مرا کر کے آیا ہوں، تم جانتی ہو لڑائی میں، کوئی"
"ثابت نہیں بچتا۔ اُن لوگوں نے بھی حملہ کیا، میرے بھی چوٹ"
"آئی، مگر کہاں وہ تنتے گھاؤ، اور کہاں یہ ذرا سی ہونٹوں"
"کی سوجن - اماں باپ کا کھلایا پلایا آج کام آ رہا ہے۔"

بیوی نے جواب میں کہا :-

"تم دوسروں کے بیچ میں کیوں لڑتے پھرتے ہو، کہیں تمہارے خدانخواستہ"

"زیادہ چوٹ آجاتی، تو غیر محلہ میں کوئی ہمدردی کرنیوالا"

"بھی میسّر نہ آتا۔ آئندہ سے تم اس ممبری اور"

"الیکشن کے جھگڑے میں نہ پڑنا۔ یہ الیکشن تو اچھے"

"خاصے فساد کی جڑ ہیں۔ میں پانی لاتی ہوں"

"ہاتھ منہ دھو ڈالو، ــــــــــــــــ"

قاسم ہاتھ منہ دھوکر، پلنگ پر لیٹ گیا، اور تھکے ہوئے مسافر کی طرح ذرا سی دیر میں اُس پر گہری نیند طاری ہوگئی، اُس نے نیند میں بڑبڑاتے ہوئے کہا:۔

"میں عاشقی سے توبہ کرتا ہوں"

بیوی نے اس جملہ کو سُنا، اور مسکرا کر اپنے کام میں مشغول ہوگئی۔

فریبِ تفریح

اِنتساب

دِل کے مریضوں کے نام

تفرِیح خود ایک زبردست تجربہ ہے"

آپ بھی

اپنے خشک اور غیر دلچسپ ماحول میں زندگی پیدا کر سکتے ہیں۔

بشرطیکہ

اس منزل کی دلچسپیاں آپ کی تفریح کا مقصود نہ بن جائیں۔

فریبِ تفریح

فیروز گنج میں صوبہ کی سیاسی انجمن کا سالانہ اجلاس منعقد ہو رہا تھا، تمام شہر میں غیر معمولی چہل پہل نظر آ رہی تھی، شہر کے نوجوان بڑے جوش و ہمت کے ساتھ کام کر رہے تھے، ان نوجوانوں میں چند ایسے لوگ بھی تھے جو لال پیلی وردی پہننے کے شوق میں رضا کار بن گئے تھے، انجمن کے اغراض و مقاصد سے وہ قطعاً بے خبر تھے، نام و نمود کا جذبہ اُن کو یہاں کھینچ لایا تھا۔ شہر کی گلی گلی میں اجلاس کے جہازی اشتہار چسپاں کئے جا رہے تھے، شہر سے متصل بڑے میدان میں عظیم الشان پنڈال تیار ہو رہا تھا جس میں دس ہزار سے کچھ اوپر نشستوں کا انتظام تھا۔ تین ہفتہ کے اندر جلسہ کے انتظامات مکمل ہو گئے۔ ڈیلیگیٹوں اور تماشائیوں کی آمد شروع ہوئی، اور آخر وہ دن بھی آ پہنچا جس دن اجلاس کے صدر شہر میں تشریف لانے والے تھے۔ صدر صاحب آئے اور ہنگامہ و غوغا کی ایک دنیا اپنے ساتھ لیکر آئے، سارا شہر نعروں کے شور سے گونج اٹھا، شہریوں نے صدر کا اس قدر شاندار استقبال کیا، کہ صوبہ کے تمام گذشتہ خیر مقدم اور استقبال اپنی تاریخی اہمیت کھو بیٹھے۔ لوگوں نے صدر کی گاڑی کو کھینچکر اپنی بے پناہ عقیدت کا ثبوت دیا۔ صدر کی گاڑی پر اتنے پھول برسائے گئے، کہ گلی گلی میں پھول کی پتیاں ہی پتیاں نظر آنے لگیں، شاید شہر کے

تمام ہرے بھرے باغ، پھولوں سے خالی ہو گئے تھے، اس ہنگامہ کو دیکھکر، صدر بھی گھبرا سا گیا، کیونکہ مجمع بے قابو ہوا جا رہا تھا، اور صدر کو خوف ہو گیا تھا کہ عقیدت کے اس بے پناہ طوفان میں کہیں اُس کا وجود، تنکے کی طرح بہا بہا نہ پھرے۔ ناصر کو سیاسی مسائل سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی لیکن سارے شہر کو اس ہنگامہ میں شریک ہوتا دیکھ کر، وہ بھی تماشائیوں میں شریک ہو گیا۔ گھنٹہ گھر کے قریب پہنچکر ایک تو مجمع کی تعداد میں اضافہ ہو گیا، دوسرے سڑک کی تنگی کے باعث بہت زیادہ کھچ پچ ہو گئی، لوگ ایک دوسرے پر بے تحاشا گرنے لگے، ناصر صرف جوان ہی نہ تھا، بلکہ اچھا خاصا تن و توش رکھتا تھا، لیکن بھیڑ کے طاقتور ریلے نے اس کے پیر اُکھاڑ دئے، اُس نے بہت کچھ سنبھلنے کی کوشش کی، مگر مجمع میں کچھ اس بلا کی حرکت تھی، کہ ناصر، توازن قائم رکھنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ وہ نالی کے قریب گرا، اور کتنے ہی آدمی اُس کو کچلتے ہوئے گذر گئے، ناصر نے چیخنا شروع کیا، لیکن "قومی نعروں" کے ہنگامہ میں اس غریب کی پست آواز کو کون سنتا تھا۔ ناصر تھوڑی دیر تک فرشِ راہ بنا رہا۔ وہ تو ناصر کی قسمت اچھی تھی کہ اُس کے ایک دوست نے اُس کو پہچان کر، اٹھا لیا، نہیں تو جلسہ اور استقبال کی تفصیل اور کارروائی کے ساتھ، ناصر کی موت کی خبر اخباروں میں چھپ کر رہتی۔ ناصر کو جب اُس کے دوست نے اُٹھایا ہے، تو وہ بیہوش تھا، اور اُس کے ماتھے سے لہو بہہ رہا تھا۔ ناصر کا دوست اُس کو موٹر ٹیکسی میں ڈال کر شفاخانہ لے گیا۔ ڈاکٹر نے ناصر کا طبی معائنہ کرنے کے بعد، ناصر کے دوست سے کہا:-

"ان کی پسلیاں بری طرح زخمی ہوئیں"۔

"ہیں، ماتھے کی چوٹ معمولی ہے، لیکن"

"میں اطمینان دلاتا ہوں کہ ان کو آرام ہو جائے گا"

"دو ہفتہ میں خدا نے چاہا تو یہ اچھے"

"ہو کر اپنے گھر چلے جائیں گے، ہیں ان کو ابھی ہوش"

"میں لانا نہیں چاہتا۔ مجھے امید ہے کہ شام تک"

"یہ خود ہوش میں آ جائیں گے۔"

ناصر کا دوست اُس کو شفا خانہ میں چھوڑ کر چلا آیا کئی ڈاکٹروں نے مل کر ناصر کی مرہم پٹی کی، شام کے وقت ناصر قدرے ہشیار ہوا، لیکن اُس کی یہ ہشیاری خواب کے مانند تھی۔ ناصر کو دواخانہ کے در و دیوار نظر تو آتے تھے، مگر اُس کے نظارہ میں بیخودی ملی ہوئی تھی، وہ کچھ سویا ہوا سا تھا۔ یہ نیم بے خودی بھی اُس پر چند منٹ تک طاری رہی، اُس کے بعد وہ نہایت گہری نیند سو گیا۔ صبح کو جب اچھی طرح دھوپ پھیل گئی، تو اُس کی آنکھ کھلی، اب وہ بالکل ہشیار تھا، اُس کی پہلی نظر شفا خانہ کی دیوار کے اشتہار پر پڑی، جس میں بخط جلی لکھا ہوا تھا:۔

"مریض کو خوش رہنے کی کوشش"

"کرنی چاہیئے"

اس اشتہار کو اُس نے نہایت حیرت و استعجاب کے ساتھ پڑھا، اُس نے گھبرا کر اپنے دائیں جانب دیکھا تو ایک بوڑھا آدمی لال رنگ کا کنٹوپ اور دھاری دار قمیص پہنے ہوئے آنام چینی

•

•

کے بڑے سے پیالہ میں دودھ پی رہا تھا۔ اُس کی بائیں طرف ایک بہت ہی فربہ تسم کی نرس (Nurse) ایک مریض کا منہ دُھلا رہی تھی، اور اُس کے سرہانے، ایک اُونچی اور چوڑی تپائی پر کچھ شیشیاں رکھی ہوئی تھیں، ناصر نے ہتھیلیوں سے اپنی آنکھوں کو اچھی طرح ملا، اور ایک بار پھر ہر چیز پر نظر ڈالی، وہ گھبرا کر پکار اٹھا:۔

اُرے! میں کہاں آگیا۔!"

"بیٹا! تم شفا خانہ میں ہو، گھبراؤ نہیں!" ناصر کے ہمسایہ بوڑھے مریض نے ہمدردانہ لہجہ میں کہا

ناصر نے جواب دینے کے لئے ہلنے کی کوشش کی ہی تھی، کہ اُس کی پسلیوں میں ٹیس پیدا ہوگئی، وہ کراہنے لگا، اتنے میں ڈاکٹر آگیا، ڈاکٹر نے ناصر کو اصل حقیقت سے آگاہ کیا، تو کہیں جاکر اُس کا اچنبھا دُور ہوا۔ تین دن، ناصر پر بہت سخت گذرے، وہ بہت زیادہ بے چین رہا، اُس کو ہلنے جلنے کی سختی کے ساتھ ممانعت تھی، ناصر کی جوان اور بے چین فطرت نے اس پابندی کو لہو کے گھونٹ پی پی کر گوارا کیا۔ مریض کی رات بڑی مشکل سے کٹتی ہے ناصر پر بھی چار راتیں بہت ہی سخت گذریں، تیسری رات کو صبح سے بہت پہلے اُس کی آنکھ کھل گئی، اُس کے زخموں میں ٹیس ہو رہی تھی جس کے اثر سے وہ کراہنے لگا، ناصر کا ہمسایہ مریض پہلے سے جاگ رہا تھا، ناصر کی کراہ سن کر، وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ناصر نے دونوں ہاتھ پلنگ کی پٹیوں پر مارتے ہوئے کہا:۔

"موت، موت! آخر مجھے موت کیوں،"

"نہیں آجاتی۔!"

بوڑھا مریض، ناصر کے پلنگ کی طرف جھکتے ہوئے بولا:۔

"بیٹا! تم کیسی مایوسی کی باتیں کر رہے ہو، میرا تو دل ہل گیا"

"تم اور موت! بالکل اٹل بے جوڑ بات! تم نے ابھی دُنیا"

"میں دیکھا ہی کیا ہے، تمہاری تو مسیں بھی پورے"

"طور پر نہیں بھیگیں۔ کل ڈاکٹر صاحب تمہارے متعلق"

"مجھ سے کہہ رہے تھے کہ یہ نوجوان مریض بہت جلد"

"اچھا ہو جائیگا۔ بیٹا! ایسی بات منہ سے نہیں نکالا"

"کرتے، جوان آدمی کو تو بہت مضبوط دل ہونا چاہیئے"

ناصر نے بوڑھے کی گفتگو کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اُس نے کراہنا بند کر دیا۔ شاید بوڑھے کی باتوں سے اُس کی جوانی کو غیرت آگئی، اُس نے دانتوں میں انگلی دبالی، اور ہر ٹیس پر، کراہنے کے بجائے، انگلی کو دانتوں سے دبانے لگا، دو تین دن میں ناصر کے زخم بہت کچھ اچھے ہو گئے، اور وہ اپنے اندر توانائی محسوس کرنے لگا۔

ناصر نے طبیعت کے بحال ہوتے ہی، ڈاکٹر سے خط لکھنے کی اجازت چاہی۔ ڈاکٹر نے کہا کہ ابھی ایک ہفتہ تک میں تم کو خط لکھنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ لکھنے میں ہاتھ کو جنبش ہوتی ہے، اور اس کا زخموں پر اثر پڑنے کا احتمال ہے۔ اگر کوئی ضروری بات گھر کو لکھ کر بھیجنا ہے، تو تم بولتے جاؤ، میں لکھتا جاؤنگا۔ ناصر نے جواب دیا۔ کہ میں ایک نہایت راز کی بات گھر کو لکھ کر بھیجنا

چاہتا ہوں۔ اگر میں نے آج کل میں گھر کو خط نہ بھیجا، تو میرا ہزاروں کا نقصان ہو جائے گا۔ ناصر کے شدید اصرار پر، ڈاکٹر نے کہا کہ اچھا، میری خاطر دو دن اور صبر کرو، آج کی بجائے پرسوں خط لکھ دینا ناصر اس پر راضی ہو گیا تیسرے دِن ناصر نے اپنے دوست کو خط لکھا۔

" بھائی فرید! میں یہ خط تم کو شفا خانہ سے لکھ رہا ہوں،"

" جہاں میں نو دِن سے پڑا ہوا ہوں، سیاسی اجلاس کے"

" صدر کے استقبال میں، بد قسمتی سے میں بھی شریک ہو گیا تھا"

" وہاں مجمع کے مجنونانہ جوش نے مجھے زمین پر گرا دیا،"

" اور میں زخمی ہو گیا۔ اب میرے زخموں کو بہت کچھ فائدہ ہے"

" طبیعت بھی بحال ہے۔ شاید ابھی دو ہفتہ اور شفا خانہ میں،"

" رہنا ہو گا۔ اب مجھے ڈاکٹر نے دو چار قدم ٹہلنے کی بھی"

" اجازت دیدی ہے، پہلی پٹی بدلی جا چکی ہے، ڈاکٹر کا بیان ہے"

" کہ تیسری پٹی کے کھلنے پر پورا فائدہ ہو جائے گا۔"

" شفا خانہ میں میری طبیعت بالکل نہیں لگتی، یہاں کے در و دیوار سے"

" مجھے نفرت ہے۔ جس طرف نظر ڈالتا ہوں، مریض ہی مریض"

" نظر آتے ہیں، اُترے ہوئے چہرے، سوکھے ہوئے جسم، پٹیاں"

" بندھے ہوئے، ہاتھ پیر! خدا جھوٹ نہ بلوائے تو دن رات میں سینکڑوں"

" بار نظارہ کو مجروح ہونا پڑتا ہے۔ یہاں کسی قسم کا تنوع نہیں "
" پایا جاتا، اور تم جانتے ہو کہ میں تنوع پرست واقع ہوا ہوں "
" ان ایک سے پلنگوں بستروں، الماریوں، دیواروں اور آدمیوں کو "
" آخر کب تک دیکھا کروں ؟ "
" مجھے ڈاکٹروں اور کمپونڈروں کی سفید کفنیاں ایک آنکھ نہیں "
" بھاتیں۔ ان کفنیوں میں لپٹے ہوئے انسانوں کو دیکھ کر ہی "
" مریض کو قبر کی آغوش یاد آنے لگتی ہے۔ یہاں کی گفتگو کے "
" موضوع کتنے غیر شاعرانہ اور وجدان خراش ہیں :۔
" پیشاب کی شکر، خون کا دباؤ، گردے کی پیپ کا کیمیاوی تجزیہ "
" مثانہ کا آپریشن۔ آنتوں کی صفائی، کیسٹر آئل کا "
" جلاب ——————— !
" یہاں کی نرسوں کی خوبصورتی کا یہ حال ہے کہ اگر کوئی شاعر "
" دو چار دِن ان "پریوں کے جھرمٹ" میں رہ جائے تو اُس "
" کی شعریت اس بُری طرح فنا ہو، کہ وہ ساری عمر ایک مصرعہ "
" موزوں نہ کر سکے۔ "شاعر کو غیر شاعر بنانیوالا حسن" یہاں "
" ہر مریض پر مسلط کر دیا گیا ہے، اور میں بھی اسی جنگل میں پھنسا

"ہوا ہوں۔"

"بھائی! داد دیجئے۔ میرے صبر و ضبط کی کہ اس ماحول میں"

"جی رہا ہوں۔

ناصر کے زخم بھر چکے تھے، اور ڈاکٹر نے کہہ دیا تھا کہ اس ہفتہ میں تم کو گھر جانے کی اجازت دیدی جائیگی

ایک دن دوپہر کو، ناصر کے پلنگ سے کچھ دور پر، شفا خانہ کا ملازم بجلی کا گولا تپائی پر کھڑے ہو کر نکال رہا تھا۔ گولا اس بری طرح پھنسا تھا کہ ملازم نے لاکھ کوشش کی مگر ٹس سے مس نہ ہوا۔ ناصر کی طبیعت میں یکایک بے چینی سی پیدا ہوئی، اور وہ جھپٹ کر ملازم کے قریب پہنچا، ملازم، ناصر کو دیکھ کر تپائی سے اتر گیا، ناصر نے تپائی پر چڑھ کر گولے پر زور آزمائی شروع کی ناصر نے پوری قوت صرف کردی، مگر گولا بس قدرے گھوم کر رہ گیا۔ ناصر نے اپنی جیب سے رومال نکالکر گولے کے مہرے پر لگایا، اور اس قدر طاقت کے ساتھ زور کیا، کہ اس کی آنکھوں کے ڈھیلے اوپر کو آ گئے۔ گولے کا مہرہ چھن سے ٹوٹ گیا، مہرے کے ٹوٹتے ہی ناصر کے ہاتھ کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی، اس کے پیر ڈگمگائے اور وہ دھڑام سے زمین پر گر پڑا۔ اس کا جسم پلنگ کے پایہ سے ٹکرایا اور اس کی پسلیاں پھر مجروح ہو گئیں، ملازم اور قریب کے دو تین مریضوں نے مل ملا کر ناصر کو اٹھایا۔ ناصر نے کھڑے ہو کر، کرتہ کے دامن کو جھٹکا اور اپنے پلنگ پر اطمینان کیساتھ بیٹھ گیا۔ شام کو اس نے پسلیوں میں درد سا محسوس کیا، ڈاکٹر کو جب اصل کیفیت معلوم ہوئی اور پسلیوں کا معائنہ کیا۔ تو اس نے کہا۔ ایک پسلی کو شدید صدمہ پہنچا ہے۔

کم سے کم ایک مہینہ علاج میں لگیگا، چوٹ کھائی ہوئی پسلی پر دوبارہ چوٹ کا لگنا، بہت خطرناک ہے ناصر نے اپنے پر بہت کچھ ملامت کی کہ اُسے بجلی کا گولا نکالنے کی کیا ضرورت تھی؟ مگر اُس کے ملامت کرنے سے ہوئی بات، انہوئی کیسے ہو سکتی تھی؟ اُس کو شفاخانہ میں ایک مہینہ کے لیئے اور رُک جانا پڑا

ناصر شفاخانہ کی فضلے سے تنگ آچکا تھا، وہ خیالی طور پر اس ماحول کو بدلنا چاہتا تھا، اُس نے قدرے غور و خوض کے بعد ماحول کو بدلنے کی ایک دلچسپ تدبیر سوچی۔ ماحول کی تبدیلی سے اُس کا مقصد خیال و فکر کی مصروفیت اور وجدان کی تفریح تھا۔ !

ناصر کی ٹہل کے لیئے دو نرسیں مقرر تھیں، جو مختلف اوقات میں اُس کی دیکھ بھال کرتی تھیں۔ ایک نرس جس کا نام مس روزی تھا، تیس سال سے کچھ اُوپر عمر کی تھی۔ اس کا رنگ باورچیخانہ کی دیواروں کے رنگ سے ملتا جلتا تھا، فرق صرف اتنا تھا کہ باورچی خانہ کی دیواروں کے بعض حصے کم سیاہ ہوتے ہیں، اور مس روزی کے رنگ نے جسم کو مساوات کا جامہ پہنا دیا تھا مس روزی کی کمر کا گھیر حبش کی حاملہ عورت کی کمر کے دور سے ملتا ہوا تھا۔ کوتاہ پیشانی، موٹے ہونٹ، ٹھوڑی پر ایک گہرا نشان، موٹی پنڈلیاں، اُس پر نرسوں کی سفید وردی پہن کر "خریطۂ بلغم" معلوم ہوتی تھی۔ دوسری نرس کا نام مس فشر تھا۔ اس کی عمر بیس کے لگ بھگ تھی، اس کا رنگ گندمی تھا، چہرے پر چیچک کے بہت ہی ہلکے ہلکے نشان تھے، اس کا جسم مدقوقوں کی طرح پتلا تھا۔ آنکھیں البتہ دلکش تھیں، یہ نرس شفاخانہ کی سب سے زیادہ حسین نرس تھی، ڈاکٹر، طلبا، اور کمپاؤنڈر سب کے سب اس کو قدر کی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔

ناصر نے ان نرسوں کی طرف ایک دن بھی توجہ نہیں کی۔ لیکن اب اُسے تفریح کے لئے ایک دلچسپ موضوع کی ضرورت تھی، شفا خانہ کی جامد اور غیر متنوع فضا میں، ناصر جیسے شوخ فطرت انسان کو ایک مہینہ گذارنا بہت مشکل تھا۔ ناصر شوخ اور چلبلا ہونے کے ساتھ، غیور اور خوددار بھی واقع ہوا تھا۔ عام طور پر مسخرے اور ظریف آدمی زیادہ خوددار نہیں ہوا کرتے۔ لیکن ناصر کی ذات میں یہ متضاد صفات جمع ہوگئی تھیں۔ اُس نے تفریح کا موضوع سوچ لیا تھا۔ مگر وہ چاہتا تھا کہ "موضوع تفریح" کی جانب ہی سے پہل ہو۔ ایک دن وہی موٹی نرس (Nurse.) ناصر کا منہ دھلا رہی تھی، مُنہ دھلانے کے بعد، مس روزی نے ناصر کے چہرے کو تولیہ سے پونچھنا شروع کیا۔ مس روزی نے ناصر کے رخساروں کو کئی مرتبہ تولیے سے آہستہ آہستہ رگڑا، ناصر نے بھی اپنے جسم کو اس انداز کا بنا لیا تھا، جیسے روزی کے ہاتھوں کا لمس اُسے بھلا معلوم ہو رہا ہے۔ ناصر کی اس ذرا سی بناوٹی توجہ نے روزی کی پژمردہ تمناؤں میں جان ڈال دی، وہ سمجھی کہ ناصر سچ مچ اُس سے دلچسپی رکھتا ہے،

"آپ کے رخساروں کو تولیے کی رگڑوں سے"

"کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی، مسٹر ناصر۔ !" روزی نے جھجکتے ہوئے دریافت کیا۔

"آپ تو مُنہ دھلانے میں مشتاق معلوم ہوتی ہیں، بھلا"

"تکلیف کا کیا سوال ہے، شاید میں بھی اتنی آہستگی"

"اور نرمی کے ساتھ اپنا مُنہ تولیے سے صاف نہ کرتا۔ !" ناصر نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"اس میں میرا کیا کمال ہے، یہ تو آپ کے نرم و گداز"

"رخساروں کی خوبی ہے۔ آپ کونسا صابون

استعمال کرتے ہیں" روزی نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"میں کوئی خاص قسم کا صابون استعمال نہیں کرتا"

"ان ہی صابونوں سے جو عام طور پر استعمال کئے جاتے ہیں، منہ دھو لیتا"

"ہُوں ———————" ناصر نے آدھا جملہ بے

پروائی کے ساتھ اور آدھا جملہ قدرے توجہ کے ساتھ ادا کیا۔

مس روزی جواب دینا چاہتی تھی، کہ کسی ضرورت سے، ڈاکٹر نے اُس کو آواز دی، اور وہ محبت کے افسانہ کو بالکل نامکمل حالت میں چھوڑ کر چلی گئی، چلتے وقت اُس نے ناصر کو نہایت ہی محبت بھری نگاہوں سے دیکھا۔ اُس کے موٹے ہونٹوں پر تبسم کھیل رہا تھا، اور اُس کے اُبھرے ہوئے سیاہ گال چمکیلے ہو گئے تھے، ناصر نے بھی جواب میں مصنوعی تبسم پیدا کیا۔

ناصر کی ٹہل کے لئے مس روزی اور مس فشر دو نرسیں مقرر تھیں، جو باری باری سے ناصر کی خدمت کرتی تھیں، دُوسرے دن مس فشر کی باری تھی، مس فشر چونکہ مس روزی کے مقابلہ میں کمسن اور ذرا شوخ اور قبول صورت تھی، لہٰذا اُس کی چال ڈھال میں ایک قسم کی تمکنت پائی جاتی تھی مس روزی کی طرح وہ عشاق کی بھوکی نہ تھی، وہ اپنے حسن کے متعلق "حسنِ ظن" رکھتی تھی، جس نے اُس میں خود اعتمادی کا جذبہ پیدا کر دیا تھا۔ لیکن اُس کی آنکھوں کے سیاہ حلقے، اُس کے رخساروں کی بے رونقی، اُس کے ہونٹوں کی مصنوعی شگفتگی، اُس کے سینہ کی فتادگی، اُس کی کمر کی پُرمعنی لچک کو دیکھ کر، اُس کے متعلق بہت کچھ

معلوم کیا جا سکتا تھا، وہ اپنے کو "مس" (Miss) بنا کر پیش کرنے کی بہت کچھ کوشش کرتی تھی، مگر اُس کے انداز کو دیکھ کر، تاڑنے والے تاڑ جاتے تھے کہ دوشیزگی کا یہ پُرفریب طلسم کتنی بار ٹوٹ چکا ہے۔

مس فشر اور مس روزی میں اتنا فرق تھا کہ مس فشر نے اپنی کمسنی کو دولت کے بازار میں بکنے کے لئے رکھ دیا تھا اور گاہک اس جنسِ کمیاب کی طرف خود متوجہ ہوتے تھے۔ برخلاف اس کے مس روزی اپنے گاہک خود فراہم کرتی تھی۔ ناصر کو نہ تو مس روزی سے کوئی دلچسپی تھی۔ اور نہ مس فشر کا حسن مدقوق اُس کے لئے جاذبِ توجہ تھا۔ وہ تو شفاخانہ میں چند دن تفریح کے ساتھ گذارنا چاہتا تھا۔ اسی تفریح کے لحاظ سے اُس نے دو چار بار مس فشر کے پاس پھل، اور ایک آدھ بار کوئی اور تحفہ بھیجدیا۔ مس فشر اب ناصر سے توجہ کے ساتھ پیش آنے لگی، وہ اس خود فریبی میں مبتلا ہو گئی تھی۔ کہ ناصر اُس کے حسن و جمال سے متاثر ہو کر، یہ سب کچھ کر رہا ہے، ناصر کے بھیجے ہوئے سیبوں کو جب اُس نے تناش کر کھایا ہے، تو اُس نے اپنے اوپر متکبرانہ انداز میں ایک نظر ڈالی۔

مس فشر اب ناصر سے قدرے بے تکلفی کے ساتھ بات چیت کرنے لگی، دوسرے مریضوں کے مقابلہ میں۔ وہ ناصر کے ساتھ زیادہ توجہ و التفات کے ساتھ پیش آنے لگی، ناصر کے بناوٹی انداز نے، مس فشر کو بھی اس فریب میں مبتلا کر دیا تھا، کہ وہ اُس سے محبت کرتا ہے۔ ایک دن مس فشر کی باری تھی، فشر ناصر کے پلنگ پر بیٹھ کر اُس سے باتیں کر رہی تھی، مس روزی بھی کسی کام سے ادھر آنکلی، وہ جو کسی تجربہ کار شاعر نے کہا ہے کہ:۔

باسایہ ترا نمی پسندم
عشق است و ہزار بدگمانی

ٹھیک اسی زاویہ نگاہ کے تحت، مس فنشر سے ناصر کو ملتفت دیکھ کر، مس روزی کا ماتھا ٹھنکا، جوشِ رقابت نے اُس کے تن بدن میں اک آگ سی لگادی، وہ دور کھڑے ہوکر، اس جگر خراش منظر کو دیکھتی رہی، تھوڑی دیر بعد مس فنشر وہاں سے اٹھ کر چلی گئی، روزی نے اُس وقت "مصلحتاً" ناصر کے پاس آنا مناسب نہ سمجھا۔ دوسرے دِن اُس کی باری تھی، وہ ناصر کے پاس آئی، اور اس انداز کے ساتھ آئی، کہ اُس کی سیاہ پیشانی کی لکیریں اُبھری ہوئی تھیں۔ اُس کے موٹے ہونٹ لٹکے ہوئے سے تھے، اور اُس کی آنکھوں میں عتاب، پوری قوت کے ساتھ حل ہونے کی کوشش کر رہا تھا، ناصر نے روزی کے چہرے پر نظر ڈالی، تو اس کو کچھ اور ہی عالم نظر آیا، ناصر بالکل سنجیدہ بنا رہا۔ اُس نے روزی سے اس کی برہمی کا سبب بھی دریافت نہیں کیا۔ روزی اس کی منتظر تھی کہ ناصر کی طرف سے پہل ہو، اور ناصر آج صبح سے "بتِ خاموش" بن گیا تھا۔ روزی سے آخر ضبط نہ ہو سکا۔

"کہئے آپ کی فنشر کی طبیعت کیسی ہے؟" مس روزی نے قدرے برہمی کے انداز میں دریافت کیا۔

"فنشر کا حال آپ مجھ سے بہتر جانتی ہیں"۔

"اور ہاں یہ آپ کی فنشر، سے آپ کا کیا"

"مطلب ہے! مس روزی، آپ ایسا سفاکانہ"

"مذاق بھی کرنا جانتی ہیں ———— ناصر نے جواب دیا۔

"کل آپ کس التفات کے ساتھ اُس سے"

"باتیں کر رہے تھے، یاد ہیں آپ کو وہ اپنی"

"ملتجی نگاہیں —!" مس روزی نے بالوں کو ماتھے پر گرہ دیتے ہوئے کہا،

مس روزی کی گفتگو سے ناصر سب کچھ سمجھ گیا۔ ناصر نے تھوڑی دیر سکوت کیا۔ اُس کے بعد وہ بولا۔

"آپ بڑی بدگمان واقع ہوئی ہیں، مس روزی!

"کیا کسی سے بات چیت کرنا گناہ ہے۔"

اس پر روزی نے جواب دیا:۔

"کسی سے بات چیت کرنا تو گناہ نہیں ہے، مگر ——!"

ناصر کچھ کہنا چاہتا تھا، کہ اُسے کھانسی آگئی، اور وہ ایک منٹ تک کھانستا رہا۔

"مگر —— !کیا مطلب ہے آپ کا!" ناصر" ہونٹوں کو رومال سے پونچھتے ہوئے بولا۔

"اپنے دل کی بات، آپ مجھ سے پوچھتے ہیں، اتنے نادان"

"نہ بنیے مسٹر ناصر — ! مس فنتر جوان ہے، نازک،"

" ہے ، سفید فام ہے ، وہ آپ کو پسند بھی ہونی چاہیئے۔ " مس روزی نے نولیبہ کو ہاتھ پر لپٹتے ہوئے کہا۔

" مس روزی ، تم نے آج ایسی باتیں کی ہیں ، کہ میرا "
" دِل جتنا آج دکھا ہے ، اتنا کبھی نہیں دُکھا۔ "
" شریف آدمی ، بس ایک ہی سے محبت کرتا ہے۔ جس کا "
" ہو گیا ، اُس کا ہو گیا ، مس فنشر واقعی کمسن ہے ، اور اُس کا "
" رنگ بھی کھلتا ہوا ہے ، لیکن میں اپنی نگاہوں کو کیا کروں "
" کہ اُن کو سفید رنگت ایک آنکھ نہیں بھاتی ۔ مجھے ہمیشہ سے "
" سانولی رنگت پسند ہے۔ اور کمسن چھوکریاں ، جو عشق و محبت "
" کے معاملہ میں بالکل ناتجربہ کار ہوتی ہیں ، ان سے مجھے کبھی "
" دلچسپی نہیں ہوئی۔ "
" مس روزی ! میری نگاہیں ، جس "حسن" کی تلاش "
" میں تھیں ، وہ مجھے مل گیا ، اور یہ عجیب اتفاق ہے کہ وہ "
" حسن مجھے شفاخانہ کی چہار دیواری میں ملا ، اس "
" راز کو اگر میں فاش کر دوں تو تم ابھی جھینپ جاؤ ۔ "
" روزی ! خدا کے لئے بدگمانی کو اپنے دِل سے نکال دو ، میرے پاس سے "

"رخصت ہوتے وقت، تمہاری پیشانی پر اگر ایک"

"بھی سلوٹ باقی رہی تو میں سمجھونگا کہ تم مجھ سے ناراض ہو۔"

"روزی مجھے دیکھ کر مسکرادو، اُسی انداز کے ساتھ — !— ناصر نے کمال تصنع کے ساتھ کہا۔

روزی کو اسی بات کا کھٹکا تھا کہ مس فنشر اُس کے مقابلہ میں کمسن اور قبول صورت ہے۔ اس لئے ممکن ہے کہ ناصر نے اپنے دل کی باگ اُدھر پھیر دی ہو۔ لیکن ناصر کی لچھے دار باتوں نے نہ صرف اُس کی بدگمانی کو رفع کر دیا، بلکہ وہ اس فریب میں مبتلا ہوگئی کہ اُس کے حسن میں واقعی جاذبیت موجود ہے، اور اُس کا جامنی رنگ، چاندنی جیسے سپید رنگ کے مقابلہ میں زیادہ دلکش ہے اور وہ لوگ نہایت ہی کور ذوق اور بد مذاق ہیں، جو اُس کے ہوتے ہوئے مس فنشر یا دوسری نرسوں کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ مس روزی، ناصر کے پلنگ کے قریب کرسی پر بیٹھ گئی۔ اُس نے کہنا شروع کیا:۔

"مسٹر ناصر! آپ مس فنشر کے حالات سے واقف نہیں"

"ہیں، اسی قسم کی بدقماش چھوکریوں نے نرسنگ (Nursing)"

"جیسے معصوم اور معزز پیشہ کو بدنام کر دیا ہے اس لڑکی کو"

"بڑے شفاخانہ سے یہاں سزا کے طور پر منتقل"

"کیا گیا ہے، بڑے شفاخانہ میں اس نے بہت سے نوجوان طالب علموں کی"

"زندگیاں تباہ کر دیں۔ یہ تو پیسہ کی پجارن ہے"

" پیسہ ہو تو اس کی جوانی ہر وقت خریدی جا سکتی ہے۔ اسی "
" شفاخانہ کے ایک ڈاکٹر صاحب جو آجکل چھٹی پر ہیں، اسی چھوکری "
" کے چکر میں آکر، تباہ ہو گئے۔ "

" اور ہاں! یہ بہت سے نسوانی امراض میں بھی مبتلا ہے۔ "
" آپ دیکھتے نہیں ہیں اس کے چہرے کی زردی کو! ایسا "
" معلوم ہوتا ہے جیسے دق کا آخری درجہ شروع ہو گیا ہے۔ اور "
" ہاں مسٹر ناصر! ایک بار میرے کہنے سے، آپ اس کی "
" چال اور کمر کی لچک کو خاص طور پر دیکھیں، آپ جب غور سے "
" دیکھیں گے، تو آپ کو محسوس ہوگا، کہ کسی داخلی صدمہ کے باعث "
" یہ اپنے پیڑو کو ذرا تکلف کے ساتھ جنبش دیتی ہے، ہیں "
" اس کا پردہ کھولنا نہیں چاہتی، ورنہ مجھے اس کی کونسی "
" بات معلوم نہیں۔ اس کی کتاب ملازمت میں، اس کے "
" چال چلن پر بہت کچھ ریمارک کیا گیا ہے۔ اس فنتر کے "
" کوئی رشتہ دار، محکمہ طبابت میں بڑے عہدے پر ہیں، اُن ہی کی "
" وجہ سے یہ اب تک بچی ہوئی ہے، نہیں تو اسے محکمہ نے کبھی کا "
" علیحدہ کر دیا ہوتا۔ "

ناصر نے بناوٹی انہماک و توجہ کے ساتھ، روزی کی گفتگو کو سُنا۔ اُس نے اِدھر اُدھر دیکھ کر آہستہ سے کہا:۔

"آپ کے کہنے سے پہلے، مجھے فشر کے کرتوت"

"معلوم ہو چکے ہیں، میں نے کوک شناس ہیں"

"پڑھا ہے کہ اس جلیبی کی عورت بڑی زمانہ ساز"

"اور چالاک ہوتی ہے۔ آپ کا خیال بہُت"

"صحیح ہے، یہ لڑکی، ضرور کسی نسوانی مرض میں"

"مبتلا ہے، میں نے اسے بارہا رانیں اور پیڑو کھجاتے"

"ہوئے دیکھا ہے۔"

تھوڑی دیر کے بعد مس روزی چلی گئی، وہ بے اطمینانی اور اضطراب کا ایک آتشکدہ لیکر آئی تھی۔، اور سکون و اطمینان کی پُر فضا دنیا لیکر رخصت ہوئی، ناصر کی باتوں کا جادو، اُس پر چل گیا۔

ناصر نے اِدھر تو مس روزی کو فریب دے رکھا تھا، اور اُدھر مس فشر کو باور کرا دیا تھا کہ "میں تم پر مرتا ہوں"۔ ایک دن شام کو مس فشر کی باری تھی، باتوں باتوں میں مس روزی کا ذکر نکل آیا۔ ناصر نے بطف کیناطر، مس روزی کی تعریف کر دی، اس پر مس فشر نے کہا:۔

"مسٹر ناصر، بڑی ہی چالاک اور کمینہ فطرت ہے"

"یہ موٹی عورت، یہ ہر بات میں میری برابری کی کوشش"
"کرتی ہے، میرا تو سارا اس کا جوڑ ہی کیا۔! اس کا باپ"
"موٹر ڈرایور تھا، اور ماں، ڈبل روٹی بیچا کرتی تھی"
"میرا باپ بنگال ریلوے میں گارڈ تھا، اور میری ماں"
"انگلستان کے معزز گھرانے کی بیٹی تھی۔ یہ نیچ ذات بھلا"
"میری برابری کیا کر سکتی ہے۔"
"وہ جو کسی نے کہا ہے کہ "جیسی رُوح ویسے فرشتے" یہ مثال"
"مس روزی پر پوری اترتی ہے، شفاخانہ کے چپراسیوں کا"
"جمعدار اس کے پیچھے بدنام ہو چکا ہے، بڑی ہی ہوس پرست ہے"
"یہ موٹی پنڈلیوں والی ۔۔!"

ناصر نے بھی مس فشر کی ہاں میں ہاں ملا دی، اور مس فشر ناصر کے پاس سے خوش ہو کر رخصت ہوئی۔

اس شفاخانہ میں چند طلباء کو طب کا فنی تجربہ حاصل کرنے کے لئے بھیجا گیا تھا۔ یہ طلباء بہت زیادہ بن سنور کر رہتے تھے، اور اپنی رفتار اور گفتار سے اپنے کو "انگریز" ثابت کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ ان کے دل و دماغ پر فرنگی تہذیب کا خوفناک بھوت سوار تھا۔ ان نوجوانوں نے اپنے ناموں کو انگریزی حروف کی ترکیب کے ساتھ مسخ کر کے، انگریزوں کے ناموں

جیسا بنا لیا تھا۔ ان نوجوانوں میں ایک طالبِ علم جس کا نام اشرف تھا، ناصر کے پاس آیا جایا کرتا تھا۔ چند دن میں ناصر سے اُس کی بے تکلفی ہوگئی، اشرف بہت کم عمر اور ناتجربہ کار تھا، اور اس زمانے کے عام نوجوانوں کی طرح اُس کے پہلو میں بھی ایک ایسا دل تھا جو بیک وقت ایک درجن عورتوں پر فریفتہ ہونے کی، اپنے اندر قوت رکھتا تھا۔ اشرف مس فشر کو توجہ کے ساتھ دیکھا کرتا تھا۔ ناصر نے اشرف کی نگاہوں سے سب کچھ معلوم کر لیا تھا، ایک دن باتوں باتوں میں مس فشر کا ذکر نکل آیا۔ ناصر نے اس انداز کے ساتھ گفتگو کی، جیسے مس فشر بالکل اُس کی مٹھی میں ہے۔ اور اُس کی کسی بات کو وہ ٹال نہیں سکتی۔

اشرف کے لئے ناصر کی ملاقات غیر مترقبہ نعمت سے کم نہ تھی، اُس نے ناصر کے پاس اب بہت زیادہ آنا جانا شروع کر دیا۔ ناصر سے وہ بے تکلف ہونیکی کوشش کر رہا تھا۔ ناصر تو اس کے لئے پہلے سے تیار تھا، وہ دونوں بہت جلد بے تکلف ہوگئے، اور آخر اشرف نے اپنے محبت زدہ دل کی داستان سنا ہی ڈالی، اُس نے کہا:——

" بھائی ناصر! میں آپ کو اپنا رازدار بناتا ہوں، دیکھئے "

" میرے اور آپ کے سوا کسی دوسرے کو یہ بات معلوم نہ ہو "

" آج سے تین سال قبل میں الیف۔ اے میں تعلیم "

" پاتا تھا، اور مس فشر نرسنگ (nursing) "

" کی تربیت (Training) حاصل کر رہی تھی "

"ہمارا کالج اور طبیہ کالج، دونوں قریب قریب تھے"
"بس وہیں اس کو دیکھکر میرے دل کو اس سے ایک تعلق"
"پیدا ہوگیا۔ میرے لئے ایف۔ اے کے امتحان میں کامیابی"
"حاصل کرنے کے بعد، کئی محکموں میں اچھے موقع حاصل تھے، مگر"
"مس فشر کی محبت نے مجھے طبابت کی لائن میں کھینچ"
"بلایا۔ اسی توقع پر کہ شفاخانہ میں پہنچکر، اس سے ملاقات"
"کے موقعے ملتے رہیں گے، میں نے محنت کے ساتھ تین سال کا"
"نصاب پورا کیا۔ اب یہ میرا آخری سال ہے مجھے شفاخانہ"
"میں متعین ہوئے، تین مہینہ ہوگئے، مگر مس فشر نے"
"سرکاری معاملات کے سوا کبھی ایک بات بھی نہیں کی"
"میرے باپ کلکٹری کچہری میں ملازم ہیں اُن کی"
"آمدنی سو روپیہ مہینہ سے زیادہ نہیں ہے۔ اس پر پورے"
"گھرانے کی کفالت! میں نے اس غریبی کیحالت میں"
"بھی، اپنی بساط سے بہت زیادہ، مس فشر کے لئے خرچ کردیا ہے"
"اسی گذشتہ کرسمس پر میں نے اپنی ماں کی سنہری چوڑیاں گرو رکھ کر"
"مس فشر کو اُس کے ساتھیوں کے ساتھ زبردست پارٹی دی مگر مس"

" فنشر کی بے التفاتی کا وہی عالم ہے۔ بات یہ ہے کہ دوسرے لوگ "
" مجھ سے بہت زیادہ مالدار ہیں، وہ آئے دن مس فنشر کی بڑی "
" بڑی فرمائشوں کی تکمیل کرتے رہتے ہیں۔ میرے بس کا یہ روگ "
" نہیں۔! عاشق کی مفلسی بھی کتنی دردناک ہوتی ہے۔! "
" کاش! میں مالدار ہوتا۔! "

ناصر نے اشرف کو بہت کچھ سمجھایا کہ اس ہوس پرستی کو محبت نہیں کہتے، تمہاری موجودہ روش نہایت خطرناک ہے، مگر اشرف نے ہر بات کے جواب میں یہی کہا کہ:۔

" میں دل کے ہاتھوں مجبور ہوں، خدا کے لئے "
" میری مدد کرو۔ "

ناصر نے جب دیکھا کہ یہ شخص کسی طرح ماننا ہی نہیں۔ تو اُس نے کچھ سوچ کر " ہامی " بھرلی۔ کہ وہ مس فنشر سے مناسب الفاظ میں اُس کا تذکرہ کردیگا۔ اشرف، اب دن میں دو دو تین تین مرتبہ ناصر کے پاس آنے جانے لگا۔ ناصر نے ایک دن، اشرف سے کہا،

" میں نے مس فنشر سے تمہارا ذکر کردیا ہے، اُس نے "
" بڑی توجہ کے ساتھ تمہارے ذکر کو سُنا۔ وہ بھی "
" تم کو چاہتی ہے، مگر اس کا اظہار نہیں کرسکتی، تم آج "
" اُس سے تنہائی میں ملنے کی کوشش کرنا۔ اور "

"دیکھنا! یہ انگریز قسم کی عورتیں، مرد کی شوخی اور"

"بے تکلفی کو پسند کرتی ہیں، تم ذرا اس کو چھیڑنا"

"بھی، ڈرنا نہیں اشرف! انگلی کا ٹہوکا بھی"

"تم دے سکتے ہو ——!"

اشرف کی باچھیں کھل گئیں۔ وہ اس تاک میں رہا کہ مس فشر کہیں اُسے تنہا مل جائے، اور وہ آج اپنی دیرینہ تمنا کا اظہار کرے رہے، اتفاق کی بات کہ آپریشن تھیٹر کے قریب کے کمرے میں مس فشر، دوا لینے کے لئے گئی، اشرف بھی، تھوڑی دیر کے بعد کمرے میں داخل ہو گیا مس فشر بالکل تنہا تھی، وہ بڑی بوتل سے چھوٹی بوتل میں تیزاب انڈیل رہی تھی۔ اشرف کے لئے یہ موقعہ بہت غنیمت تھا، اُس نے "ڈارلنگ" کہکر، فشر کے رخسار کو ٹہوکا دیا۔ فشر نے چونک کر، اشرف کے منہ پر اس زور سے تھپڑ رسید کیا کہ وہ تلملا کر رہ گیا، اور تیزاب کی بوتل اُس کی پتلون پر الٹ دی، مس فشر اشرف کا منہ چڑاتے ہوئے وہاں سے چلی گئی۔

اشرف کا سارے شفاخانہ میں ایک ناصر ہی ہمدرد اور غمگسار تھا، اُس نے ناصر کو آکر اپنی آپ بیتی سُنائی۔

"اشرف! تم نے فشر کے رخسار کو کون سے"

"ہاتھ کی انگلی سے ٹہوکا دیا تھا۔" ناصر نے دریافت کیا۔

"سیدھے ہاتھ کی انگلی سے!" اشرف نے گال کو سہلاتے ہوئے جواب دیا۔

"بھئی! کسی نے سچ کہا ہے کہ بارہ برس دِلّی"
"میں رہے، اور بھاڑ جھونکا! اتنے دن کالج"
"میں پڑھنے کے بعد بھی، تم کو انگریزی تہذیب سے"
"واقفیت نہیں ہوئی، بڑے اچنبھے کی بات ہے"!
"یہ انگریز اُلٹے ہاتھ سے کھاتے ہیں، اُلٹی طرف سے"
"لکھتے ہیں، غرض اِن کے یہاں بہت سے کاموں میں"
"اُلٹا پن پایا جاتا ہے۔ اور یہی ان کی تہذیب ہے"
"محبت کا معاملہ بڑا نازک ہے بھائی اشرف! ایک"
"نیم انگریز شریف خاتون، یہ کس طرح برداشت کر سکتی"
"تھی، کہ اقدامِ محبت سیدھے ہاتھ سے "
"کیا جا رہا ہے "
"بھائی! انگریزوں اور ہندوستانیوں میں۔ "
"اسی اُلٹے پن کا تو فرق ہے۔ ہندوستانی کتے سے"
"نفرت کرتا ہے، اور یہ انگریز کتے کا منہ چومتے ہیں۔"
"اور یہ لوگ کتوں کو موٹروں میں اپنے ساتھ اس طرح"
"لئے پھرتے ہیں، جیسے کتے ان کے بڑے گاڑھے دوست"
"ہیں ——————"

"یہ مہذب لوگ، ٹوپ کو اکثر جوتوں کے قریب بے پروائی"
"کے ساتھ پھینک دیتے ہیں بہر حال انگریزی تہذیب اور"
"ہندوستانی تہذیب میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ میں"
"یہ نہیں کہتا کہ تم انگریزی تہذیب کی تقلید کرنا"
"شروع کر دو۔ لیکن جب ایک کرسٹان عورت سے"
"محبت کی پینگ بڑھانا چاہتے ہو تو پھر اس"
"مرحلہ کو طے کرنے کے لئے انگریزی تہذیب کی باتوں پر"
"ہی عمل کرنا پڑے گا۔

اشرف تھوڑی دیر بیٹھنے کے بعد، ناصر کے پاس سے اٹھ کر چلا گیا۔

شفاخانہ کا ایک ڈاکٹر جو دواخانہ کی نرسوں کو بلا شرکت غیرے اپنا تابع سمجھتا تھا، ناصر سے کھٹکنے لگا۔ ایک دن مس فشر، ناصر سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھی، یہ ڈاکٹر نو نرسوں کے تبسم کو اپنے لئے مخصوص سمجھتا تھا۔ اُس نے مس فشر کو ناصر کے سامنے بہت ڈانٹا، اور ناصر سے ترشروئی کے ساتھ کہا:۔

"آپ کے اخلاق پر افسوس آتا ہے۔"
"خیر! آپ کے جانے میں دو دن باقی رہ گئے ہیں"

"یں کوئی نوٹس نہیں بنتا۔"

ناصر جھینپ کر خاموش ہو گیا۔ دوسرے دن شام کو مس فشر اُس کے پاس آکر کرسی پر بیٹھ گئی۔ کمپاؤنڈر نے فشر کو آواز دی کہ سول سرجن صاحب یاد فرماتے ہیں۔ مس فشر تیزی کے ساتھ دوڑی۔ ناصر کے پلنگ سے چند قدم کے فاصلہ پر اُس کی جیب سے کوئی پُرزہ نکل کر فرش پر گر پڑا۔ ناصر نے اس پُرزے کو اٹھا کر پڑھا۔ یہ پُرزہ ان ہی ڈاکٹر صاحب جنہوں نے ناصر کو اخلاق کا درس دیا تھا" مس فشر کے نام لکھا تھا، اس خط کے پڑھنے سے ڈاکٹر اور مس فشر کے تعلقات پر بہت کچھ روشنی پڑتی تھی۔ ناصر نے اس خط کو سنبھال کر، اپنے ہینڈ بیگ میں رکھ لیا۔

اس واقعہ کے دوسرے دن، ناصر دواخانہ سے اچھا ہو کر رخصت ہو گیا۔ مس فشر اور مس روزی کے افسانے ناتمام رہ گئے۔ ناصر نے چلتے وقت فشر اور روزی کو اپنے یہاں دعوت دیکر بلانے کا وعدہ کیا۔ وہ دونوں رضامند ہو گئیں۔ ایک مہینہ کے بعد ناصر نے دونوں نرسوں اور اُسی ڈاکٹر کو اپنے یہاں چائے پر مدعو کیا۔ ڈاکٹر کے ذہن سے ناصر کا خیال بھی نکل گیا تھا۔ ڈاکٹر ذرا دیر سے ناصر کے یہاں پہنچا، نرسیں بہت پہلے آچکی تھیں۔ ناصر کے مکان کے دروازے پر اُس کے نوکر نے ڈاکٹر کا استقبال کیا۔ اور اُسے ناصر کے کمرے میں پہنچا دیا۔ ڈاکٹر نے دیکھا کہ وہی نوجوان مریض، جس نے شفاخانہ میں عاشقی شروع کر دی تھی، اُن ہی دونوں نرسوں کو لئے ہوئے بیٹھا ہے، ڈاکٹر کے تن بدن میں آگ لگ گئی،

"مجھے دھوکا ہوا، آپ کا ہی اسم مبارک"

"ہے۔ ایم۔ این۔ ناصر۔ ا خوب۔ !" ڈاکٹر نے کہا۔

"جی ہاں خاکسار ہی کا نام ہے ——————" ناصر نے جواب دیا۔

"تو میں رخصت ہونا چاہتا ہوں" "اخلاق اور محکمہ"

"کے قانون کے لحاظ سے میں اس صحبت میں"

"چائے نہیں پی سکتا" ڈاکٹر جانے کے لئے پر تولتے ہوئے بولا۔

"آپ کی خوشی، چائے نہ پیجئے، مگر اپنے اخلاق و"

"کردار کی ایک جھلک تو دیکھتے جایئے۔"

ناصر نے یہ کہتے ہوئے، ڈاکٹر کا وہ خط میز کی دراز میں سے نکال کر ڈاکٹر کو دکھایا۔ جو اُس نے مس فشر کو لکھا تھا۔ ڈاکٹر کو خط دیکھتے ہی پسینہ آگیا۔ وہ "معافی، جی ہاں، شکریہ، خیر!" وغیرہ قسم کے مہمل الفاظ کہتے ہوئے وہاں سے اٹھ کر چلا گیا۔

کئی دن کے بعد ناصر نے اخبار میں اُسی ڈاکٹر کے تبادلہ کی خبر پڑھی، اُس نے یہ بھی پڑھا کہ شفاخانہ میں، ایک جلسہ منعقد ہوا، جس میں ڈاکٹر کی خدمات اور اُس کے کردار کو بہت کچھ سراہا گیا ناصر نے غصہ میں آکر اخبار کو پھاڑ دیا ——————!

شرافت

"ایک لحظہ کی صحبت بھی اپنا اثر قائم کرتی ہے۔"

"پھول کی پتّی کو چھونے کے بعد، کانٹے کی نوک کو"

"چھوؤ، ——— عفو و گذر اور انتقام کا فرق"

"معلوم ہو جائے گا ———————"

شرافت

شیخ لطافت حسین، نہر کے محکمہ میں انجنیئر تھے۔ شیخ صاحب نے اپنی ساری زندگی نہایت ہی دیانت اور پرہیزگاری کے ساتھ بسر کی۔ نہر کے محکمہ میں قدم قدم پر "دستِ غیب" کے مواقع میسر آتے ہیں، مگر شیخ لطافت حسین کا کردار ان لغزشوں سے ہمیشہ پاک رہا۔ دیانت اور راستبازی کی انتہا ہے۔ کہ وہ اپنے ماتحتوں کے یہاں دعوت کھانا بھی گوارا نہ کرتے تھے، لطافت حسین جس ڈویژن میں گئے نیک نام رہے، اور جب ایک ڈویژن سے دوسرے ڈویژن کو اُن کا تبادلہ ہؤا، تو لوگوں نے نہایت ہی تاسف کے ساتھ اُن کو رخصت کیا۔ محکمہ نہر کے ٹھیکیدار عام طور پر اس قسم کے خشک عہدیداروں سے خوش نہیں رہتے، مگر شیخ لطافت حسین سے نہر کے ٹھیکیدار بھی خوش تھے، اُن کی سچائی نے قبولِ عام حاصل کر لیا تھا۔ نہر کے محکمہ میں اُن کی دیانت اور کارگذاری ضرب المثل بن گئی تھی۔ شیخ صاحب ایک سب اورسیر کی حیثیت سے حلقۂ ملازمت میں داخل ہوئے تھے، اور ایک انجنیئر کی حیثیت سے انہوں نے وظیفہ پر سبکدوشی حاصل کی،

شیخ لطافت حسین کے باپ نے معمولی آمدنی کی جائداد چھوڑی تھی، شیخ صاحب اس جائداد میں برابر اضافہ کرتے رہے، یہاں تک کہ جب وہ وظیفہ پر علیحدہ ہوئے ہیں، تو اُن کے پاس

کم وبیش سات ہزار روپیہ سالانہ کی جائداد تھی، شیخ صاحب نے اپنے وظیفہ کے ایک جُز کو فروخت کرکے، کچھ جائداد اور خرید لی۔ لطافت حسین کی پہلی شادی بہت ہی کمسنی میں ہوگئی تھی، چار پانچ سال پہلی بیوی کا ساتھ رہا، اور زچگی میں ہی اُس کا انتقال ہوگیا۔ دُوسری شادی انھوں نے ملازم ہونے کے بعد کی، جس سے ایک لڑکا اور ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ لڑکی دو سال کی ہو کر مرگئی، لڑکے کا نام شرافت حسین تھا، جس کی تربیت و تعلیم خود شیخ صاحب کی نگرانی میں ہوئی تھی، شرافت کوئی تین برس کا تھا کہ اُس کی ماں بھی مرگئی، شیخ صاحب پر تین سال تک بیوی کی موت کا بہت زیادہ اثر رہا۔ تین سال کے بعد انھوں نے اپنے ہی خاندان کی ایک بیوہ عورت سے نکاح کرلیا۔ اس بیوی سے ایک لڑکا پیدا ہوا، جس کا نام بشارت حسین تھا۔ بشارت کے ماموں اُس کو بہت چاہتے تھے، بشارت زیادہ تر اپنے ماموں کے یہاں رہتا تھا، شرافت کی طرح بشارت کی تربیت کا شیخ صاحب کو موقعہ نہ مل سکا۔ بشارت نے اپنے ماموں کے یہاں بڑے لاڈ پیار میں پرورش پائی تھی، بشارت کے ماموں شہر کے خوشحال لوگوں میں تھے، اُن کے یہاں شہر کے بےفکرے لوگوں کی بیٹھک رہتی تھی، دن رات چوسر، شطرنج اور گنجفہ ہوتا تھا۔ بشارت کے ماموں مُرغ بازی اور کبوتر بازی میں مشہور تھے، بشارت اپنے دوستوں سے فخر بہ طور پر کہا کرتا تھا کہ ہمارے ماموں کے یہاں چالیس قسم کے کبوتر موجود ہیں، بشارت کی تربیت اسی ماحول میں ہوئی تھی، اُس کو کبوتروں اور مرغوں کی قسموں کے نام ازبر تھے، بشارت کے ماموں، اپنے دوستوں سے فخر یہ کہا کرتے تھے:۔

"میرا بھانجا بشارت بڑا ذہین ہے، خدا اس کی عمر دراز کرے"

" ابھی سے شطرنج کی ایسی چال بتاتا ہے کہ بڑے بڑے "
" مشاق مُنہ دیکھتے رہ جاتے ہیں، اور صاحب بجپسی کی "
" کوڑیاں پھینکنے میں تو اس کو کمال حاصل ہے، ایک مرتبہ تو "
" اس نے چھ ہاتھوں میں آٹھوں کی آٹھوں گوٹیں اٹھا دیں "
" اللہ نے ایسا ذہن دیا ہے کہ تاش کے پورے کے پورے "
" پتّے اس کو یاد رہتے ہیں۔ ایک دفعہ رام پور کے ایک صاحب "
" کبوتروں کے جوڑے لیکر آئے، انہوں نے کبوتر کا ایک "
" جوڑا مجھے دکھا کر کہا کہ یہ نقا کبوتر ہے بشارت بھی میرے "
" پاس بیٹھا ہوا تھا، اس نے کبوتروں کو ہاتھ میں لیکر اُن کے "
" پر اور کلیاں دیکھ کر کہا کہ یہ جوڑا دوغلا ہے، اس پر وہ رام پوری "
" بوڑھا بشارت کا مُنہ دیکھنے لگا، اور بشارت کی کمر "
" ٹھونک کر کہا کہ شاباش! بیٹے، خدا تمہاری عمر دراز کرے آج اپنی "
" زندگی میں مجھے تم پہلے شخص ملے ہو، جو کبوتروں کی اتنی پرکھ رکھتے "
" ہو۔ ململ، چاول اور کبوتر کی پہچان ہر کس و ناکس کا کام نہیں ہے "
" تم نے جس یقین کے ساتھ بات کہی ہے، وہ تمہارا ہی حصّہ ہے "
" میں کبوتر کی ایک جوڑی تمہاری نذر کرتا ہوں ———— "

" پچھلی جمعرات کو ہمارا مرغا، مرزا جی کے مرغے سے لڑ رہا تھا "
" جامع مسجد کے سامنے، تماشائیوں کی بڑی بھیڑ تھی، مرزا جی کے "
" مرغے نے ہمارے مرغے کی آنکھوں پر ٹھونگ مار کر، بیچارے "
" کی آنکھوں کو زخمی کر دیا۔ ہمارا مرغا ذرا پیچھے ہٹ ہٹ کر "
" لڑنے لگا، اُس کی پکڑ سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اب کوئی دیر میں یہ "
" پالی چھوڑ کر بھاگ جائیگا۔ کہنے کو تو مرغے کی لڑائی تھی، مگر آپ "
" جانتے ہیں کہ میری تو عزت، آبرو کا معاملہ تھا، قسم وحدہ، لاشریک کی "
" میرا دل اوپر نیچے ہو رہا تھا، بشارت نے یہ دیکھ کر، سیٹی "
" بجائی، جس کے سنتے ہی ہمارے مرغے نے جو جم کر لڑنا شروع کیا ہے تو "
" خون خرابے کر دئے۔ مرزا جی کا مرغا بہت ہمت کیساتھ "
" لڑا۔ مگر ہمارے مرغے نے جو اُس کے سینہ کی کھال پکڑ کر جھنجوڑا ہے "
" تو مرزا جی کا مرغا ہمارے مرغے کی گرفت سے نکل کر، بھاگ ہی تو گیا "
" مرغ لڑانیوالا کا کمال تو ایسے ہی نازک موقعوں پر ظاہر ہوتا ہے "
" اجی! ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے، بڑے ہو کر شہر میں اس کا کوئی مقابلہ "
" بھلا کر سکیگا ـــــ! "

بشارت کو آوارہ مزاج لڑکوں کی صحبت ملی تھی، ماموں اُس کی ایک ایک بات پر فخر کرتے

تھے، اور وہ سمجھتے تھے کہ یہ فخرِ خاندان ثابت ہوگا۔

شیخ لطافت حسین پنشن لیکر گھر آ گئے۔ اور ایک سال کے بعد بشارت کی ماں بھی چل بسی شرافت کو انہوں نے خود ہی تعلیم دی تھی۔ شیخ صاحب نے شرافت کے لئے ایسا بہتر نصاب (کورس) تجویز کیا تھا جس کی تکمیل کے بعد شرافت کے دماغ کی بہترین تربیت ہو گئی، لوگوں نے شیخ صاحب سے بہت کچھ کہا کہ شرافت کو کسی اسکول میں داخل کرا دیجئے، مگر شیخ صاحب نے کہہ دیا۔ کہ میں اپنے لڑکے کو غلام بنانے کے لئے تعلیم دینا نہیں چاہتا جس تعلیم کا مقصد صرف ملازمت ہو، ایسی تعلیم، بچوں کے دل و دماغ کی فطری تربیت نہیں کر سکتی، یہ تمام یونیورسٹیاں، میرے خیال میں غلامی کے سکوں کی ٹکسالیں ہیں، اور رونا تو اس کا ہے کہ اب ان سکوں کو بھی دفتر کے بازار میں کوئی نہیں پوچھتا۔ میں نے شرافت کو جو تعلیم دی ہے، اُس نے شرافت کے دل و دماغ کو مجلا کر دیا ہے، اُس میں اچھے بُرے کے پہچاننے کی تمیز آ گئی ہے زندگی کی کسی منزل میں بھی انشاءاللہ اُس کو ناکامی نہ ہوگی، کتابوں کے مطالعہ سے وہ اپنے علم کو بہت کچھ وسعت دے سکتا ہے۔ میں نے اُس میں مطالعہ کی صلاحیت پیدا کر دی ہے۔ اب رہا روزی کا مسئلہ، سو میری جائداد اس کے لئے کافی ہے، اور اگر خدانخواستہ یہ جائداد بھی اُس کو نہ ملے تو بھی شرافت میں محنت و مشقت کے ساتھ روزی پیدا کرنے کا عزم موجود ہے۔ اُس کو میں نے اگرچہ محبت و شفقت کے ساتھ پالا ہے لیکن اُس کو محنت اور جفاکشی کی تعلیم دی ہے۔ آپ لوگ اُس کی پھول سی رنگت، اور جسم کی نزاکت پر نہ جائیے۔ شرافت فولاد ہے، فولاد! اگر ضرورت پڑے تو وہ مٹی کھود کر روزی پیدا کر سکتا ہے

شیخ لطافت حسین نے، بشارت کو بھی اپنی نگرانی میں تربیت دینے کی کوشش کی لیکن بشارت کی آوارہ مزاجی اس پابندی کو کب گوارا کر سکتی تھی، شیخ جی نے بشارت پر سختی شروع کی، تو اُس کے ماموں آڑے آ گئے، ایک دفعہ تو شیخ جی اور بشارت کے ماموں میں بڑی سخت گفتگو ہو گئی، اُس دن سے شیخ جی نے بھی توجہ کم کر دی، شیخ جی پر بشارت کی آوارگی کا بہت بُرا اثر پڑا۔ بشارت کے اطوار دیکھ کر وہ دِل ہی دل میں کڑھتے تھے، شیخ جی کے اسی عالم میں کئی سال گذر گئے۔

شیخ لطافت حسین کی صحت بہت اچھی تھی، لیکن بشارت کی آوارگی کے غم نے اُن کو بُری طرح متاثر کیا تھا، بیٹے کی آوارگی سے زیادہ باپ کے لئے کوئی اور چیز تکلیف دِہ کیا ہو سکتی ہے؟ اندرونی غم نے اُن کے قوا کو مضمحل کر دیا تھا۔ اسی عالم میں اُن پر فالج کا حملہ ہوا اور وہ فرش ہو گئے شرافت نے شفیق باپ کی تیمارداری پُوری ذمہ داری کے ساتھ کی، وہ رات رات بھر باپ کی پٹی سے بیٹھا رہتا۔ باپ کی بیماری نے شرافت پر خواب و خور حرام کر دیا تھا۔ شیخ جی جب کراہتے تھے تو شرافت کی سُرخ آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگتے تھے، شیخ جی کی زبان بند ہو گئی تھی، وہ بول نہ سکتے تھے۔ مگر اُن کی آنکھیں، بیٹے کی خدمت گزاری کا اعتراف کرتی تھیں۔ بشارت، باپ کی بیماری میں دو چار مرتبہ آیا، اور تھوڑی دیر بیٹھ کر چلا گیا۔ باپ کی بیماری اُس کے آوارہ مشاغل میں کوئی بے ترتیبی پیدا نہ کر سکی، اُس کی تفریح کا پروگرام، اُس وقت میں بھی پُورا ہو رہا تھا جب کہ اُس کا بوڑھا باپ آخری ایڑیاں رگڑ رہا تھا۔ بشارت نے چہرے کو قدرے مغموم بنانے کی کوشش کی تھی، لیکن اس کے دل کی شادمانی، اُس کے چہرے پر بُری طرح چھائی جاتی تھی، مستقبل کا مسرت خیز تصوّر،

اُس کے دِل کو گدگدا تا تھا،

شیخ لطافت حسین کی حالت بیچ میں سنبھل گئی تھی، لیکن یہ موت کا افاقہ تھا، چوتھے دن اُنکی حالت پھر غیر ہوگئی، پانچویں دن اُن پر نزع کے آثار طاری ہوگئے۔ شرافت یہ حالت دیکھ کر باپ سے لپٹ گیا اور چیخ مار کر کہنے لگا:۔

"ابا! مجھے کس پر چھوڑے جاتے ہو"

بوڑھے باپ کی زبان کام نہ دیتی تھی، اُس نے آسمان کی طرف انگلی اُٹھائی یعنی تم کو خدا پر چھوڑے جاتا ہوں۔ شام ہوتے ہوتے شیخ جی ختم ہوگئے۔ بشارت کو باپ کے مرنے کی جب خبر ملی ہے، تو وہ دوستوں کے ساتھ شطرنج کھیلنے میں مشغول تھا اور مزے لے لیکر یہ شعر گنگنا رہا تھا:۔

انگڑائی بھی وہ لینے نہ پائے اٹھا کے ہاتھ
دیکھا تو مجھ کو چھوڑ دیئے مسکرا کے ہاتھ

دوسرے دن صبح کو مرحوم کی میت سپرد خاک کی گئی، شہر کے سینکڑوں آدمی جنازے میں شریک تھے، شرافت کا حال بہت ہی غیر تھا، جب باپ کی قبر پر مٹی ڈالی گئی ہے تو وہ چیخ مار کر زمین پر گر پڑا۔ بشارت نے بھی دُنیا کے دکھانے کے لئے آنکھوں کو پُرنم بنا لیا تھا۔ ایسی بناوٹ سے دل کی بات کہیں چھپا کرتی ہے لوگ دونوں بھائیوں کے تاثرات کو محسوس کر رہے تھے۔

شیخ صاحب کا جب انتقال ہوا ہے تو شرافت، تقریباً بائیس سال کا، اور بشارت اٹھارہ انیس سال کا تھا شیخ صاحب مرحوم کی جائداد کے شرافت اور بشارت ہی وارث تھے،

قانون کے مطابق دونوں بیٹیوں کا نام جائداد متروکہ میں پڑ گیا۔ مرحوم نے نقد روپیہ پانچ ہزار سے کچھ اوپر چھوڑا تھا۔ بات یہ تھی کہ آخری عمر میں مرحوم لوگوں کی جی کھول کے امداد کرنے لگے تھے، مرنے سے دو سال قبل انہوں نے حج بھی کیا تھا، اور اس میں خوب روپیہ خرچ کیا۔ بشارت، عمر میں چھوٹا تھا، مگر وہ ہر بات میں بڑے بھائی سے بڑا بن کر رہنا چاہتا تھا، شرافت نے چھوٹے بھائی کو مشورہ دیا۔ کہ ابا جان نے جو روپیہ چھوڑا ہے۔ اُسکے ایک چوتھائی سے محلہ کی ادھوری مسجد کی تکمیل کرا دیں۔ اور باقی روپیہ بنک میں جمع کر دیں، بشارت نے اس نیک مشورہ کے جواب میں کہا:۔

"واہ! حلوائی کی دوکان دادا جی کی فاتحہ! آپ یہ"

"کس کے روپیہ کی تقسیم کر رہے ہیں؟ آپ کو معلوم ہے کہ"

"یہ روپیہ میری مرحومہ ماں کے مہر کا ہے۔ ابا جان"

"میرے ماموں سے کہہ گئے ہیں، آپ کو یقین نہ آتا ہو"

"تو اُن سے دریافت کر لیجئے، وہ میری خاطر اس بڑھاپے میں"

"جھوٹ بول کر اپنی عاقبت خراب تھوڑی کرینگے"

شرافت اور بشارت میں بات چیت ہو رہی تھی، کہ بشارت کے ماموں بھی آ گئے،

"ماموں جان! ابا مرحوم نے آپ سے کہا نہیں تھا"

"کہ میرا نقد روپیہ تمہاری بہن کے مہر کا ہے۔" بشارت نے آنکھ مارتے ہوئے کہا۔

"ہاں! انھوں نے ایک دفعہ نہیں، خدا جھوٹ نہ بلوائے"

"تو کوئی دس بارہ مرتبہ اس بات کا ذکر کیا تھا"

"اور وہ تو میری آپا، بھائی جان کے مرنے سے پہلے"

"بی چل بسیں، تہہیں بھائی جان (شیخ لطافت حسین) کا"

"تو کچھ اور ہی ارادہ تھا ——— بشارت کے ماموں نے جواب دیا۔

"ماموں جی! آخر میری ماں کا بھی تو مہر تھا،"

"جب ماؤں کے مہر بیٹوں پر تقسیم ہونے کا مسئلہ زیر بحث"

"آچکا ہے۔ تو مجھے بھی اپنی ماں کا مہر ملنا چاہیئے۔" شرافت، بھولے پن کے ساتھ بولا۔

"تم کوئی گواہ لاؤ، کہ تمہاری ماں کے مہر کے لئے بھائی جان نے"

"تمہارے لئے کوئی وصیت کی تھی ———" بشارت کے ماموں نے ترش رو ہو کر کہا۔

"مہر کے لئے تو کسی وصیت کی ضرورت نہیں ہے،" شرافت نے جواب دیا۔

"شرافت میاں! قانونی منطقوں سے آپ مجھے دبا نہیں سکتے"

"یہ روپیہ تو میرے بھانجے بشارت ہی کو ملیگا، چاہے"

"زمین، آسمان ایک ہی کیوں نہ ہو جائیں۔"

"تمہارے لئے بھائی جان نے کیا کچھ نہیں کیا، لکھایا پڑھایا،"
"ہر طرح کی نازبرداری کی، بشارت تو میرے ہی یہاں پل کر"
"بڑا ہوا ہے، سچ پوچھو تو باپ کے ترکہ میں اس کا دوہرا"
حصہ ہے۔ "بشارت کا ماموں تیور پر بل

ڈال کر بولا۔
"ماموں جی! بشارت کو ابا جان نے کتنی مرتبہ بلایا تھا، کئی"
"مرتبہ آپ سے اور ابا جان سے سخت گفتگو بھی ہوئی تھی، مگر آپ نے"
"بشارت کو نہ بھیجا۔ اس میں ابا جان کا کیا قصور ہے،"
"کوئی شک نہیں کہ آپ نے بشارت میاں کو بڑی محبت کے ساتھ"
"رکھا، لیکن بازار کی دوکانوں کی تمام آمدنی جو کسی طرح سو روپیہ"
"مہینہ سے کم نہ تھی، بشارت ہی کے اخراجات کے لئے، ابا جان نے آپ"
"پر چھوڑ رکھی تھی۔"
"میں بات کو بڑھانا نہیں چاہتا۔ بشارت میاں اور میں ایک ہیں، دو"
"تھوڑی ہیں، بشارت میاں شوق سے تمام روپیہ لے سکتے ہیں، بھائی"
کے مال کا اس سے بہتر اور کیا مصرف ہو سکتا ہے۔ "شرافت نے

کشادہ پیشانی کے ساتھ جواب دیا۔

شرافت نہایت ہی صاف طینت اور پاک باطن تھا۔ وہ فریب و مکر کے اُس جال سے بالکل بے خبر تھا۔ جو اسکے چاروں طرف لگایا جا رہا تھا۔ بشارت اور اُس کے ماموں اپنی کامیابی پر نازاں تھے اور شرافت کی انسانی شرافت اور وسعتِ اخلاق کو اُس کی بزدلی اور کمزوری پر محمول کرتے تھے۔ جس طرح شیر کے منہ سے انسان کا لہو لگ جاتا ہے۔ تو وہ انسان کی تلاش میں رہتا ہے، اور انسان کو کسی طرح جیتا نہیں چھوڑتا، بالکل اسی طرح کمینہ فطرت اور عیار انسان کو جب اپنی سازش میں کامیابی ہو جاتی ہے، تو فریب کی کامیابی پر اُس کا یقین راسخ ہو جاتا ہے۔ اور وہ رات دن اسی فکر میں سرگرداں رہتا ہے کہ کوئی بھولا شکار نظر آئے اور وہ اُسے پھانس کر کامیاب ہو جائے، بشارت اور اُس کے ماموں نے شرافت کو ستانا شروع کیا۔ بشارت نے تمام جائداد پر پوری طرح قبضہ کر لیا تھا، اُس نے کرایہ داروں کو نہ جانے کیا پٹی پڑھا دی تھی، کہ وہ شرافت کو کرایہ دینا بھی گوارا نہ کرتے تھے، ملازمین کو بھی بشارت نے ملا لیا تھا۔ شرافت اپنے گھر میں پردیسی اور مہمان کی طرح رہتا تھا، پیسہ پیسہ کے لئے وہ تنگ تھا۔

شرافت، آدھی جائداد کا مالک تھا وہ آسانی سے قانونی چارہ جوئی کر کے جائداد کا بٹوارہ کرا سکتا تھا، مگر وہ اس کو خاندان کی رسوائی سمجھتا تھا، شرافت کے ایک دوست نے جائداد کے بٹوارہ کے لئے اُس کو مشورہ بھی دیا، مگر شرافت نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ:۔

"لوگ کہیں گے کہ بھائیوں میں نباہ نہ ہو سکا۔"

"عدالت میں جب معاملہ جائیگا، تو دنیا یہی کہے گی"

"کہ شیخ لطافت حسین کے بیٹے مقدمہ بازی کر رہے ہیں"

"میرے نیک دل باپ کی تو روح لرز جائیگی"۔

بشارت اور اُس کا ماموں دونوں، شرافت کی انسانیت سے ناجائز فائدہ اٹھا رہے تھے،

جبر و ظلم کی قوتیں اخلاق و رواداری سے بہت کم مغلوب ہوتی ہیں۔ وہ جو کسی نے کہا ہے کہ لوہے کو لوہا کاٹتا ہے، لہٰذا جبر و ظلم کو نیچا دکھانے کے لئے بھی، ایک طاقت و رپنجہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ جابر و ظالم کے آپ ہاتھ جوڑیئے، منتیں کیجئے، اُس کے پاؤں پر سر رکھئے، وہ اور بڑھتا چلا جائے گا۔ وہ آپ کے سر کو پاؤں سے ٹھکرا دیگا، لیکن جب آپ اُس کے مقابلہ میں تن کر کھڑے ہو جائیں گے اور وہ آپ کے تیور بدلے ہوئے دیکھے گا، تو وہ آپ کی طرف جھکنے کی کوشش کرے گا۔

شیخ لطافت حسین کا مکان، لفنگوں اور غنڈوں کا تکیہ بنا ہوا تھا۔ دن رات شہر کے اوباش نوجوان دھما چوکڑی مچاتے، اور مُفت کی روٹیاں کھا کھا کر چارپائیاں توڑتے۔ ایک دن شرافت مکان میں بیٹھا ہوا کچھ لکھ رہا تھا، دیوانخانہ میں بشارت کے دوست بیٹھے ہوئے اُودھم مچا رہے تھے، شرافت کا کسی کام سے باہر جانا ہوا۔ تو اُس نے دیوانخانہ پر ایک نگاہ ڈالی، اُس نے دیکھا، کہ اُن قالینوں پر جو اُس کے باپ مکّہ معظمہ سے خرید کر لائے تھے، اور جن پر وہ نماز پڑھا کرتے تھے بشارت کے دوست بیٹھے ہوئے شطرنج اور چوسر کھیل رہے ہیں۔ شرافت سے نہ رہا گیا، وہ دیوانخانہ میں در آتا ہوا چلا گیا۔

" ارے بھئی! شرافت، خیر تو ہے، ادھر کیسے "

" آنا ہو گیا " ـــــــــ بشارت کے ایک دوست نے تکیہ پہ کوڑیاں پھینکتے ہوئے کہا۔

" بشارت میاں! ابا جان جن قالینوں کو مکہ معظمہ سے "

" خرید کر لائے تھے، اور جن کو انہوں نے مصلا بنایا "

" تھا اُن کی تم یہ قدر کر رہے ہو ـــــــــ " شرافت نے بشارت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

" تو آپ کو کیا؟ آپ دخل در معقولات "

دینے والے کون؟ بڑے آئے کہیں کے مولوی "

" بن کر۔! آپ ہی جنت میں چلے جائیے، اللہ میاں "

" ہمیں دوزخ میں ڈال دے گا۔ " بشارت نے جواب دیا۔

" شرافت کچھ کہنا ہی چاہتا تھا، کہ بشارت کے دوستوں نے تالیاں بجا بجا کر، اور قہقہے لگا لگا کر کہنا شروع کیا:۔

" ارے! اس شرافت کی بالکل وہابی قسم کے "

" جلاہوں کی سی باتیں ہیں۔ بھلا شطرنج اور "

" چوسر کھیلنا کوئی گناہ ہے۔ اگر یہ تمام کھیل گناہ ہیں "

"تو پھر اکبر اور جہانگیر، جیسے مسلمان بادشاہ کیوں"

"کھیلتے تھے۔"

"ارے شبو! یہ شرافت، چھوٹی مسجد کے ملا کا"

"بہت دوست ہے۔ اُسی کی خوبو اس میں آگئی ہے"

"بشارت میاں! یہ زاہد خشک کیا جانیں کہ"

۔ مستحقِ کرامت گناہگارانند"۔

"یہ لوگ تو جنت کا اپنے کو ٹھیکیدار سمجھے ہوئے"

"ہیں" مکن پورہ کے شیخ مدار کی جوتیوں کی قسم کھا کر کہتا"

"ہوں، ہمارے ابا جان کے پیرِ مرشد تو فرماتے تھے کہ گناہ"

"کے بغیر، دل میں سوز ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

"(دوسرا دوست بات کاٹ کر) اجی! وہ تو عجیب کراماتی"

"بزرگ تھے، اُن کی بدولت ہم نے شہر کی چوٹی کی طوائفوں"

"کا گانا سنا تھا، کئی طوائفوں کو تو انھوں نے اپنی بیٹی"

"بنایا تھا۔ یہ شرافت، کیا اُن سے بھی بڑھ کر مذہب کی باتیں"

"جانتا ہے۔"

"میاں بشارت! آپ کا منہ ہے، جو میں خاموش ہوں، نہیں تو ان"

"شرافت صاحب کو اس دخل در معقولات کا مزہ چکھا دیتا۔"

"اجی شریف خاں! شرافت میاں کو داغ کی وہ غزل سنا دو:۔"

"کم بخت قیامت ابھی آئی نہیں جاتی"

"لانا، نو میرا ستار، شرافت کو وہ چیز سنا کر مست کردوں:۔"

"میرے جوبن پہ آئی بہار

" بہار مورے پیارے "

بشارت کے اوباش دوستوں نے شرافت کو اس بری طرح آڑے ہاتھوں لیا، کہ اُسے اپنا سا منہ لیکر اُلٹے پاؤں واپس آنا پڑا۔ جب شرافت، دیوانخانہ سے واپس ہوا، تو بشارت کے دوستوں نے خوب تالیاں بجائیں، شرافت پر چھوٹے بھائی کے اس توہین آمیز سلوک کا بہت برا اثر ہوا۔ بشارت اور اُس کے ماموں نے جائداد اور گھر بار پر قبضہ کرکے، شرافت کو معطل سا کر دیا تھا، شرافت نے ان تمام چیزوں کو برداشت کیا۔ مگر اب نوبت یہاں تک آپہنچی تھی۔ کہ شیخ مرحوم کے خاص مکان میں دن رات شہر کے لفنگے گالیاں بکتے۔ چرس اور چنڈو پیتے اور بازاری قسم کی چیزیں گاتے۔ شرافت نے بھائی کو ٹوکا تو اُس نے اتنا سخت جواب دیا۔ جسکی شرافت کو توقع بھی نہ تھی۔ شرافت نے بشارت کے ماموں سے جاکر کہا تو وہ چھٹا ہوا بدمعاش تیوری پر بل ڈال کر بولا۔

"بشارت کو کیا تم نے کبھی جلاہے کا لونڈا سمجھ رکھا ہے" جوانی"

"ہیں شریف لڑکے ہنس کھیل کر زندگی نہ گزاریں گے"

"تو پھر کیا بڑھاپے میں رنگ رلیاں منائیں گے، یہی"

"دس پانچ سال، تو جوانوں کے ہنسنے ہنسلنے کے ہوتے ہیں"

"میاں شرافت! تم اس معاملہ میں بلاوجہ ٹانگ اڑانے کی"

"کوشش نہ کرو، بشارت کے دوست بڑے جھگڑالو اور تیز مزاج واقع"

"ہوئے ہیں، وہ سن پائیں گے، تو تمہارا شہر میں رہنا دوبھر ہو جائیگا"

"ابھی کل کی بات ہے کہ ایک ساہوکار کے یہاں پورب سے برات آئی تھی، اس"

"برات میں دو تین مشہور طائفے بھی آئے تھے، بشارت کے دو دوست"

"گانا سننے کے لئے گئے، بشارت کے دوستوں نے طوائفوں کو چھیڑا براتیوں کو یہ بات"

"بری معلوم ہوئی، اور انہوں نے بشارت کے دوستوں کو بھری محفل سے اٹھا دیا۔"

"بشارت کے دوستوں نے محفل سے آنے کے بعد، اپنے دوسرے دوستوں کو اکٹھا"

"کرکے اس واقعہ کی اطلاع دی۔ بشارت کے دوستوں نے جو برات والوں پر"

"پتھر برسائے ہیں تو ساری محفل درہم برہم ہو گئی۔"

بھیا! تم جس حالت میں ہو، اسی حالت میں رہو، بشارت کے معاملات میں"

"دخل نہ دو، وہ اپنا نفع نقصان تم سے بہتر جانتا ہے"

شرافت نے دیکھا کہ بشارت کا ماموں، بشارت کی پوری حمایت کر رہا ہے، اور اس سے

کسی اصلاح کی امید نہیں۔ شرافت، اپنے گھر کی بربادی کا منظر دیکھنے کے لیے کسی طرح تیار نہ تھا۔ اُس نے اب روک ٹوک شروع کی، اس پر بشارت اُس کے خون کا پیاسا ہو گیا، بشارت اپنے عیش و راحت کی راہ میں، شرافتؔ کو سنگِ گراں سمجھنے لگا۔

شہر اور اُس کے قرب وجوار میں چوری اور ڈاکہ کی واردات کا بہت زور تھا، روزانہ دو چار مکانوں کے تالے ٹوٹ جاتے، اور ایک آدھ مکان کی چھت کٹ جاتی۔ بدمعاشوں کی جرأت اس قدر بڑھ گئی۔ کہ ڈاکخانہ کے ہرکارہ کو دن دہاڑے زخمی کر کے، ڈاک کا تھیلا چھین لیا گیا۔ پولس نہایت سرگرمی کے ساتھ ٹوہ لگا رہی تھی، مگر بدمعاشوں کا سراغ نہ لگتا تھا، ایک دعوت میں بشارتؔ اور بشارتؔ کے ماموں کی شہر کوتوال سے ملاقات ہوئی۔ باتوں باتوں میں بشارتؔ اور اُس کے ماموں نے کوتوال کو باور کرا دیا۔ کہ شرافتؔ سیاسی اور انقلابی ذہنیت کا نوجوان ہے، چند انقلابی نوجوانوں سے اس کا میل ملاپ ہے، کیا عجب ہے۔ کہ وہی لوگ شہر میں لوٹ کھسوٹ کر رہے ہوں کوتوال نے ان دونوں کا شکریہ ادا کیا، اور شرافت پر سخت نگرانی قائم کر دی۔ شرافت کے خطوط ڈاک خانہ میں کھول کر پڑھے جاتے اور اُس کی ایک ایک نقل و حرکت کی نگرانی کی جاتی۔

شرافت کے متعلق پولس کی ڈائری کے اوراق کتنے دلچسپ تھے:۔

"ش" صبح چار بجے نیند سے بیدار ہوا۔ پلنگ سے اٹھ کر وہ سیدھا بیت الخلا گیا۔"

" وہاں سے آدھ گھنٹہ میں فارغ ہو کر آیا۔ اُس کے بعد نماز کے لئے وضو کیا۔ نماز مسجد میں"

" جا کر پڑھی، نماز کے بعد قرآن کی تلاوت کی، "ش" قرآن بڑے جوش کے ساتھ "

"پڑھتا ہے، جہاد کی آیات پر اُس کے چہرے کا رنگ بدل جاتا ہے، قرآن کی تلاوت کے"
"بعد اُس نے دعا مانگی:-
"ربِ العزت! مسلمانوں کی پریشانیوں کو دُور فرما، اُن کو"
"ذلّت کے گڑھے سے نکال کر، عزّت و سربلندی کی سطح پر"
"پہونچا۔"
"بارِ الہٰا! اسلام کے دشمنوں کو ذلّت دے مسلمانوں کا"
"بول بالا کر۔"
(دعا کے یہ الفاظ کے نیچے سُرخ لکیر کھچی ہوئی تھی)"
"تلاوتِ قرآن کے بعد اُس نے ناشتہ کیا۔ ناشتہ میں دو پوریاں"
"اور آدھ پاؤ جلیبیاں تھیں یہ جلیبیاں، اُس نے قریب کی"
"دوکان سے مول منگائی تھیں۔ ناشتہ کے بعد "ش" باہر نکلا۔"
"اور ایک گھنٹے تک شہر کی گلیوں میں پھرتا رہا۔ بڑے بازار میں"
"فیروز، سہراب اینڈ سنز کے یہاں سے اُس نے کپڑا خریدا"
"پاجاموں کے لئے دس گز گورا، خاصہ، کرتوں کے لئے بارہ گز ڈھاکا"
"پاٹن کی ململ، اور شیروانی کے لئے پونے پانچ گز چینی سلک۔ یہ کل"
"کپڑا انیس روپیہ آٹھ آنہ تین آنہ کا تھا۔ "ش" نے دس دس"

" روپیہ کے دو نوٹ اپنی واسکٹ کی سیدھی جیب سے نکال کر دئے، ان"
" نوٹوں کے نمبر حسب ذیل تھے۔

D.F. 170983

L.U. 336081

" کپڑا خریدنے کے بعد، اُس نے جمال رسٹورنٹ میں جا کر چائے پی۔ سوہی ایک آنہ "
" والی پیالی جو عام طور پر لوگ پیا کرتے ہیں۔ رسٹورنٹ میں کئی نوجوانوں سے "
" اُس کی گفتگو ہوئی، گفتگو کا زیادہ حصہ حبش اور اٹلی کی جنگ سے متعلق تھا۔ "ش" نے "
" حبش کے ساتھ ہمدردی ظاہر کرتے ہوئے کہا، کہ اگر اٹلی نے حبش پر فتح حاصل کر لی تو"
" برطانیہ کے اقتدار کو صدمہ پہنچیگا۔ آخری فقرے پر "وہ" قدرے مسکرایا۔"
" یعنی کہ "ش" برطانیہ کے زوال سے خوش تھا۔ "
" اسی ہوٹل میں اُس نے روزنامہ "نوجوان" پڑھا۔ اُس نے سب سے پہلے اسلامی"
" خبروں کے کالموں پر نظر ڈالی، ایک خبر کو جس کا عنوان:۔

" اسلامی حکومتوں کا اتحاد"

" تھا، اُس نے کئی بار غور سے پڑھا۔ خبر پڑھنے کے بعد اُس نے آہستہ سے کہا، الحمدللہ"
" اُس کا چہرہ فرطِ مسرت سے تمتما رہا تھا۔ رسٹورنٹ سے وہ سیدھا گھر آیا"
" راستہ میں سفید رنگ کی بکری سے اُس کی ٹکر ہوئی، جس کے اثر سے "

" اُس کے کپڑے کی پوٹلی زمین پر گر پڑی۔ سڑک پر گوبر پڑا ہوا تھا"

" اُس کی پوٹلی کو گوبر لگ گیا۔" وہ" پوٹلی کو اُٹھاتے ہوئے بولا:۔

" یہ ہے ہماری میونسپلٹی کا حسن انتظام "

" گھر پہنچکر، اُس نے کھانا کھایا۔ کھانے میں پتلے شوربہ کا قورمہ"

ارھر کی بگھری ہوئی دال، اور لکڑ ونڈے کا آچار تھا۔ "ش" جب"

" کھانا کھا رہا تھا، تو ایک کالے رنگ کی بلّی، جو اُس سے مانوس معلوم ہوتی ہے"

" اُس کے پاس آکر بیٹھ گئی تھی، اُس نے چند بوٹیاں اور "

" ہڈیاں بلّی کے سامنے رکھدیں۔ بلّی نے بڑے سلیقہ کے ساتھ بوٹیوں کو کھایا"

" ش" بلّی کو محبت بھری نظروں سے دیکھتا رہا۔ "ش" نے چار چپاتیاں "

" کھائیں۔ کھانا کھانے کے بعد عربی زبان میں ایک مختصر سی دعا پڑھی"

" کھانا کھا کر وہ سو گیا، وہ ایک گھنٹہ تک سوتا رہا۔ پلنگ سے اُٹھ کر اُس نے"

" ہاتھ مُنہ دھویا، اور اپنے ایک دوست کو جو آجکل بشیر پور میں رہتے ہیں "

" بدیں مضمون خط لکھا:۔ "

" آپ کی تشریف آوری کا عرصہ سے انتظار ہے"

" آخر آپ کب تک آئیں گے؟ بیچیاں اور"

" خوبانیاں ضرور لیتے آیئے، اور ہاں! ابر البرز بند"

"جو آپ کے یہاں رہ گیا ہے، اُسے خدا کے لئے نہ بھول جانا"

"بستر بند کی مجھے آئے دِن ضرورت پڑتی رہتی ہے ——"

"اُس نے خط کے کاغذ کو اپنے ہاتھ سے لفافہ میں بند کیا۔ اور ڈاک کے"

"صندوق میں خود خط ڈالنے گیا۔ خط ڈالتے وقت اُس نے اِدھر اُدھر دیکھا"

"اُس پر کچھ گھبراہٹ سی طاری تھی۔ خط ڈال کر وہ گھر واپس ہوا۔ اور اُس نے"

"مسجد میں پہنچکر ظہر کی نماز جماعت کے ساتھ پڑھی، نماز پڑھکر وہ گھر آیا، اور"

"اپنی بڑی الماری میں سے چند کتابوں کو نکال کر الٹا پلٹا۔ اس نے آخر میں"

"کتاب" الفاروق" کا انتخاب کیا۔ یہ کتاب شبلی نعمانی کی لکھی ہوئی ہے"

"جو مسلمانوں کے مشہور عالم تھے، اور جن کے خیال سیاسی قسم کے تھے۔ اس کتاب کے"

"سو ورق کے قریب اُس نے شام تک پڑھے، اس عرصہ میں عصر کی نماز بھی"

"ادا کی اور پانچ بجے کے بعد سیب کے مربہ کی ایک قاش، جو کوئی ایک"

"تولہ وزن میں ہوگی، ایک عدد نقرئی ورق کے ساتھ کھائی، اُس نے"

"اپنا ہاتھ، اپنے کرتہ کے دامن سے پونچھا۔ "

"مغرب کی نماز کے بعد چند دوست اُس کے پاس آئے، جن میں دو تین"

"کالج کے لڑکے تھے، غالب کی شاعری پر بڑی دیر تک تبصرہ ہوتا رہا۔ "

"ش کے ایک دوست نے جو محکمہ زراعت کے اسسٹنٹ ڈائرکٹر کا لڑکا ہے"

" دورانِ گفتگو میں کہا کہ :۔

" غالب نے جو انگریزوں کی شان میں قصیدے کہے "

" ہیں ، وہ مجھے پسند نہیں ۔ "

" ش " مسکرایا ، اس انداز کے ساتھ گویا وہ اپنے دوست کی "

" رائے سے متفق ہے ۔ "

" عشا کی نماز سے قبل اُس نے کھانا کھایا ۔ کھانے میں ٹرٹی پڑا ہوا گوشت ، بینگن کا "

" بھرتہ اور پیاز کی کھیر تھی ۔ کھانے کے بعد اُس نے عشاء کی نماز ادا کی ، نماز کے بعد "

" وہ بہت دیر تک وظیفہ پڑھتا رہا ۔ اور پھر آہستہ آہستہ دعا مانگی ، دعا میں "

" اسلام " اور " کفار " کا لفظ بار بار آتا تھا ۔ نماز ادا کرنے کے بعد ۔ ! "

" وہ اپنے گھر جا کر سو گیا ۔ اس وقت وہ سو رہا ہے ، خوب گہری نیند ۔ ! "

" سرکار کے اقبال سے اہم انکشافات کی امید ہے ۔ " ش " کے دوست قمر احمد کے "

" حالات معلوم کرنے کے لئے کسی ہوشیار آدمی کو لشیم پور بھیجنے کی ضرورت محسوس "

" ہو رہی ہے ——— "

شرافت پولس کی نگرانی سے بالکل بے خبر تھا ، اُس نے دو تین اجنبی آدمیوں کو اپنے مکان کے سامنے ضرور دیکھا ، لیکن اُس کو بدگمان ہونے کی کوئی وجہ نہ تھی ، اُس کے دل میں کوئی چور نہ تھا ، اس لئے وہ کسی اپنے یا بیگانے سے کیوں ڈرتا ؟

شرافت کے دوست قمر احمد نے جواب میں لکھا کہ میں دوشنبہ کی صبح کو پہنچ رہا ہوں۔ قمر احمد کا خط، شرافت کو سنیچر کے دن وصول ہوا، اور پولس کو جمعہ کے دن ہی خبر ہو گئی، پولس کے آدمیوں نے شبیر پور پہنچ کر قمر احمد کے تمام حالات معلوم کر لئے تھے۔ کریم آباد کی پولس قمر احمد کی آمد کی بے چینی سے منتظر تھی، اُس کا خیال نہیں بلکہ یقین تھا۔ کہ قمر احمد کے آنے کے بعد بہت کچھ تا پتا مل جائیگا۔ پولس کے آدمی گاڑی آنے سے بہت پہلے اسٹیشن پر پہنچ چکے تھے، اور کامیابی اور فتحمندی کے غرور میں اکڑ اکڑ کر ٹہل رہے تھے، شرافت گاڑی کے آنے سے تھوڑی دیر پہلے اسٹیشن پہنچا، گاڑی اُس دن دس منٹ لیٹ ہو گئی تھی۔ شرافت وقت گذارنے کے لئے ریسٹورنٹ میں چلا گیا، اُس نے ملازم سے چائے منگائی۔ ملازم چائے لینے کے لئے گیا، وہ انگریزی اخبار پڑھنے لگا۔ پولس کے دو آدمی اس موقعہ کو غنیمت سمجھکر، چند منٹ کے فصل سے اُس کے قریب کی میز پر آکر بیٹھ گئے، اور شرافت کا عندیہ معلوم کرنے کے لئے انہوں نے گفتگو شروع کی:۔

"بڑے ہنگامے ہو رہے ہیں شہر میں ا"

"کل تو دن دہاڑے چنگی کے ہرکارے کو"

"لوٹ لیا"
" پولس مین نے (جو مسافروں کے بھیس میں تھا) کہا۔

"جی ہاں!۔ مگر اس میں تو حکومت"

"کی ساری غلطی ہے، ہزاروں نوجوان بیروزگار"

"پھر رہے ہیں، آخر وہ کیا کریں؟ پیٹ کا"

"مسئلہ بڑا ٹیڑھا ہے جناب! ایک وقت"

"کے فاقہ میں زمین، آسمان ہلتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں" دوسرا پولیس مین بولا۔

یہ لوگ زور زور سے باتیں کرتے رہے، اور کبھی کبھی شرافت کی طرف بھی مخاطب ہوتے تھے، مگر شرافت نے اپنی زبان سے ایک بات بھی نہ نکالی۔ تھوڑی دیر بعد گھنٹی ہوئی اور آن کی آن میں گاڑی آگئی۔ شرافت نے اپنے دوست قمر احمد کو ڈھونڈنا شروع کیا، پلیٹ فارم پر بہت بھیڑ تھی، کئی آدمیوں سے اُس کی ٹکر ہوگئی، شرافت کے کان میں آواز آئی:۔

"میں یہاں ہوں، بھائی شرافت!"

"انٹر کلاس میں" ——————

شرافت نے سامنے کی طرف دیکھا تو قمر احمد، پائدان پر پیر رکھ کر اتر رہا تھا، شرافت بڑھکر، قمر احمد سے بغلگیر ہوا۔

"کہئے راستہ میں تکلیف تو نہیں ہوئی۔" شرافت نے دریافت کیا۔

"کوئی خاص تکلیف تو نہیں ہوئی، البتہ بھیڑ"

"زیادہ تھی، پچھلی رات کو جنکشن سے کچھ اور"

"لوگ سوار ہوگئے، اُس کے بعد سے قدرے"

"بے آرامی رہی" قمر احمد نے قلی کو ہاتھ سے بُلاتے ہوئے

جواب دیا۔

"اچھا! پیچیاں اور خوبانیاں لائے ہو، "

"اور ہاں! میرا بستر بند ۔۔!" شرافت نے پوچھا۔

"بھئی شرافت! بڑے مضطرب واقع ہوئے تم تو ۔۔!"

"سب چیزیں لایا ہوں، اطمینان رکھو،" قمر احمد نے مسکراتے ہوئے کہا۔

پولس کے لوگ شرافت اور قمر کی ایک ایک حرکت کا جائزہ لے رہے تھے۔ قلی، قمر احمد کا سامان لیکر روانہ ہوا۔ اسٹیشن کے پھاٹک پر پہنچکر شرافت نے وکٹوریہ گاڑی کرایہ کی، پولس کے لوگ آگے بڑھکر چنگی کی چوکی پہ پہنچ گئے۔ چنگی کی چوکی پر قمر احمد کا سامان کھول کر دیکھا گیا۔ پولس اور چنگی والوں نے اُس کی ایک ایک چیز کو تتر بتر کر دیا۔ سامان کی اس تلاشی پر شرافت اور قمر دونوں حیران تھے، شرافت کے سوٹ کیس کو چنگی والوں نے دینے سے انکار کر دیا۔ اور کہا کہ ہم آپ کو تمام سامان کی رسید دیئے دیتے ہیں۔ ہمارے افسر کے معائنہ کے بعد آپ کا سامان آپکو پہنچا دیا جائیگا، قمر احمد اور شرافت دونوں نے بہت کچھ کہا سنا۔ مگر چنگی اور پولس والوں نے اُن کی ایک نہ سنی، قمر احمد کو اپنا سوٹ کیس مجبوراً چنگی کی چوکی میں چھوڑ دینا پڑا۔

پُولس، قمر احمد کا سوٹ کیس لیکر کوتوالی میں پہنچی، اور وہاں کوتوال، ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ اور خفیہ پولس کے چند نہایت ہی ہوشیار اور تجربہ کار افسروں کی موجودگی میں، قمر کا سوٹ کیس کھولا گیا، قمر کے

سوٹ کیس سے چند جوڑی کپڑے، چند ضرورت کی چیزیں اور کچھ خطوط اور کاغذ برآمد ہوئے۔ پولس والوں نے ایک ایک چیز کو غور و تجسس کی نظروں سے دیکھا۔ چند خطوط اور کاغذ پولس نے اپنے قبضہ میں کر کے، باقی سامان قمر احمد کو واپس کر دیا۔ پولس نے ان کاغذوں کو لشبیر پور کی پولس کے پاس تفتیش کے لئے بھیجدیا۔

بشیر پور کے پولس اسٹیشن نے چند دن میں اپنی تفتیش کا خلاصہ لکھ کر روانہ کیا:۔

"پٹیل کے جس گول پتھر پر "شاہین" لکھا ہوا ہے، وہ قمر احمد"

"کے کتے کا نام ہے۔ اس کتے کو آجکل خارش ہو گئی ہے،"

"حیوانات کے دواخانہ میں ہے"

"بدور باز غر" کی بہت تلاش کی گئی، لیکن اس نام کا کوئی آدمی"

"ہم کو نہیں ملا۔ دفتر ہذا کے میر منشی جو عربی کے فاضل ہیں کہتے"

"ہیں کہ "بدور باز غر" شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی کی کسی کتاب کا نام"

"ہے۔ میر منشی کے بیان کو غلط سمجھنے کی بظاہر کوئی وجہ نہیں پائی جاتی"

"گوکل چند، مسٹر ایس۔ ناتھ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ کا منجھلا"

"لڑکا ہے۔ جو آجکل پولس ٹریننگ اسکول میں زیر تعلیم ہے"

"م۔ ب" مسرت بیگم کے سر حروف ہیں، مسرت بیگم، قمر احمد کی"

"چھوٹی بہن کا نام ہے، جس کی عمر تیرہ چودہ سال کی ہے،"

"جو حلیہ آپ نے لکھ بھیجا ہے۔ اس حلیہ کا آدمی تو یہاں کوئی"

" نہیں ملتا، البتہ اُس حلیے سے ملتا جلتا ایک آدمی طوائفوں کے محلہ میں

" رہتا ہے۔ اس کا نام مردان خاں ہے، یہ شخص رنڈیوں کی "

" مذمت میں چھوٹی چھوٹی نظمیں چھپوا کر بیچتا ہے، آجکل اس کی یہ نظم "

" یہاں مقبول ہو رہی ہے :- "

" بے دانہ مُرغ دل کو پھنساتی ہیں رنڈیاں "

" قمر احمد کے والد، آجکل طائف میں ہیں، اتنی بات آپ نے بالکل "

" ٹھیک لکھ کر بھیجی ہے، لیکن طائف ترکستان میں نہیں، حجاز میں واقع ہے "

" مکہ شریف سے بہت قریب ! "

قمر احمد، دو ہفتے کے قریب، شرافت کے پاس رہکر چلا آیا۔ پولس نے بہت کچھ کھوج لگایا۔ مگر شرافت بیگناہ تھا، پولس اسکے خلاف ذرا سا بھی مواد فراہم کرنے میں کامیاب نہ ہو سکی۔ شرافت کو بھی معلوم ہوگیا کہ اُس کے عزیز بھائی اور اُس کے ماموں کا یہ سب کچھ کیا دھرا ہے۔ شرافت کے لئے اب سخت مشکل کا سامنا تھا، اُس کی غیرت بھائی سے جنگ کرنے کے لئے کسی طرح تیار نہ تھی، شرافت کے دل میں ابھی یہ گھاؤ ہرا ہی تھا، کہ اُس پر راستہ چلنے میں کسی نے گولی چلادی، گولی سنسناتی ہوئی اُس کے کان کے قریب سے گذر گئی، اور وہ بال بال بچ گیا۔ یہ گولی جس طرف سے آئی تھی، وہاں بشاشت کے ایک بہت ہی گاڑھے دوست کا مکان تھا، شرافت نے مکان کی چھت پر ایک آدمی کو جھک جھک کر بھاگتے ہوئے بھی دیکھا شرافت کو سو فیصدی یقین تھا، کہ یہ قاتلانہ حملہ بشاشت ہی کے ایما سے ہوا ہے۔

شرافت اگر ان واقعات کی پولیس میں اطلاع کر دیتا۔ تو بشارت کو اُس کے مجرمانہ کرتوتوں کی سزا مل سکتی تھی۔ مگر اس کے لئے وہ کسی طرح تیار نہ تھا۔ اُس نے بہت کچھ سوچ ، بچار کے بعد مکان چھوڑ دینے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ چھوٹے بھائی سے جنگ کرنا نہیں چاہتا تھا۔

اُس کو اپنے باپ کے نام کی للاج تھی، اور یہی للاج اُسے عفو و درگذر کے لئے مجبور کر رہی تھی۔ شرافت کے پاس دو سو روپیہ نقد اور دو انگوٹھیاں تھیں، جن کو لیکر وہ مکان سے روانہ ہو گیا، مکان سے رخصت ہوتے وقت، وہ بھائی کے نام ایک خط چھوڑ گیا۔

"عزیزی بشارت!

"میں جا رہا ہوں، ہمیشہ کے لئے، اب واپس نہیں ہوں گا۔ میں تمہاری"

"خوشی ہی کے لئے دلیس نکالا قبول کر رہا ہوں، موت اور جلاوطنی میں شاید"

"کوئی فرق نہیں! تم یہی تو چاہتے تھے بشارت! میں نے تمہارا"

"کہا کر دیا، تم میرا کہا پورا کر دو، میں تم سے صرف اتنا چاہتا ہوں، کہ"

"اپنی موجودہ روشش کو بدل ڈالو جن کو تم دوست سمجھے ہوئے ہو، یہ تمہارے"

"دشمن ہیں خدا کے لئے باپ کے نام کو بٹہ نہ لگاؤ۔ اب بھی کچھ نہیں بگڑا!"

"تم اب بھی سنبھل سکتے ہو۔"

"بشارت! تم مجھ کو مرا ہوا سمجھو زندہ در گور! اب تمہارے کسی دوست کو"

"گولی چلانے کی زحمت گوارا نہ کرنی پڑے گی۔ تمہارا اور میرا اتنے ہی"

"دن کا ساتھ لکھا تھا، تمہارا کوئی قصور نہیں!"

"پیارے بھائی خدا حافظ۔!"

"تمہارا بھائی شرافت"

بشارت نے شہر چھوڑنے سے قبل اپنے باپ کی قبر پہ حاضری دی، باپ کی قبر کو دیکھ کر اُس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے، اُس نے بہت کچھ ضبط کرنے کی کوشش کی، مگر جذبات کا طوفان، کسی طرح بھی نہ رک سکا۔ وہ بے اختیار ہو کر قبر سے لپٹ کر رونے لگا:۔

"ابّا جان! آخری سلام، میرا آپ کے بدنصیب بیٹے"

"شرافت کا، اُس کا جسے آپ جان سے زیادہ عزیز رکھتے تھے"

"میں آپ کے قدموں سے جدا ہو رہا ہوں، ہمیشہ کے لئے اپنی آخری نذر"

"آپ کی قبر کو چوم رہا ہوں، یہ آخری آنسو ہیں، جو آپ کی"

"قبر کے سبزہ پر جھلملا رہے ہیں۔"

"ابا جان! آپ نے آخری دم فرمایا تھا،"

"شرافت! اپنے چھوٹے بھائی بشارت کی دلدہی کرنا"

"میں اُسی ارشاد کی تعمیل میں، جلاوطنی قبول کر رہا ہوں۔"

"ابا جان! سلام! آخری سلام۔"

شرافت قبرستان سے واپس ہُوا۔ اور بہت دور تک باپ کی قبر کو مڑ مڑ کر دیکھتا رہا۔ وہ اپنے

باپ کی قبر کو اس انداز کیساتھ دیکھتا تھا، جیسے وہ کوئی چیز وہاں بھول آیا ہے۔ گھر آکر اُس نے مغرب کی نماز پڑھی، جب اچھی طرح تاریکی پھیل گئی، تو اُس نے ملازم سے کھانا لانے کے لئے کہا، ملازم کمرے میں کھانا رکھ کر چلا گیا، شرافت دسترخوان پر آکر بیٹھا، اور اُس کی محبوب بلی "شبریں" بھی حسب معمول وہاں آکر بیٹھ گئی شرافت کو بھوک بالکل نہ تھی، اُس نے اپنی پیاری بلی کے لئے کھانا منگایا تھا۔ اُس نے شوربہ کا پورا پیالہ بلی کے سامنے رکھ دیا۔ بلی، اس خلاف معمول بات پر شرافت کا منہ دیکھنے لگی۔

"شبریں! میں نے تمہارے ہی لئے یہ کھانا منگایا ہے"

"کھاؤ، کھاؤ! "

شرافت نے بلی کے سر کو قدرے جھکاتے ہوئے کہا۔ بلی نے بوٹیاں کھانی شروع کیں، شرافت اُس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیر کر کہتا جاتا تھا:۔

"شبریں! میں تم سے جدا ہو رہا ہوں، تمہاری پیٹھ کو آخری مرتبہ محبت"

"کے ہاتھ سے سہلایا جا رہا ہے، ہائیں! اب تم کو کون کھانا"

"کھلائیگا، کون تمہاری خبر لیگا، تم کل دوپہر کو کھانے کے وقت"

"کمرے میں آکر جب مجھے نہ پاؤ گی، تو تمہارا کیا حال ہوگا؟"

"یہاں کے لوگ جب میرے ہی دشمن ہو رہے ہیں، تو تمہارے ساتھ محبت سے"

"کیوں پیش آنے لگے!"

"شبریں! میں جانتا ہوں کہ تم مجھے بہت جلد بھول جاؤ گی، اور تمہیں ایک"

" بدنصیب انسان کو بھول بھی جانا چاہیئے۔ میں نے تمہارے ساتھ ایسا کونسا سلوک "
" کیا ہے، کہ تم مجھے بھول ہی نہ سکو، جن کے لئے، میں نے ہر قسم کی ذلت اور "
" مصیبت برداشت کی، جب وہی میرے نہ ہوئے، تو تم تو پھر "
" جانور ہو، تمہارا شکوہ ہی کیا؟ "
" دیکھو! شیریں، تمہیں لوگ ستائیں تو صبر کرنا، ـــ "

[بلی دُم ہلا ہلا کر غُرغُر کرنے لگی]

" اچھا! تو تم بھی مجھے دھتکار رہی ہو شیریں! لو، میں جا رہا ہوں، "
" صبح سُورج نکلنے سے پہلے چلا جاؤں گا ـــ لیکن یہ تو میرا وہم ہے، "
" تہمت ہے تمہاری معصوم فطرت پر، تمہیں کیا خبر کہ مجھ پر کیا قیامت ٹوٹ "
" رہی ہے۔ "
" شیریں! تمہارے چمکیلے اور نرم بال، چند دِن میں گرد آلود ہو کر بے رونق "
" ہو جائیں گے، کتنی سفاک ہے یہ دُنیا ـــ! "

[بلّی، تھوڑی دیر بعد اُٹھ کر
چلی گئی۔]

شرافت کے لئے یہ رات قیامت کی رات تھی، بلکہ اس سے بھی بڑھکر۔ جس مجرم کو صبح پھانسی کی سزا دی جانے والی ہوتی ہے، اور وہ جس کرب و ناامیدی کے عالم میں رات گزارتا ہے، اُس سے

بھی کچھ بڑھ کر، یہ رات شرافت پر بھاری تھی، اُس نے مکان کے در و دیوار سے، والہانہ انداز میں گفتگو کی وہ ایسا محسوس کر رہا تھا، جیسے مکان کے اینٹ، پتھر، اُس کی جدائی سے متاثر ہیں، اور قدرت نے اُن کو اس کے دل کی بات سننے اور سمجھنے کے لئے شعور اور سامعہ عطا کر دیا ہے، کتنی درد انگیز تھیں، اُس کی باتیں:۔

"دروازوں کی محرابو! تم مجھے جھک جھک کر آخر کیوں سلام کر رہی ہو، اس لئے"

"کہ میں جا رہا ہوں، تم سے میرے دل کی بات کس نے کہہ دی — !"

"فصیل کی منڈیرو! تم پر اُگی ہوئی بے ترتیب گھاس، آج رات کو کس لئے"

"جاگ رہی ہے، کیا وہ بھی میری جدائی سے متاثر ہے۔"

"کھڑکیو! جب صبح سویرے سورج کی کرنیں گنگا جمنی کریں، تم کو"

"پہلی مرتبہ آ کر چھوئیں تو مجھ کو یاد کرنا۔ بولو، جواب دو، تم خاموش کیوں ہو۔"

"تم مجھے مسرت بھری نگاہوں سے کس لئے دیکھ رہی ہو۔"

"خوشنما کلیو! میں جانتا ہوں کہ تم صبح کو ضرور مسکراؤ گی، مگر تمہاری مسکراہٹ کو"

"میری آنکھیں نہ دیکھ سکیں گی، آہ! کہ تم مسکرانے کے لئے تیار ہو رہی ہو، اور"

"میں اُس ساعت کا منتظر ہوں، جو موت کی شدت سے بھی زیادہ المناک ہے!"

"دنیا کے گریہ و تبسم کا فلسفہ کس قدر متضاد ہے!۔"

"اے میرے گلدان کے پھولو! میرے قالین کے گل بوٹو بے مجھے بھول جاؤ، ہمیشہ کے لئے"

"بھول جاؤ، آج کے بعد تم مجھے کبھی نہ پاؤ گے۔"

شرافت نے اسی عالم میں ساری رات گزار دی، صبح دن نکلنے سے بہت پہلے، وہ مختصر سے سامان کے ساتھ مکان سے رخصت ہو گیا۔ وہ مکان سے سیدھا اسٹیشن پہنچا، کلکتہ جانے کے لئے گاڑی تیار کھڑی تھی۔ وہ جلدی سے ٹکٹ لیکر۔ گاڑی میں بیٹھ گیا، جب گاڑی اسٹیشن سے روانہ ہوئی تو اُس کی نمناک آنکھوں نے بستی کی فضا کو بڑی حسرت کے ساتھ "خدا حافظ" کہا۔

اُس نے اپنے وطن کے کھیتوں کو حسرت کی نگاہوں سے دیکھا، وہ بہت دور تک بستی کی طرف دیکھتا رہا، مگر ریل کی تیز رفتار نے اُس کی آنکھوں سے بستی کے ہر اونچے سے اونچے مینارے کو اوجھل کر دیا۔ دوسرے دن شام کو وہ کلکتہ پہنچا اور وہاں کے ایک اوسط درجہ کے ہوٹل میں ٹھہر گیا۔

دو تین دن تک تو وہ وطن چھٹنے کے غم میں، اپنے مستقبل سے خالی الذہن ہو کر، اِدھر اُدھر گھومتا رہا۔ تین چار دن کے بعد جب ذرا طبیعت سنبھلی، تو اُس نے اپنے مستقبل کے متعلق غور کرنا شروع کیا۔ شرافت کو نوکری آسانی سے مِل سکتی تھی، مگر غلامی کے لئے وہ کسی طرح تیار نہ تھا، نوکری کے بعد اب تجارت کا سوال باقی رہتا تھا، شرافت کے پاس دو سو روپیہ نقد اور دو انگوٹھیاں تھیں، انگوٹھیوں کو لیکر وہ جوہری بازار میں پہنچا۔ اور چار سو سے کچھ اوپر روپیہ میں، دونوں انگوٹھیاں بیچ آیا۔ اب اُس کے پاس سات سو روپیہ کے قریب ہو گئے، مگر کلکتہ جیسے تجارتی شہر میں، جہاں کروڑوں کا بیوپار ہوتا ہے۔ سات سو روپیہ کس گنتی میں تھے۔ شرافت کو بہر حال پیٹ پالنا تھا، وہ تجارت کی فکر میں دو تین دن تک شہر کے مختلف حصوں میں گھومتا رہا۔ اُس نے مختلف تاجروں، بیوپاریوں، ٹھیکیداروں اور دلالوں

سے بات چیت کر کے معلومات بہم پہنچائیں۔ کلکتہ میں روئی کا بیوپار زوروں پر تھا، پھر اس بیوپار کے لئے زیادہ تجربہ کی ضرورت نہیں، چند گنے چنے اصول، اگر معلوم ہو جائیں، تو پھر کوئی دشواری باقی نہیں رہتی۔ اُس نے چھوٹے بیوپاریوں سے سو من کپاس خرید کر، روئی نکلوائی، روئی کا بھاؤ ان دنوں چڑھا ہوا تھا، اُس کو ایک ہی ہفتہ میں ڈیڑھ سو روپیہ کا منافع ہو گیا۔ منافع نے اُس کی ہمت کو اور بڑھا دیا۔ دوسری مرتبہ اُس نے اور زیادہ کپاس خریدی، اور نفع بھی اُسی حساب سے زیادہ ہوا۔ ایک مہینہ میں شرافت کی پونجی دوگنی سے بھی زیادہ ہو گئی۔ بازار کے لوگ اُس سے واقف ہو گئے تھے۔ اور واقف کیا ہو گئے تھے، اُس کی دیانت، معاملت کی صفائی اور اخلاق نے اُن کو گرویدہ کر لیا تھا،

قدرت اُس کو امتحان کی سخت منزل سے گذارنا چاہتی تھی، اور وہ اس لئے کہ سونا تپائے جانے کے بعد ہی زیادہ نکھرتا ہے، اور آئینہ پر جتنی زیادہ صیقل کیجاتی ہے، اُتنے ہی اُس کے جوہر ظاہر ہوتے ہیں۔ شرافت نے ایک مرتبہ بہت زیادہ کپاس خرید ڈالی قسمت کی بات کہ اُسی زمانہ میں روئی کا بھاؤ گر گیا، شرافت نے روئی کو روک لیا، مگر بھاؤ برابر گرتا چلا آ رہا تھا۔ اس لئے مجبوراً اُسے روئی فروخت کر دینا پڑی، شرافت کو اتنا گھاٹا آیا کہ اُس کی تمام پونجی اسی ٹوٹے میں لگ گئی، اُس کے پاس مشکل سے پچاس روپیہ باقی بچے، کلکتہ کی زندگی، ہوٹل کی رہائش، اسباب معاش، اور تعلقات کے فقدان نے اُس کو بدحواس سا کر دیا۔ اُس کی سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا، کہ آخر کیا کیا جائے؟

شرافت دو دن تک اسی غم میں، بازار نہیں گیا، تیسرے دن وہ بازار گیا، لوگ خرید فروخت کر رہے تھے، یہ خاموش کھڑا ہوا، اس منظر کو دیکھ رہا تھا۔

"شرافت سیٹھ! آپ آج چپ کیسے کھڑے ہیں"

"کچھ لین دین کیجئے، ——— " ایک ڈاڑھی والے بوہرے نے شرافت کے پیچھے سے آکر کہا۔

"لین دین —— میں کروں؟ شرافت نے چونک کر جواب دیا

"ہاں! میں آپ ہی سے کہہ رہا ہوں، آج آپ گھبرائے"

"ہوئے سے کیوں ہیں؟ ——— بوہرے نے دریافت کیا۔

"سیٹھ صاحب! میں اپنی سب جمع پونجی کھو بیٹھا"

"تین دن ہوئے، روئی کا بھاؤ بہت گر گیا تھا مجھے"

"دو ہزار کے قریب گھاٹا آیا ——— " شرافت، ہاتھ ملتے ہوئے بولا۔

"بھئی! آپ بڑے ہی سیدھے اور بھولے ہیں، میاں!"

"بیوپاری لوگ اپنا کچا چٹھا اس طرح سر بازار"

"ہر کس و ناکس کو نہیں سنایا کرتے۔ اس طرح ہوا"

"اکھڑ جاتی ہے۔"

"اور دیکھو میاں! تجارت کے لئے روپیہ کی نہیں، ساکھ"

"کی ضرورت ہے، بازار میں خدا کے فضل سے تمہاری بات"

"بنی ہوئی ہے، ہزاروں کا مال تمہاری ایک"

"بات پر مل سکتی ہے، کل اسمٰعیل سیٹھ تمہاری بہت

"تعریف کر رہا تھا ——————" بوہرے نے جواب دیا۔

"سیٹھ صاحب! میرے پاس تو پچاس روپیہ سے بھی کم

"رہ گئے ہیں، بھلا اتنے سے روپیہ سے ہزاروں کی

"بات چیت میں کس منہ سے کرونگا" شرافت درخت کی ڈالی کو چھوتے

ہوئے بولا۔

"آپ کیوں گھبراتے ہیں، میں آپ کا ضامن ہوں"

"کچھ جو کھوں آکر پڑے گی، تو میں بھگت لوں گا،"

"آپ خدا کا نام لے کر معاملہ تو کیجئے ——————" بوہرے نے جواب دیا۔

شرافت اس چھوٹی سی پونجی پر ہزاروں کی بات چیت کرنے کے لئے کسی طرح تیار نہ تھا، مگر بوڑھے بوہرے نے اُس کی ہمت بندھائی، اور ایک دوکان پر جا کر اُس نے کئی ہزار روپیہ کی روئی کی گانٹھیں خرید لیں۔ بوہرے نے اشارے سے کہا کہ شام تک روپیہ آجائیگا، میں ضامن ہوں، دوکان والے نے کہا کہ ہم کو شرافت سیٹھ کا پورا اطمینان ہے، شرافت کا ستارہ گردش سے نکل چکا تھا، دوسرے دن روئی کا بھاؤ ایک ساتھ ڈیوڑھے کے قریب ہو گیا۔ امریکہ سے ایک لاکھ ٹن روئی کی مانگ آگئی، دوسرے ہی دن شرافت کو کئی ہزار روپیہ مل گیا۔ شرافت نے کپاس کی فصل میں ہزاروں روپیہ پیدا کر لیا جب کپاس کی فصل ختم ہو گئی تو اُس نے چمڑے کا بیوپار شروع کر دیا۔ اس

بیوپار میں بھی قسمت نے اُس کا ساتھ دیا، اور دن رات ترقی ہوتی گئی شرافت کا بیوپار، دیانت اور سچائی کا بیوپار تھا، سب لوگ اُس کی معاملت سے خوش تھے، وعدہ کا وہ انتہائی پابند تھا، تجارت کے لئے وعدہ کی پابندی اور دیانت، ان ہی دو چیزوں کی ضرورت ہے، اللہ نے اُس کے کاروبار میں برکت دی اور چھ سات سال میں، وہ لاکھوں روپیہ کا مالک ہوگیا۔ اُس نے کلکتہ کی نئی آبادی میں ایک خوبصورت بنگلہ بھی خرید لیا تھا، اور اُس کے قریب زمین لیکر، روئی کی مشین نصب کر دی تھی۔ شرافت، جتنا مالدار ہوتا جاتا تھا، اُتنی ہی اُس میں انکساری اور فروتنی پیدا ہوتی جاتی تھی۔ وہ پھٹے حال مزدوروں سے برابری کا برتاؤ کرتا تھا۔ غریبوں اور یتیموں کے لئے اُس کا دسترخوان ہمیشہ بچھا رہتا تھا، کتنے ہی غریب طالب علم اُس کے یہاں سے وظیفہ پاتے تھے۔ مزدوروں اور سرمایہ داروں میں تو ہمیشہ کشمکش ہوتی رہتی ہے، کلکتہ میں بھی مزدوروں نے ہڑتال کر دی، مگر شرافت کے کارخانہ کے مزدور، برابر اپنا کام کرتے رہے، اُس نے اپنے کارخانوں کے مزدوروں کی پہلے ہی سے اتنی معقول تنخواہ کر دی تھی کہ اُن کو کبھی شکایت کا موقع نہیں ملا۔ کارخانہ والوں کے جلسہ میں شرافت نے صاف کہہ دیا تھا کہ:۔

"ہم کو مزدوروں کے مطالبات منظور کر لینے چاہئیں"

"کیونکہ ان ہی کے خون کی گرمی، اور پسینہ کی تری کی"

"بدولت ہم گلچھرے اڑاتے ہیں۔"

"مزدوروں کو ستا کر، سرمایہ داری کبھی نہیں پنپ سکتی"

شرافت کی تقریر کو اخبار والوں نے بڑی بڑی سرخیوں کے ساتھ شائع کیا۔ اور اُس کو شہر کے عوام میں ہر دلعزیزی حاصل ہو گئی۔

شرافت کے چھوٹے بھائی بشارت نے وطن میں یہ خبر مشہور کر دی کہ شرافت پنجاب میں کسی بزرگ کے مزار کی زیارت کو گیا تھا، وہاں ہیضہ میں مر گیا، حکام کو دے دلا کر، اُس نے تمام جائداد اپنے نام کرا لی۔ اب وہ کئی ہزار روپیہ سال کی آمدنی کی جائداد کا تنہا مالک تھا۔ بشارت کے آوارہ دوستوں نے اُس کے اطوار بگاڑ دیئے تھے۔ اُس کی زندگی فسق و فجور میں غرق ہو گئی تھی، فحاشی اور عیاشی اُس کی فطرت ثانیہ بن گئی تھی۔ اس کے بغیر وہ ایک لمحہ نہیں رہ سکتا تھا، اُس کے خود غرض اور آوارہ دوست اُس کو طرح طرح سے گمراہ کرتے تھے،

ان لفنگوں کی تبلیغ گناہ کے انداز، کتنے نفسیاتی تھے:۔

"کل، امیر النساء طوائف کے یہاں جانا ہو گیا، وہ بشارت"

"صاحب کو کس قدر یاد کرتی تھی، اجی! بشارت میاں کے نام"

"پر ٹھنڈی آہ بھرنے لگی۔ اُس سے ضبط نہ ہو سکا، آخر"

"اُس کے منہ سے نکل ہی گیا، کہ بشارت صاحب کی آنکھوں کی"

"میں تو عاشق ہوں ——————"

"پرسوں بڑے بازار میں تذکرہ ہو رہا تھا، کہ شیخ لطافت"

"مرحوم کا چھوٹا بیٹا، اپنے وقت کا حاتم ہے، اس کا ہاتھ ہی"

"نہیں رُکتا" دوست تو دوست غیروں کے ساتھ سلوک کرتا ہے"

"یار! یہ جو امرت سر سے ناٹک آیا ہوا ہے، اس میں"

"ایک عورت تو ایسی طرحدار ہے، کہ میرے تو ہونٹوں میں چُل"

"ہونے لگتی ہے، ہم نے بہت سی عورتوں کی جوانی دیکھی ہے، مگر اس عورت"

"کی جوانی، سبحان اللہ! شباب پھٹا پڑتا ہے۔ ہمارے بشارت"

"میاں کے جوڑ کی ہے، یہ عورت! میں نے حالات معلوم کر لئے ہیں"

"ایسا کچھ زیادہ خرچ نہ ہوگا۔ ہزار سے ادھر ہی میں"

"معاملہ پٹ جائیگا۔"

"بھئی! یوں تو ہمارے بشارت صاحب ماشاء اللہ بہت ہی"

"دیدار و جوان ہیں، مگر شراب پی کر جو ان کے چہرے پر رونق"

"آتی ہے تو بالکل گلاب کا پھول معلوم ہوتے ہیں۔"

بشارت کے دوست اُسے دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہے تھے، اور دن رات، سایہ کی طرح اُس کے ساتھ رہتے تھے، عیاشی اور فضول خرچی کے لئے تو قارون کا خزانہ بھی کافی نہیں ہو سکتا، نتیجہ یہ ہوا کہ بشارت کو آہستہ آہستہ اپنی جائداد فروخت کرنی پڑی۔ شہر میں میونسپلٹی کا الیکشن ہو رہا تھا سیار لوگوں نے بشارت کو انتخاب میں کھڑا کرا دیا۔ بشارت تو انتخاب میں ناکام رہا لیکن لوگ اپنی سازش میں کامیاب ہو گئے، ایک ایک آدمی کے حصہ میں کئی کئی سو روپیہ آئے بشارت

کے پاس اب بہت ہی تھوڑی جائداد باقی رہ گئی تھی، لیکن اُس کی رنگ رلیوں کا وہی عالم تھا۔ چند دن میں یہ جائداد بھی ٹھکانے لگ گئی، اب اُس کے پاس رہنے کا مکان رہ گیا تھا۔ بشارت کے دوست تو پیسہ کے میت تھے، انہوں نے جب دیکھا کہ بشارت کھوکھلا ہو گیا، تو وہ کنی کاٹنے لگے، وہی دوست جو دن رات سایہ کی طرح اُس کے ساتھ رہتے تھے، ہفتوں تک نہ آتے۔ بشارت کو اب ہوش آیا، مگر پانی سر سے اونچا ہو چکا تھا، اور صرف افسوس و فریاد سے تلافیٔ مافات نہیں ہو سکتی تھی۔ بشارت شہر میں بدنام ہو چکا تھا، شریف لوگ اُس سے ملتے ہوئے گھبراتے تھے، اُس کی تباہی پر لوگ افسوس کرنیکے بجائے الٹے ہنستے تھے۔ بشارت اپنے مکان کے فروخت کرنے کی فکر میں تھا، مکان کی قیمت سے وہ کوئی کام کرنا چاہتا تھا، مگر تقدیر کا پھیر، کہ اس عرصہ میں اُس کے ماموں کا انتقال ہو گیا۔ ایک معاملہ میں اُس نے اپنے ماموں کی، بارہ ہزار کی ضمانت کر لی تھی، یہ تمام روپیہ اُس ہی کے ذمہ آکر پڑا۔ جس دن بشارت نے وطن چھوڑا ہے، اُسی دن، اُس کا مکان نیلام پر چڑھ گیا تھا۔

بشارت وطن سے سیدھا پٹنہ آیا۔ پٹنہ میں اُس کے والد کے ایک ملنے والے رہتے تھے، وہ پتہ لگاتا ہوا اُن کے گھر پہنچا۔ وہاں جا کر معلوم ہوا کہ اُن صاحب کو مرے ہوئے چھ مہینے ہوئے، اُنہوں نے ایک لڑکی چھوڑی ہے، جو اپنے نانا کے پاس جبلپور میں ہے، بشارت نے پٹنہ سے کلکتہ کا رُخ کیا، اور وہاں کے مسافر خانہ میں مقیم ہو گیا۔ بشارت کی ساری زندگی عیش و عشرت، ناز و نعم اور آوارگی میں گذری تھی، اُس سے کچھ آتا جاتا نہ تھا، ایسے آدمی

کو بھلا کلکتہ میں نوکری کہاں مل سکتی تھی، چند دن میں اُس کی جمع پونجی ختم ہوگئی۔ اور اب فاقے گذرنے لگے، پیٹ کا مسئلہ بڑا ٹیڑھا ہے۔ آدمی کو بہت سی ناگوار باتیں برداشت کرنی پڑتی ہیں، بشارت نے مجبور ہوکر، ایک کارخانہ میں نوکری کر لی۔ کارخانہ میں اوقات کی بڑی پابندی تھی، بشارت کو اتنا کام کرنا پڑا، کہ چھٹی کا دُودھ یاد آگیا۔ وہ اِس ملازمت سے بہت پریشان تھا، ایک دن وہ اخبار پڑھ رہا تھا، اشتہارات کے صفحہ پر، اُس کی نظر سے ایک اشتہار گذرا ہے:۔

"فوری ضرورت ہے!"

"مسلم کاٹن فیکٹری کے لئے"

"—— ایک منشی کی ——"

"تنخواہ کا تصفیہ —— بالمشافہ"

بشارت نے کارخانہ کے ملازمین سے مسلم کاٹن فیکٹری (شرافت کے کارخانہ کا نام) کا پورا پتہ معلوم کیا۔ اور دُوسرے دن صبح سویرے وہاں پہنچ گیا۔ شرافت، اپنے ملازمین کا خود ہی انتخاب کیا کرتا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ جو سرمایہ دار، ملازمین کے انتخاب کا سلیقہ نہیں رکھتا، اُس کو اپنے سرمایہ کے زوال کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔

بشارت نے چپراسی سے کہا۔ کہ وہ خالی شدہ ملازمت کے لئے آیا ہے، چپراسی نے شرافت کو جاکر اطلاع دی، شرافت نے کہا کہ میں ایک ضروری خط لکھ رہا ہوں، خط لکھنے کے بعد، میں گھنٹی بجاؤں گا، اسوقت آئے ہوئے آدمی کو بلا لینا۔ پندرہ بیس منٹ کے بعد، چپراسی کے کان میں گھنٹی کی آواز آئی، اور

وہ بشارت کو لیکر دفتر میں پہنچا۔ بشارت نے ادب کے ساتھ جھک کر سلام کیا۔ شرافت کے چہرے میں بہت تبدیلی ہو گئی تھی، اُس کا چھریرا جسم بھاری ہو گیا تھا، اُس کے رخساروں پر ڈاڑھی کے گھنے بال تھے، بشارت اُس کو بالکل نہ پہچان سکا۔ شرافت نے بشارت کو کچھ کچھ پہچان لیا۔

"آپ کہاں تک پڑھے ہوئے ہیں ——" شرافت نے دریافت کیا۔

"میں نے اُردو کی چوتھی جماعت تک تعلیم "

"پائی ہے ——————" بشارت نے نظریں نیچی کرکے جواب دیا۔

"یہاں تو انگریزی میں کام کرنا ہو گا "

"اور آپ تو انگریزی نہیں جانتے ——" شرافت نے سُرخ پنسل کو گھماتے ہوئے کہا۔

"ہاں! انگریزی تو مجھے نہیں آتی، لیکن"

"آپ چاہیں تو مجھے اور کسی کام پر لگا سکتے"

"ہیں، میں محنتی اور وفادار ثابت ہوں گا "

"سیٹھ صاحب۔! ——— بشارت نے پسینہ پونچھتے ہوئے جواب دیا

"آپ کا نام۔! ——————" شرافت نے پوچھا۔

"بشارت حسین ——————" بشارت نے جواب دیا۔

"اور آپ کے باپ کا نام کیا ہے ——" شرافت نے دریافت کیا۔

"شیخ لطافت حسین میرے باپ کا نام ہے" بشارت اپنے ٹوٹے ہوئے جوتوں پر نگاہیں جما کر بولا۔

بھائی کی شکستہ حالی دیکھ کر اور باپ کا نام سُن کر، شرافت کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے، اُس نے ضبط کرنے کی کوشش کی، لیکن اُس کا خون جوش میں آگیا۔ وہ کُرسی سے اٹھ کر، بشارت سے لپٹ گیا:۔

"پیارے بشارت! میں ہوں تمہارا بھائی"

"شرافت۔!"

بشارت کا بھی دِل بھر آیا۔ اور دونوں بھائی بہت دیر تک روتے رہے۔

"بھائی جان! میری خطائیں اگرچہ"

"معاف کئے جانے کے لائق نہیں ہیں، مگر میں"

"آپ کے عفو و کرم کی بھیک مانگتا ہوں ———" بشارت، بھائی کے قدموں پر جھکتے ہوئے بولا۔

"بشارت! بشارت! یہ کیا کرتے ہو، پچھلی باتوں"

"کو یاد نہیں کیا کرتے، جو ہونا تھا ہو گیا۔ قدرت"

"کو یہی منظور تھا۔ تم اپنا دل تھوڑا نہ کرو!"

یہ الفاظ کہتے ہوئے، بشارت کی آنکھوں سے، شرافت نے آنسوؤں کو پونچھا، اور اسکی گرد آلود پیشانی کو چوم لیا ——

سچائی کا ایک دن

سچائی، کسی کی خوشی اور ناخوشی کی پرواہ
نہیں کرتی ۔
سچائی کی ایک ساعت، جھوٹ کی ایک صدی
پر بھاری ہے ــــــــ
مگر!
اس دُنیا میں
جہاں "جھوٹ" کی پوجا ہوتی ہے۔
میں
یہ کیا کہہ رہا ہوں ــــ؟

سچائی کا ایک دن

رات کو یکایک سوتے سوتے میری آنکھ کھل گئی، آدھی سے زیادہ رات ڈھل چکی تھی، آسمان پر معصوم تارے، ہلکے ہلکے بادلوں کی آڑ میں آنکھ مچولی کھیل رہے تھے، بڑا سہانا وقت تھا، کچھ خنکی، کچھ روشنی، کچھ سکوت، کچھ ہوا کا تموج، عیش و مسرت کے بہت سے اجزا خوشگوار تناسب کے ساتھ جمع ہو گئے تھے، فطرت اپنے مطالعہ کے لئے نگاہوں کو دعوت دے رہی تھی، ایک ایک ذرہ زبانِ حال سے کہہ رہا تھا:-

"آؤ ——— مجھے پڑھو ———!

بھیگی ہوئی رات مسکرا رہی تھی، تاروں کے قہقہے رات کی مسکراہٹ میں حل ہوئے جا رہے تھے، صحن میں خوب روشنی پھیلی ہوئی تھی، ایسا معلوم ہوتا تھا، جیسے کسی نے دودھ اور ہیرے کو حل کر کے مکان کے صحن میں تہ جما دی ہے، میرے پلنگ کے قریب کے تمام گملے، اپنے خوشنما پودوں کیساتھ گہری نیند سو رہے تھے۔ چھوئی موئی کی شاخیں کچھ ٹھٹھری ہوئی سی تھیں، شاید رات زیادہ خنک ہو گئی تھی ——— اتنی خنک کہ چھوئی موئی کی پتیاں خنکی کو برداشت نہ کر سکتی تھیں۔ موتیا کی کلیاں نیم باز حالت میں تھیں، بس نسیم صبح کے چلنے کی دیر تھی، کیلے کے پتے ہوا سے ہل رہے تھے، نہایت ہی

آہستگی اور قرینہ کے ساتھ! جب چاند بادل میں چھپ جاتا تھا، تو کیلے کے پتوں کی رنگت قدرے سیاہی مائل سبز نظر آتی تھی، میرے سرہانے اسٹول تھا جس پر دو تین کتابیں رکھی ہوئی تھیں، میں نے ایک کتاب کو اٹھا کر پڑھنا شروع کیا، آدھا صفحہ پڑھنے کے بعد، میں مسکرایا، اس غرور کے ساتھ کہ میری آنکھیں چاندنی میں پڑھ سکتی ہیں، میں نے کتاب کو اسٹول پر بند کر کے رکھ دیا۔

میں نے اپنے زندگی کے واقعات پر غور کرنا شروع کیا، اور ہاں! میں نے غور و فکر کی پہل تھوڑی کی تھی، میری زندگی کے واقعات ایک ایک کر کے میرے ذہن و خیال کے سامنے فلم کے پردے کی طرح خود بخود گھوم رہے تھے، میرے چہرے پر پشیمانی، گھبراہٹ، ندامت، خوف، مسرت، اور توحش کے آثار نمایاں ہو رہے تھے، میں خیالات کی رو میں بہا چلا جا رہا تھا، میں جاگ رہا تھا، مگر میرے تصورات خواب دیکھ رہے تھے۔ ایسے خواب جنہوں نے میری زندگی کی تعبیر کی ہے میرے حافظہ نے میری زندگی کے واقعات کے بہت سے ورق، ایک ساتھ اُلٹ دئے، میرا تفکر پریشان سا ہو گیا، میں نے بے اختیاری کی حالت میں کہنا شروع کیا:۔

" ایک دفعہ اور مڑ کر دیکھنا تھا " اُس " کو "

" ہائیں، بڑی چوک ہو گئی مجھ سے ۔! "

" میں جھوٹ نہ بولتا، تو سارا اپنا بنایا کھیل بگڑ جاتا، دُنیا "

" جھوٹ ہی سے حاصل ہوتی ہے ۔! "

پہلی غلطی یہی ہوئی کہ مشاعرے کے رنگ کے "

"خلاف، میں نے غزل کیا انتخاب کیا ۔۔۔!"

"اس کا بھائی تو آہی چکا تھا۔ وہ تو یہ کہیے کہ ہوا نے کھڑکی"

"کو دیوار سے ٹکرا کر مجھے چونکا دیا۔"

میں بہت دیر تک جھوٹ اور سچ کے فلسفہ پر غور کرتا رہا۔ میں نے اپنے زندگی کے بہت سے واقعات کو جھوٹ اور سچ کے نقطۂ نگاہ سے جانچنے کی کوشش کی، واقعات پر غور کرتے کرتے مجھ میں فیصلہ کرنے کی قوت ہی باقی نہ رہی تھی۔ میرا وجدان کچھ کھو سا گیا تھا، اور میرے خیالات پریشان ہوتے چلے جا رہے تھے، میں نے تھوڑی دیر تفکر کے بعد، دل ہی دل میں کہا۔

"میں آج صبح اُٹھنے کے بعد، سچ بولوں گا"

"ایک بات بھی جھوٹ نہ کہوں گا۔"

میں نے اس تجویز کے بعد، اپنے اندر ایک قسم کی قوت محسوس کی، جو اس تجویز پر مُہرِ تصدیق ثبت کر رہی تھی۔ میں اس کے بعد سو گیا، صبح کو جب خوب دھوپ پھیل گئی، تو میری آنکھ کھلی، میں نے جب صحن اور در و دیوار پر نظر ڈالی، تو مجھے ہر چیز نئی سی نظر آرہی تھی۔ سچ بولنے کے فیصلہ نے مجھ میں ایک خاص قسم کا تغیر پیدا کر دیا تھا۔ میں اپنے سینہ میں روشنی سی محسوس کر رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی نے میرے دِل کو نور کے پانی سے دھو کر اُجلا بنا دیا ہے۔ مجھے اپنا ماحول روشن نظر آتا تھا۔

"کیا مجھے عرفان حاصل ہو رہا ہے"

میں نے دِل ہی دل میں کہا ——— دل ہی سے ایک آواز آئی :-

تجربہ کے بعد اس کا فیصلہ ہوگا"

میں بستر سے اُٹھا، اور حوائج ضروری سے فارغ ہو کر، دیوانخانہ کے صوفے پر بیٹھ کر کتاب پڑھنے لگا۔ کتاب زیادہ دلچسپ تو نہ تھی، مگر مصنّف نے بحث کو کچھ اس طرح اُلجھا کر طویل بنا دیا تھا، کہ دِل نتیجہ پر پہنچنے کے لئے بے تاب تھا۔ میں نے کتاب کا آٹھواں ورق اُلٹا ہی تھا، کہ میری بیوی دیوانخانہ میں داخل ہوئی۔ میں نے بیوی کی طرف ایک نظر دیکھا، اور پھر کتاب پڑھنے میں مشغول ہو گیا۔

"کیا کر رہے ہیں آپ!" بیوی نے دریافت کیا۔

"کتاب پڑھ رہا ہوں۔!" میں نے سطر پر انگلی رکھتے ہوئے کہا۔

"دیکھئے تو سہی، آپ کو یہ ساری جو میں پہنے

ہوئے ہوں پسند ہے۔"

"میں اس ساری میں غالباً اچھی

لگتی ——— ہوں ——— گی" بیوی خاص انداز کے ساتھ بولی۔

میں بلا سوچے سمجھے بیوی کی ساری کی تعریف کرنے ہی والا تھا، کہ مجھے اپنا شب کا فیصلہ یاد آگیا،

"یہ ساری تو مجھے پسند نہیں ہے، گہرا آسمانی"

" رنگ مجھے عام طور پر نہیں بھاتا ——— " میں نے پانوں کی ڈبیہ کو کھولتے ہوئے کہا۔

" ساری کی کور تو آپ کو پسند ہوگی ؟ " بیوی قدرے چیں برجبیں ہو کر بولی۔

" اس کورہی نے تو ساری کے حسن کو خاک میں "

" ملا دیا ہے، بالکل دہقانی وضع کی ہے یہ کور ! "

" پھولوں کی پتیوں میں کوئی تناسب ہی نہیں ہے "

" اور پھر سُرخ رنگ — ! لاحول ولاقوۃ ! " میں نے انگڑائی لیتے ہوئے جواب دیا۔

" آپ کو تو میری چال ڈھال، صورت شکل، وضع قطع "

" غرض کوئی چیز پسند نہیں، ایسا ہی خوبصورتی کا "

" خیال تھا، تو کسی پری سے شادی کرنی تھی ۔ "

" خدا کسی عورت کا شاعر اور مضمون نگار سے پالا نہ ڈالے "

" دیکھئے ! میں آپ کے اشعار کو لہو کے گھونٹ پی پی کر "

" سنتی ہوں، مست آنکھوں کی تعریف، چاند سے رخساروں کا "

" ذکر، پلّو کے ڈھلکنے کی تفصیل، مہندی لگے پوروں "

" کا چٹخارے لے کر بیان، میرے سامنے اور وصل کی رات کا "

" ذکر، اور وہ بھی اس طرح :-

ا

"بے رُخی کے ساتھ سننا دردِ دل کی داستاں "

" وہ کلائی میں نزا کنگن گھمانا یاد ہے ۔ "

" اور آپ نے پرسوں جو وہ غزل سُنائی ہے، اُس کے ایک "

" شعر پر، آپ کو کیا معلوم کہ میں کب تک تڑپتی رہی ہوں :۔ "

" نگاہِ شوق پہ حسرت سی چھائی جاتی ہے "

اس احتیاط سے چلمن اُٹھائی جاتی ہے "

" آپ کو پرائی بہو بیٹیوں پر نظر ڈالتے ہوئے "

" شرم نہیں آتی، اور غضب خدا کا، کوئی تو اپنے عیبوں کو "

" چھپاتا ہو گا، اور یہ اپنے عیبوں کو اخباروں میں چھپواتے ہیں "

" لوگوں کو سناتے ہیں۔ "

" عاشقی، وصل کی رات، جدائی کی شام، ایسی باتیں سنا سنا کر "

" آپ مجھے انگاروں پر لٹاتے ہیں، انگاروں پر ! "

" اور آپ صاحب ! لاکھ قسمیں کھائیے، لیکن میں آج اپنے دل کی "

" بات کہتی ہوں کہ آپ شراب ضرور پیتے ہیں، آپ کی ایک غزل "

" بھی تو ایسی نہیں ہے، جس میں آپ نے شراب کا ذکر نہ کیا ہو۔ آپ "

"مجھے کیوں پسند کرنے لگے، آپ کو تو ایسی عورتیں پسند آئیں گی "

" جو اپنے ہاتھ سے شراب انڈیل کر آپ کو پلائیں۔ "

" ہائیں! میری قسمت میں یہی لکھا تھا ——————— " بیوی نے نہایت

ترش رو ہو کر، اتنی بہت سی باتیں، ذرا سی دیر میں کہہ دیں۔

" بیگم! اس قسم کی بے تکی باتیں نہیں کیا کرتے "

" بات تھی زمین کی، اور تم اُسے آسمان پر لے گئیں! "

" ساری کی ناپسندیدگی سے، ان باتوں کا کیا تعلق ہے "

" کیا تم مجھ سے جھوٹ بلوانا چاہتی ہو "

" تم نے ساری کے متعلق پوچھا، میں نے کہہ دیا کہ مجھے پسند "

" نہیں، اتنی سی بات میں اس قدر بگڑنے کی کیا ضرورت تھی "

" پرسوں تم ہی نے میری نئی شروانی کو دیکھ کر کہا تھا "

" کہ اس کپڑے کی رنگت مجھے پسند نہیں، تم ہی ایمان سے "

" بتاؤ، کہ میں نے تمہاری اس ناپسندیدگی پر ایک لفظ بھی "

" کہا تھا۔ "

" بیگم! آج میں اپنے دل کی آواز کو نہ روکنے کا فیصلہ "

" کر چکا ہوں، میں جھوٹ نہیں بولوں گا، میں نے کم سے کم آج ایک "

" دن کے لئے بناوٹ اور ریا کی چادر اُتار کر الگ رکھ "

"دی ہے ———————" میں نے بیوی کا ہاتھ تھامتے

ہوئے جواب دیا۔

"آپ کی ایسی منطقوں سے کہیں میرا کلیجہ ٹھنڈا ہو سکتا ہے "

"یہ تو آپ زخم پر نمک چھڑک رہے ہیں۔ میں "

"دیکھ رہی ہوں، کہ چند دن سے آپ کچھ اُڑی اُڑی سی باتیں "

"کرتے ہیں بے پروائی کے ساتھ، بالکل اس طرح، جیسے "

"کسی کو کسی سے دلچسپی نہیں رہتی ———————" بیوی رُک رُک کر بولی۔

"بیگم! میں تمہاری خوشی کے لئے کم سے کم سچ جھوٹ "

"نہیں بول سکتا۔ تمہاری ساری واقعی مجھے "

"ناپسند ہے اور تم اس ساری میں بھلی نہیں "

"لگتیں ———————" میں نے کتاب کو میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

میری بیوی میرے اس جواب پر سُنتے ہی مُنہ میں کچھ بڑبڑاتی ہوئی میرے پاس سے چلی گئی، میری کھری کھری باتوں سے اُس کے دل کو دُکھ ہوا۔ مجھے بھی بیوی کے جذبات کا احساس تھا، مگر میں سچ بولنے کا فیصلہ کر چکا تھا، اور بیوی کی محبت، اس فیصلہ میں کوئی تبدیلی پیدا نہ کر سکتی تھی، آٹھ بجے کے بعد دستر خوان بچھا، اور اندر سے آواز آئی:۔

"ناشتہ تیار ہے!"

یہ آواز عورت ہی تھی، اور ناراضگی کی ترجمان بھی! میں بھوکا تھا، اور بھوکا نہ بھی ہوتا۔ تو بھی اس خشمگین آواز کی پرواہ نہ کرتا، کیونکہ میں جانتا ہوں۔ کہ عورت کی خفگی کی بنیاد بہت ہی کمزور ہوتی ہے میں دسترخوان پر جا کر بیٹھ گیا، بیوی کے تیور بدلے ہوئے تھے، اور اُس کی ایک ایک ادا سے خفگی ظاہر ہو رہی تھی، میں ناشتہ کر کے دیوانخانہ میں چلا آیا، کیونکہ میری "ہمتِ مردانہ" کو قدرے گرمی سی محسوس ہونے لگی تھی۔

میں نے دیوانخانہ میں بیٹھ کر، اپنے گذشتہ مضامین کو پڑھنا شروع کیا، اتنے میں ایک ملاقاتی آ گئے، میں نے نہایت ہی خندہ پیشانی کے ساتھ اُن کا استقبال کیا، وہ کرسی پر بے تکلف ہو کر بیٹھ گئے۔

"کہئے ماہر صاحب کوئی تازہ غزل یا نظم کہی ہے"

"آپ نے! ——————— دوست نے کلائی کی گھڑی میں کنجی لگاتے ہوئے کہا۔

"بھائی! آجکل نثر کی طرف زیادہ توجہ ہے"

"ایک کتاب لکھ رہا ہوں، اس ایک مہینہ کے عرصہ میں ایک غزل"

"کہی ہے، سو وہ بھی ناتمام ہے، ——————— " میں نے جواب دیا۔

"بھئی ماہر! قسم خدا کی، آپ کی آواز اور کلام کے لئے"

"کان ترستے رہتے ہیں، سنائیے، سنائیے" دوست نے سگرٹ سلگاتے ہوئے کہا

میں نے غزل سُنائی، دوست نے ایک ایک شعر پر داد دی، میں آج شعر سنانے اور سننے کے لئے بالکل تیار نہ تھا۔ یہ غزل بھی دوست کے اصرار پر، نہایت ہی مرے جی سے سنانی پڑی میں اپنی غزل سُنا کر خاموش بیٹھ گیا۔ دوست نے دو چار بار پہلو بدلا۔ کچھ گنگنایا، پھر میری طرف دیکھا، اس توقع کے ساتھ کہ میں اُس سے غزل سُنانے کے لئے کہوں، لیکن میں نے آج بناوٹ اور جھوٹ کی باتوں سے دُور رہنے کا فیصلہ کر لیا تھا، میں نے میز کی دراز کھینچی، اور میرا ہاتھ کاغذ کو پُوری طرح چھونے بھی نہ پایا تھا، کہ دوست نے کہا :-

" ارے بھئی! ہم نے بھی ایک غزل کہی ہے "

" بالکل نئی زمین نکالی ہے۔ "

میں نے جواب دیا :-

" آپ تو اکثر نئی زمینوں میں غزلیں کہتے رہتے "

" ہیں۔ بہت جدت پسند واقع ہوئے ہیں آپ! "

میں اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا۔ دوست نے اس رنگ کو دیکھکر، اوپر کی جیب سے ایک کاغذ نکالا، جس میں شکنوں کے سوا کچھ نظر آتا تھا۔

" ابھی غزل کو میں نے صاف بھی "

" نہیں کیا۔ " دوست نے کاغذ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

" جی ہاں، ایسا ہی معلوم ہوتا ہے " میں نے جواب دیا،

میرے اس سکوت پر دوست سے نہ رہا گیا، وہ پہلو بدل کر بولا:۔

"ماہر صاحب! آج آپ کچھ اکھڑے ہوئے "

"سے نظر آتے ہیں، آپ کہیں تو تازہ غزل "

"سُنا دوں۔ "

میں نے سر کو اس طرح جنبش دی۔ کہ دیکھنے والا، میرے دلی مفہوم کو سمجھ لے، مگر ایک اُس شاعر کو جو اپنا تازہ کلام سُنانے کے لیے بے چین ہو نفسیات کی گہرائی میں جانے کی کیا ضرورت تھی۔ دوست نے غزل شروع کی، اور ایک ایک شعر کو طویل شرح و تمہید کے بعد سُنایا اُس نے کہا:۔

" مطلع تو غور و فکر کے بغیر ہی ذہن میں آگیا، "

" اجی! اسی کا نام تو الہام ہے۔ "

" اس شعر پر مولوی برکت اللہ نے میری پیشانی "

"چوم لی، یہ مولوی صاحب بھی بڑے صاحب ذوق ہیں، "

" کہتے تھے کہ تمہارا یہ شعر کلیات پر "

" بھاری ہے۔ "

" دیکھئے! اس شعر میں، شاعر نے اپنے عقیدہ کو "

" ظاہر کیا ہے، دوسرے مصرعہ کو غور سے سُنئے، پہلے "

!

"مصرعہ کے دعوے کو کس خوش اسلوبی کے ساتھ"

"ثابت کیا ہے۔"

"ماہر صاحب! کتنا نازک مقام ہے، اللہ غنی! ایسے"

"ہی مقامات پر شاعر کا کمال معلوم ہوتا ہے۔"

"نفسیاتی شعر کہا ہے، جناب میں نے! الفاظ کی بندش"

"کو دیکھئے، غالبؔ کے اس شعر کے بعد"

"کہ:-______"

"شور پند ناصح نے زخم پر نمک چھڑکا"

آپ سے کوئی پوچھے، تم نے کیا مزا پایا"

"میرے شعر کو پڑھئے۔ ! اس سے زیادہ کیا کہوں؟"

میں دوست کے تمام اشعار کو خاموشی کے ساتھ سُنتا رہا۔ صرف ایک شعر پر جو واقعی اوسط درجہ کا شعر تھا، میں نے "سبحان اللہ" کہا۔ دوست کو میری خاموشی بہت شاق گذری۔ جس مُلک میں شعر پر واہ واہ کرنا، ادبی رسم میں داخل ہو چکا ہو، وہاں ایک شاعر کا دوسرے شاعر کے شعر پر، اس طرح خاموش بیٹھے رہنا، یقیناً حیرت انگیز ہونا چاہیئے۔

"کہئے آپ کی طبیعت تو اچھی ہے"

"بہت افسردہ اور غیر شگفتہ نظر آتے"

" ہیں آپ ــــ ! " دوست نے میرے چہرے پر نظریں جماتے

ہوئے کہا۔

" نہیں، خدا کے فضل سے میری طبیعت "

" اچھی ہے ۔ " میں نے جواب دیا۔

" میری غزل پر آپ کا یہ سکوت ! میری "

" سمجھ میں نہیں آیا۔ کیا میری غزل "

" آپ کو پسند نہیں آئی ــــــــ " دوست شیروانی کا بٹن گھماتے ہوئے بولا۔

" جی ہاں! آپ کی غزل کچھ زیادہ "

" اچھی نہ تھی مجھے پوری غزل میں "

" صرف ایک شعر کچھ پسند ہے " میں نے جلی ہوئی دیا سلائی سے دانتوں میں خلال

کرتے ہوئے کہا۔

" یہ آپ آج کیسی اُکھڑی ہوئی باتیں "

" کر رہے ہیں۔ میں نے آپ کے ایک ایک "

" شعر پر داد دی ہے۔ کئی شعروں کو تو آپ سے "

" دو دو تین دفعہ پڑھوایا ہے، اور میری پوری "

" غزل پر آپ بُت بنے بیٹھے رہے۔ کیا مروت "

" اسی کا نام ہے ! شاعر کو تو بہت زیادہ "
" خلیق ہونا چاہیئے ——————— دوست انگلی چٹخاتے ہوئے بولا۔

" اگر میرے شعر داد کے قابل تھے ، اور آپ نے سمجھ کر "
" داد دی ہے ، تو یہ آپ نے اپنا فرض ادا کیا ہے ، "
" اور اگر آپ نے اس لیئے داد دی کہ میں بھی "
" آپ کی غزل پر داد دے کر آپ کی داد کا "
" بدل کر دوں ، تو معاف فرمایئے ، یہ آپ نے کچھ اچھا کام نہیں "
" کیا ——————————— " میں نے انتہائی سنجیدگی کے
ساتھ جواب دیا۔

" میرے اشعار آپ کو ناپسند ہیں ، خیر ! لیکن ناپسندیدگی "
" کی کوئی وجہ ہونی چاہیئے — ! ——— " دوست نے ناک بھوں چڑھا کر کہا۔
" آپ کی غزل کا پانچواں شعر کچھ اچھا ہے ، باقی تمام اشعار "
" پھیکے اور بے مزہ ہیں۔ مطلع کے دونوں مصرعوں کا ایک "
" دوسرے سے کوئی ربط نہیں۔ دوسرے شعر میں آپ نے "
" گزارشات " استعمال کیا ہے ، گزارش خالص فارسی "
" لفظ ہے ، عربی قاعدہ سے اس کی جمع بنانا سخت غلطی ہے "

" آپ کے تیسرے شعر کو سن کر تو امانت لکھنوی یاد آگئے، وہی "

" ضلع، جگت، بھائی! یہ تکلفات شعر بناتے نہیں، بلکہ "

" شعر کو قتل کرتے ہیں۔ چوتھے شعر میں جو آپ نے محبوب پر "

" طنز کی ہے، اس سے محبوب کی توہین کا پہلو نکلتا ہے، اور یہ غزل "

" کے اصول کے خلاف ہے۔ آپ کی غزل کے چھٹے شعر کا پہلا مصرعہ "

" ذرا جاندار ہے، لیکن دوسرے مصرعہ کو آپ نے بہت کمزور کہا ہے "

" اور آخری شعر تو بالکل "بھول بھلیاں" بن کر رہ گیا ہے، خدا کے لئے "

" فلسفہ اور تصوف کی آمیزش اس بیباکی کے ساتھ نہ فرمایا کیجئے۔ "

" آپ کو میری تنقید سے دُکھ ہوا ہو گا، مگر میں دل کی بات اجھوٹ "

" اور بناوٹ کے پردے میں نہیں چھپا سکتا —————— " میں نے جواب دیا۔

" جی ہاں! تو یوں کہئے کہ ہم نرے اُلّو کے پٹھے، اور احمق "

" ہیں۔ ہم سے شعر کہنا ہی نہیں آتا۔ "

" ماہر صاحب! اگر میں آپ کی غزلوں اور نظموں پر تنقید "

" شروع کر دوں تو چھٹی کا دودھ یاد آجائے۔ ہم تو ہر جگہ "

" آپ کی تعریف کرتے پھرتے ہیں، اور آپ کا یہ حال ہے کہ "

" ہماری اچھی غزل کو مہمل ٹھہرائے دیتے ہیں۔ "

!

"اجی! یہ جو رسالہ والے آپ کی غزلوں کو بڑے بڑے"
"عنوانوں کے ساتھ شائع کر دیتے ہیں، اور آپ ترنم کی وجہ سے"
"جو مشاعروں میں کامیابی حاصل کر لیتے ہیں، اس چیز نے آپ کا"
"دماغ خراب کر دیا ہے۔ میری مشقِ سخن آپ سے"
"بڑھی ہوئی ہے، نو سال کی عمر سے میں شعر کہتا ہوں"
"ماہر صاحب! یہ آپ کی روش ٹھیک نہیں ہے۔"
"دوستوں سے ایسی باتیں نہیں کیا کرتے، آپ"
"اسکول کے لونڈوں کو جا کر مرعوب کیجئے، ہم پر آپ"
"کی قابلیت کا جادو نہیں چل سکتا۔"

دوست نے تیز لہجہ میں کہا، اور میں خاموشی کے ساتھ سب کچھ سنتا رہا، دوست کی گفتگو کے ختم ہونے پر میں نے کاغذ پر لکیریں کھینچی شروع کیں، مجھے ایک گوشوارہ (Chart) مرتب کرنا تھا، دوست یہ کہتا ہوا اٹھ کر چلا گیا:۔

"آج سے ادھر کا رُخ بھی کروں، تو سو جوتے"
"لگانا میرے ۔!"

میں نے آوازوں پر آوازیں دیں، مگر دوست نے مڑ کر بھی نہ دیکھا، دوست کے چلے جانے کے بعد، میں نے باہر جانے کے لئے شیروانی پہنی، اتنے میں ایک اور شناسا آ گئے،

علیک سلیک کے بعد، ادھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں۔ میں باہر جانے کے لئے تیار تھا، مگر یہ ہمارے کرم فرما دوست کسی طرح ٹلتے ہی نہ تھے، انہوں نے باتوں ہی باتوں میں ایک داستان شروع کر دی:-

" بھائی ماہر! کل میں باغ عام گیا تھا، جوبلی ہال کے سامنے"

" ایک زرد رنگ کی موٹر آ کر رکی، میں نے جو اس طرف نظر کی، تو کیا دیکھتا"

" ہوں کہ موٹر میں تین نوجوان عورتیں بیٹھی ہوئی ہیں، میں موٹر سے کوئی پندرہ قدم"

" کے فاصلہ پر ہونگا۔ میں نے ان عورتوں کو اچھی طرح دیکھا، ایک کا رنگ تو"

" سانولا تھا، مگر بھبن اس بلا کی تھی۔ کہ آدمی بس دیکھتا ہی رہے۔ بیچ میں"

" بیٹھی ہوئی عورت کے بال تو البتہ بھورے تھے، مگر صاحب! آنکھیں، اوہو ہو!"

" سبحان اللہ! بھئی ماہر تمہارے سر کی قسم، آنکھیں نہیں تھیں۔ شراب کے"

" چھلکتے ہوئے پیمانے تھے۔ لانبی پلکیں کا ہیکو تھیں، نشتر تھے"

" نشتر — !"

" تیسری عورت، سب سے زیادہ حسین تھی، چمپئی رنگ، ستواں ناک"

" نیم باز آنکھیں، اور میاں ماہر! لباس بھی ظالم نے ایسا"

" پہنا تھا، کہ جی لوٹ پوٹ ہوا جاتا تھا۔ ہلکی، گلابی ساری، اوفو!"

" بھئی! میں اپنی آنکھوں کو مبارک باد دے رہا ہوں۔"

" ہاں! تو میں درخت کی شاخیں تھام کر کھڑا ہو گیا۔ سانولے "
" رنگ کی عورت نے میری طرف اشارہ کیا، میں نے کوئی جواب نہیں "
" دیا، اس کے بعد بیچ میں بیٹھی ہوئی عورت نے رومال ہلایا، میں پھر "
" بھی خاموش رہا۔ مگر جب اُس قتالۂ روزگار نے اشارہ کیا ہے "
" تو مجھ سے رہا نہ گیا، میں نے بھی اشارہ کا جواب دیا۔ اس پر تینوں عورتوں نے "
" قہقہہ لگایا۔ وہ عورتیں بڑی دیر تک مجھے گھورتی رہیں۔ اُس کے "
" بعد ذرا پھیر کے ساتھ، موٹر میرے قریب سے گذری، اور موٹر سے "
" آواز آئی:۔ "

" " اتوار کی شام کو اسی جگہ ملیئے! " "

" ماہر! یقین جانو، میں ایک گھنٹہ تک اُسی جگہ پر "
" بُت بنا کھڑا رہا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا۔ کہ جیسے مجھے کسی نے کچھ "
" پلا دیا ہے۔ بس اب اتوار کا انتظار ہے، میں آج ہی "
" درزی کو کپڑے سینے کے لئے دے آیا ہوں، اجی! میں بھی اُس دن "
" اس قدر بن سنور کر جاؤں گا۔ کہ وہ عورتیں بھی ——————— "

" دوست اتنا کہہ کر کھانسنے لگا، اُس نے میری طرف استفسار کی نظروں سے دیکھا، میں بالکل خاموش رہا۔

" بھائی ماہر! خاموش کیوں ہو، کہو، کس قدر "

" دلچسپ ہے یہ افسانہ! بھائی! ایسے موقعے "

" زندگی میں ایک دو ہی مرتبہ ملتے ہیں ——— " دوست نے خوش ہوتے ہوئے کہا،

" جی ہاں! بڑا دلچسپ افسانہ ہے۔ اگر آپ ایسے "

" ہی پلاٹ تیار کرتے رہے، تو چند دنوں میں "

" افسانہ نویس بن جائیں گے ——— " میں نے جواب دیا۔

" یعنی ——— ! ——— ——— " دوست نے اوپر کو اٹھتے ہوئے پوچھا۔

" یہی، جو میں نے ابھی ابھی کہا ہے ——— " میں نے قدرے مسکرا کر جواب دیا۔

" تو کیا، آپ اس کو کوئی خیالی افسانہ اور "

" فرضی کہانی سمجھ رہے ہیں ——— " دوست ذرا خفیف سا ہو کر بولا۔

" جی ہاں! قریب قریب ایسا ہی ہے " میں نے کہا۔

" تو کیا آپ مجھے جھوٹا سمجھتے ہیں ——— " دوست نے جواب دیا۔

" میاں! میں بچہ نہیں ہوں، جو آپ ایسی باتیں "

" کرکے، مجھے یقین دلا دیں گے، میں کل خود باغ "

" عام میں موجود تھا۔ اور جوبلی ہال کے سامنے کے "

" سبزے پر، پانچ بجے سے رات کے ساڑھے سات"

" تک بیٹھا رہا۔ میں نے نہ آپ کو دیکھا اور نہ زرد "

" رنگ کی کسی موٹر کو ———!"

" اور بالفرض یہ تسلیم بھی کر لیا جائے، کہ آپ بھی "

" کل باغِ عام میں تھے، اور زرد رنگ کی ایک موٹر بھی"

" وہاں آئی تھی، اور اُس موٹر میں تین عورتیں بھی "

" تھیں، اور وہ تینوں کی تینوں حسین بھی تھیں، لیکن یہ"

" چیز کہ تین عورتوں نے آپ کی طرف اشارے کر کے"

" اپنے عشق و فریفتگی کا اظہار کیا، عورت کی فطرت کے"

" خلاف ہے۔ عورت اور مرد کی فطرت اسی نقطہ سے "

" مختلف ہو جاتی ہے، کئی مرد، ایک ساتھ مل کر "

" ایک عورت سے اپنی دلچسپی کا اظہار کر سکتے ہیں، مگر دو عورتیں "

" ایک ساتھ کبھی ایک مرد کی طرف میلانِ طبع کا اظہار نہیں "

" کر سکتیں ———— " میں نے دوست کی آنکھوں

میں آنکھیں ڈالکر کہا۔

" آپ مجھے جھوٹا کہتے ہیں، شرم نہیں آتی آپ کو! "

"اپنے مکان پر شریف لوگ، کیا ایسے ہی دوسروں کو"
"ذلیل کیا کرتے ہیں، ۔لاحول ولاقوۃ۔!"
"اجی! آپ نے ہمیں بہت سے واقعات سنائے ہیں، لیکن"
"ہم نے آپ کی ایک بات کو بھی آج تک جھٹلایا ہے۔"
"وہ آپ کا مینی تال کا واقعہ ہے کہ واقعہ سے بھی زیادہ تعجب"
"خیز ہے، مگر میں نے تو اس کا بھی یقین کر لیا۔ دوستوں کی"
"باتیں کہیں جھٹلائی جاتی ہیں۔ یہ تو تفریحی باتیں ہیں،"
"کوئی تاریخ کے واقعات تھوڑی ہیں، کہ اُن کے"
"ملنے سے ادب کو نقصان پہنچ جائیگا" دوست، اپنی عینک کو قمیص
کے دامن سے صاف کرتے ہوئے بولا۔
"بہر حال جھوٹ آخر جھوٹ ہے، خواہ"
"اُس کا نام تفریح ہو یا سنجیدگی۔!————" میں نے جواب دیا۔
"اچھا تو ہم جھوٹے ہیں، مکار ہیں، خیر! لیکن ماہر"
"صاحب، اب آپ بھی بچے رہئے، بندہ کی دوستی"
"اس وقت سے ختم ہوتی ہے۔ آپ نے جو اُس لڑکی"
"پر نظم کہی ہے، اُس کی نقل میرے پاس موجود ہے، میں"

" آج ہی وہ نظم اُس لڑکی کے بھائی کو جا کر دکھاؤں گا، "

" اور معلوم ہے کیا ہوگا، اس کا انجام! آپ کی ملازمت"

" پر اثر پڑ جائیگا —————— " دوست اٹھتے ہوئے بولا۔

" اگر اتنی ذرا سی بات پر دوستی ختم ہو جاتی ہے، تو "

" ایسی دوستی کو دور ہی سے ڈنڈوت ما یہ دوستی کیا "

" ہوئی کچے سوت کا دھاگا ہوا، کہ ذرا سی "

" جنبش میں ٹوٹ گیا۔ "

" اب رہا میری ملازمت کا مسئلہ، سو اس کے لئے آپ "

" ہر امکانی کوشش فرما سکتے ہیں، آپ خوب جی کھول کر "

" میرے خلاف کوشش کیجئے ——— میں بخدا آپ سے شکوہ "

" نہیں کروں گا۔ "

" ہر دوستان سلامت کہ تو خنجر آزمائی " میں نے جواب دیا۔

اس پر میرا رنجور دوست سائیکل پر سوار ہو کر، روانہ ہو گیا، میں نے اُسکے منانے کی کوشش بھی کی، مگر وہ تو اس قدر گرم اور تیز ہو گیا تھا، جیسے اُسے کسی نے آگ کے جوتے پہنا دئے ہیں۔ دوست کے چلے جانے کے بعد، میں تانگہ میں بیٹھ کر بازار پہنچا، مجھے جوتا خریدنا تھا، ہولی کا تیوہار قریب تھا، اس لئے بازار میں خاصی چہل پہل تھی، میں نے ایک دوکان پر جا کر، کانپور کا

بنا ہوا پیٹنٹ جوتا پہن کر دیکھا، یہ جوتا میرے ٹھیک آیا، ایک دوسرے صاحب نے بھی اسی میل کا جوتا منگایا، اور اتفاق کی بات کہ اُن کے پیر کا اور میرے پیر کا ناپ بھی ایک ہی نکلا۔ جوتے والے نے اُس جوتے کی سات روپیہ قیمت بتائی، میں تو قیمت دینے کے لئے تیار تھا، مگر اُس شخص نے کہا:۔

"اجی سات روپیہ دئے دیتے ہیں آپ اس "

"جوتے کے! چلیئے میرے ساتھ چلیئے میں آپ کو "

"اس سے کم قیمت پر اس سے اچّھا جوتا دلاؤں گا۔ "

اُس شخص کی ہمدردی سے مجھے اپنے ساتھ کھینچ کرلے گئی، وہ شخص مجھے ایک دوکان پر لیکر پہنچا، اور اُسی قسم کا جوتا دکھانے کے لئے دوکاندار سے فرمائش کی۔ دوکاندار نے دو جوڑے جوتے ہمارے سامنے رکھ دئے، ہم دونوں نے پہن کر دیکھے، بالکل ٹھیک نکلے۔

"اچھا۔ ! تو اس کی قیمت "

"کہہ دیجئے —— ! " میرے ساتھی نے دوکاندار سے پُوچھا۔

"ہاں! ایک ہی بات کہہ دیجئے، لیکن "

"یہ سمجھ کر کہئے کہ آپ ایک ہی بات "

"فرما رہے ہیں —————— " میرے ساتھی نے کہا۔

"اچھا! ہاں! آپ دونوں صاحبان شاید دُوسری "

"دوکانوں پر مال دیکھ کر آرہے ہیں، کیا اس میل کا "

"جوتا بھی آپ نے کہیں دیکھا تھا ——— " دکاندار، ویسکوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالتے ہوئے بولا۔

"جی ہاں، ایک دوکان پر بالکل یہی جوتا"

"دیکھا تھا۔ کانپور کا یہ "گلزار شو" ہی ہے نا!" میرے ساتھی نے جواب دیا۔

"جی ہاں! گلزار شو ہی ہے، اچھا، تو وہاں آپ کو"

"جو قیمت بتائی گئی تھی، اس میں سے چار آنہ ہیں"

"آپ کیخاطر چھوڑ دونگا۔ آپ کی بات کا "

"مجھے اعتبار ہے ——— " دوکاندار نے کہا۔

"وہاں اس جوتہ کی قیمت چار روپیہ دس آنہ بتائی"

"گئی تھی ——— میرے ساتھی نے جوتہ کے تسمہ کو چھوتے ہوئے جواب دیا۔

"چار روپیہ دس آنہ، اس جوتہ کی قیمت!"

"حیرت ہے! اچھا آپ نے بھی کیا یہی "

"جوتا دیکھا تھا۔ اور دوکاندار نے کیا دام بتائے تھے؟" دوکاندار میری طرف دیکھتے ہوئے بولا

"جی ہاں! میں نے اور ان صاحب، دونوں نے اسی جوتہ کو"

"دیکھا تھا، اور وہاں اس کی قیمت سات روپیہ بتائی "

"گئی تھی ——————— " میں نے جواب دیا۔

اس پر دوکاندار نے بے ساختگی کی طرف دیکھا، اُس شخص پر کچھ ایسی ندامت طاری ہوئی کہ اُس نے چپکے سے سات روپیہ نکال کر، دوکاندار کو پکڑا دئے، میں نے بھی سات روپیہ دوکاندار کو دے کر جوتا لے لیا، وہ شخص اور میں دونوں ساتھ ساتھ روانہ ہوئے، تھوڑی دُور پہنچکر اُس نے مجھ سے کہا :۔

" آپ نے مجھے دوکاندار کے سامنے جھوٹا بنا دیا "

میں نے جواب دیا :——————

" میں نے تو آپ کو جھوٹا نہیں بنایا، میں نے تو سچ "

" بات بیان کی تھی ۔ "

" اس پر وہ جوتہ کے ڈبّہ کو اُوپر اٹھاتے ہوئے بولا ——— "

" ارے بھئی! میں نے جو کچھ کہا تھا، اُس کی آپ کو تائید "

" کرنی تھی ۔ اس میں آپ کا بھی تو فائدہ تھا ۔ "

میں نے جواب میں کہا :——————

" میں فائدے کیخاطر جھوٹ نہیں بول سکتا "

اُس شخص نے جواب دیا :——————

" میاں! کہاں کے رہنے والے ہیں آپ! کیا آپ نے کچھ "

" بھنگ ونگ پی لی ہے - ان دوکانداروں سے کیا بالکل "

" حدیث و قرآن کے مطابق گفتگو کیجاتی ہے ، استغفر اللہ ! "

" جھوٹ کی ایک ہی ہی الو ہے کو لوہا کاٹتا ہے ، جناب "

" حق گو صاحب ! یہ دوکاندار بھی تو جھوٹ بولتے ہیں ، ان سے "

" سچائی کا معاملہ کر کے اپنے نقصان کے سوا اور کیا مل سکتا ہے "

" اور ایسی چھوٹی چھوٹی باتیں کہیں جھوٹ کی تعریف "

" میں آتی ہیں ، بھئی ! یہ نوجوان مسلمان بڑے ہی "

" سادہ لوح سے ہوتے ہیں - پیسہ کی تو قدر نہیں "

" کرتے ——————— "

" اجی حضرت ! اگر آپ اپنی عقلمندی سے دخل در "

" معقولات نہ فرماتے ، تو یہی جوتا ، پانچ روپیہ میں بیکر "

" چھوڑتا - اپنے ساتھ آپ نے مجھے بھی ڈبو دیا - اچھے "

" عقل کے کوٹھے سے جاکر پالا پڑا ہے شش ہش - توبہ ! - توبہ ! "

میں کچھ کہنا ہی چاہتا تھا ، کہ ہم سفر ساتھی کو کسی نے آواز دی ، اور وہ مجھے تیز نظروں سے دیکھتا ہوا چلا گیا - اُس کے جانے سے مجھے بڑی خوشی ہوئی ، کیونکہ اُس کی خشمگین نگاہیں ، مجھے کھائے جا رہی تھیں -

اُس دن کو پر ٹیو سوسائٹی کی طرف سے صبح کو سالانہ جلسہ تھا، اس لیے تمام دفاتر کے اوقات ایک بجے دن سے کر دیئے گئے تھے، مجھے بازار میں دیر لگ گئی، میں جب دفتر میں پہنچا ہوں تو ڈیڑھ بج چکا تھا، بڑے کمرے میں حاضری کا تختہ رکھا ہوا تھا، مجھ سے پہلے تین چار کلرک آ چکے تھے، میں نے کاغذ پر دستخط کر کے، اپنی آمد کا صحیح وقت (ڈیڑھ بجے) لکھ دیا، میرے بعد جو لوگ آئے، انہوں نے بے تکلف آمد کا وقت ایک بجے لکھا۔ ایک گھنٹہ کے بعد حاضری کا تختہ افسر متعلقہ کے سامنے پیش ہوا، اُس نے دیکھا کہ چوتھے نمبر کا شخص اپنی آمد کا وقت ڈیڑھ بجے لکھتا ہے، اور اس کے بعد سب لوگوں نے ایک بجے آمد کا وقت لکھا ہے۔ اُس نے مجھے بلا کر پوچھا، میں نے کہہ دیا کہ میں ڈیڑھ بجے ہی دفتر میں آیا تھا۔ اس پر اُس نے دوسرے لوگوں کو بلا کر دریافت کیا، سب نے کہہ دیا کہ ہم ایک بجے آ گئے تھے۔ افسر نے میرے بعد کے آئے ہوئے شخص سے دریافت کیا کہ تم منظور حسین سے پہلے آئے تھے یا بعد میں؟ اُس نے کہا کہ میں بعد میں آیا تھا۔ افسر نے تمام لوگوں پر دو دو روپیہ جرمانہ کر کے سخت انتباہی نوٹس جاری کیا، میں بھی چونکہ ڈیڑھ بجے یعنی آدھا گھنٹہ دیر سے آیا تھا، لہٰذا مجھ پر بھی جرمانہ کیا گیا۔

یہ کوئی ڈھائی بجے کا وقت تھا، جب سب لوگوں کو جرمانہ کا حال معلوم ہوا، تو سب نے مجھے آ کر گھیر لیا۔

"حضرت! آپ کو ڈیڑھ بجے وقت لکھنے"

"کی کیا ضرورت تھی" ——— ایک شخص نے کہا۔

"میں ڈیڑھ ہی بجے آیا تھا" ——— میں نے جواب دیا۔

" اجی ہاں! آپ ڈیڑھ ہی بجے تشریف "

" لائے تھے، مگر آپ کو لکھنا تو ایک "

" ہی بجے چاہیئے تھا ——— " وہی شخص تیز لہجہ میں بولا۔

" یعنی ایسی جھوٹ وقت لکھ دینا ——— " میں نے میز پر کہنی ٹیکتے ہوئے کہا۔

" اس میں جھوٹ کی کیا بات ہے، دس بیس "

" منٹ کے اختلاف کو کہیں جھوٹ کہتے ہیں " اُس نے جواب دیا۔

" جھوٹ تو ایک سیکنڈ کے اختلاف کو "

" بھی کہتے ہیں ——— " میں بولا۔

" بڑے آئے کہیں کے ایماندار اور سچے بن کر! "

" میاں، اور یا میں رہکر اور مگر مچھ سے بیر، یاد رکھئے "

" پورے دفتر سے بگاڑ کر، آپ مطمئن نہیں رہیں گے۔ "

" آپ ہی کے اس ظالم سچ کی بدولت، ہم پر جرمانہ "

" ہوا اور حاکم کا خیال بھی ہماری طرف سے خراب ہو گیا "

آخری جملہ کے آخری لفظوں کو کئی آدمیوں نے ایک ساتھ دہراتے ہوئے کہا، دفتر کا وقت ختم ہونے میں ڈیڑھ گھنٹہ باقی تھا، مگر مجھ پر ایک ایک منٹ بھاری گذر رہا تھا، تمام دفتر والے مجھے کڑے تیوروں سے دیکھ رہے تھے، اور بہت سے ماتھوں کی سلوٹیں مجھے بُرا بھلا کہہ رہی تھیں۔

مجھے ایسا معلوم ہو رہا تھا، جیسے میں خونخوار دشمنوں میں لا کر بٹھا دیا گیا ہوں۔

دفتر کے بعد میں بازار کے چوراہے پر پہنچا، وہاں سے مکان کے لئے تانگہ چکا ہی رہا تھا، کہ ایک صاحب نے پیچھے سے آ کر کہا:۔

"آپ کہاں جائیں گے جناب!"

"میں نے مڑ کر جواب دیا:۔۔۔۔۔۔

"میں مچھلی دروازہ جاونگا"

اُس شخص نے تانگہ والے کی طرف مخاطب ہو کر کہا:۔

"میں مچھلی دروازے سے ادھر ہی جاونگا، بیلی"

"مسجد کے قریب قریب!"

مجھ سے چار آنہ کرایہ طے ہوا، اور اس شخص سے تین آنہ، کیونکہ اُس نے تانگہ والے کو جو پتہ بتایا تھا، وہ مقام، مچھلی دروازہ سے ایک میل پیچھے تھا۔ تانگہ روانہ ہوا، اور وہ صاحب آپ ہی آپ ہنس ہنس کر بے تکلف سے ہو گئے، وہ راستہ بھر بکتے رہے اُن کی گفتگو!۔۔۔۔۔۔

"میرے چچا پشاور میں سب جج ہیں، انہوں نے شہر میں ایک"

"کوٹھی بھی بنائی ہے۔ اللہ نے چاہا تو آئندہ سال سشن"

"جج ہو جائیں گے۔"

"آج کا اخبار بھی دیکھا، آپ نے! چینیوں نے جاپانیوں کو ایسا"

" مار کر بھگایا ہے، کہ بیٹے یاد ہی کرتے ہونگے، ارے بھئی! یہ "
" افیم کھانے والے بھی غضب کے نکلے۔ "
" تم "گلزار سینما ہال" میں جاکر "جوانی کی بھول" جاکر "
" دیکھو، خوب کھیل ہے! امرت کنور کا ناچ دیکھنے کے "
" قابل ہے۔ بھئی! کیا حسین عورت ہے، اجی! اس عورت سے "
" ایک مرتبہ ضرور ملونگا۔ "
" دیکھئے! میری شیروانی کا کپڑا کتنا ملائم اور خوشنما ہے "
" میں نے یہ کپڑا دہلی سے تین روپیہ گز لیا ہے، یہاں تو "
" پانچ روپیہ گز بھی نہیں ملیگا۔ "
" میرے ایک ہی لڑکی ہے، سلیمہ نام ہے اُس کا، پیار میں "
" سب اُس کو "سلّو" کہتے ہیں، تین برس کی عمر ہے۔ "
" اُس کی! ذہین تو بلا کی ہے، کوئی بات بتادو، کبھی بھولے گی "
" ہی نہیں، یہ میں اُسی کے لئے کھلونے اور چوکلیٹ لئے جارہا "
" ہُوں، چوکولیٹ کا بھاؤ، کچھ تیز ہو گیا ہے۔ "
" دیکھئے یہ رومال میری بیوی نے کاڑھا ہے، پھُول کی "
" پتیوں کے تناسب کو دیکھئے، اجی! یہ تو آپ "

" ایک ذرا سا پھول دیکھ رہے ہیں، کہیں آپ اُس "
" کے ہاتھ کے کڑھے ہوئے تکیہ کے غلافوں اور میز "
" پوشوں کو دیکھیں، تو آپ حیرت میں رہ جائیں۔ "
" میں نے اس سال ڈربی کا ٹکٹ خریدا ہے "
" اگر نصیب نے یاوری کی تو وارے نیارے ہو جائیں گے "
" اس مرتبہ خربوزے بہت گراں رہے، اور پھر "
" میٹھے بھی نہیں ملے "
" کل سے اس شعر کے مزے لے رہا ہوں، نہ جانے کس "
" کا یہ شعر ہے ۔۔۔! "

" اظہارِ عشق اُس سے نہ کرنا تھا شیفتہؔ
یہ کیا کیا کہ دوست کو دشمن بنا دیا "

وہ شخص ایک زمین کی کہتا تھا اور ایک آسمان کی، ہر جملہ کے بعد اُس کا موضوع بدل جاتا تھا، میں خاموشی کے ساتھ اُس کی باتوں سے لُطف اٹھاتا رہا۔

جس جگہ کا اُس شخص نے تانگہ والے کو پتا بتایا تھا، اُس جگہ پر پہنچکر تانگہ والے نے تانگہ روک دیا۔ اس پر اُس شخص نے کہا:۔

" ارے بھئی! ذرا آگے اور چلو، تم "

" تو بالکل انچ اور گرہ کے حساب سے چلتے ہو "

وہ شخص تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد یہی کہتا رہا :-

" بس اب تھوڑی دور اور ہے، بس اب "

" وہ جگہ آگئی۔ "

یہاں تک کہ پھلی دروازہ آگیا۔ اور میں اور وہ دونوں اُتر گئے، میں نے تانگہ والے کو چار آنے

اور اُس شخص نے تین آنہ دئے۔

" حضور! آپ بھی چار آنہ دیجئے تین "

" آنہ تو پیلی مسجد تک کے ہوتے ہیں ———— " تانگہ والے نے کہا۔

" نالائق کہیں کا، ارے! کیا میں نے وہ جگہ تجھے "

" ناپ کر بتائی تھی، دس بیس قدم ادھر "

" اور اُدھر ہو ہی جاتے ہیں۔

" کیوں جناب! ٹھیک ہے نا! " وہی شخص، ابتدائی الفاظ تانگہ والے کی طرف،

اور آخری جملہ میری طرف دیکھ کر بولا۔

" آپ تو ٹھیک بات نہیں کہہ رہے، آپ کو "

" چار ہی آنہ دینے چاہئیں، ———— " میں نے جواب دیا

" حضور آپ کا بھلا ہو، کیا انصاف کی "

"بات کہی ہے" "تانگہ والے نے مجھے عقیدت واحترام کی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

اس پر اُس شخص نے اکنی جیب سے نکال کر پھینک دی، تانگہ والا اکنی اٹھا کر چلا گیا۔ اب یہ شخص مجھ پر برس پڑا:۔

"آپ نے میرے مقابلہ میں ذلیل تانگہ والے کی حمایت کی!"

"آپ کو ایسا کرنا نہ چاہیئے تھا" اُس نے مجھ سے کہا۔

"حق وانصاف کے مسئلہ میں، امیر وغریب اور شریف ورذیل"
"کا خیال نہیں کیا جاتا۔ میں نے جو کچھ کیا ٹھیک کیا۔" میں نے سختی کے ساتھ جواب دیا۔

وہ شخص اس پر تاؤ کھا کر رہ گیا، نہ معلوم کیا سوچ کر اُس نے کوئی جواب نہیں دیا، میں گھر چلا آیا۔ بیوی پر صبح کی خفگی کا اثر باقی تھا، میں کچھ یوں ہی سا کھانا کھا کر لیٹ گیا۔ میں نے بہت کچھ کروٹیں بدلیں مگر نیند نہ آئی، دن بھر کے تلخ تجربات میرے دل ودماغ پر چھائے ہوئے تھے، ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ جیسے میں نے اپنے دماغ کو پتھروں سے ٹکرایا ہے۔ میں بہت دیر تک دن کے واقعات پر تبصرہ کرتا رہا۔

اسی حالت میں مجھے نیند آگئی، ———

کیا آپ نے ایم اسلم کے افسانے پڑھے ہیں؟

تفسیر حیات
حصہ اوّل

قابل مصنف کے چالیس افسانوں کا مجموعہ ہے۔ ہمارا دعوے ہے کہ اردو زبان میں اس شان کی اور ایسی دلچسپ نتیجہ خیز کوئی کتاب طبع نہیں ہوئی۔ یہ کتاب دو حصوں میں شائع ہوئی ہے۔ حجم فی حصہ .. ۲ صفحات۔ پہلا حصہ شائع ہو گیا ہے۔ قیمت پہلا حصہ عہ

کارزار حیات } یہ بھی قابل مصنف کے چالیس افسانوں کا مجموعہ ہے، قیمت مجلد خوبصورت عہ

گناہ کی راتیں } یہ کتاب اپنے اچھوتے مضامین کے باعث اس قدر مقبول ہو چکی ہے کہ اسکا چوتھا ایڈیشن ہم نے طبع کیا ہے۔ جسمیں انسانوں کی سیاہ کاریوں کے وہ سات افسانے درج ہیں، جو نہایت دلچسپ اور سبق آموز ثابت ہوئے ہیں قیمت صرف عہ

ملک دین محمد اینڈ سنز پبلشرز و تاجران کتب بل روڈ کشمیری بازار لاہور

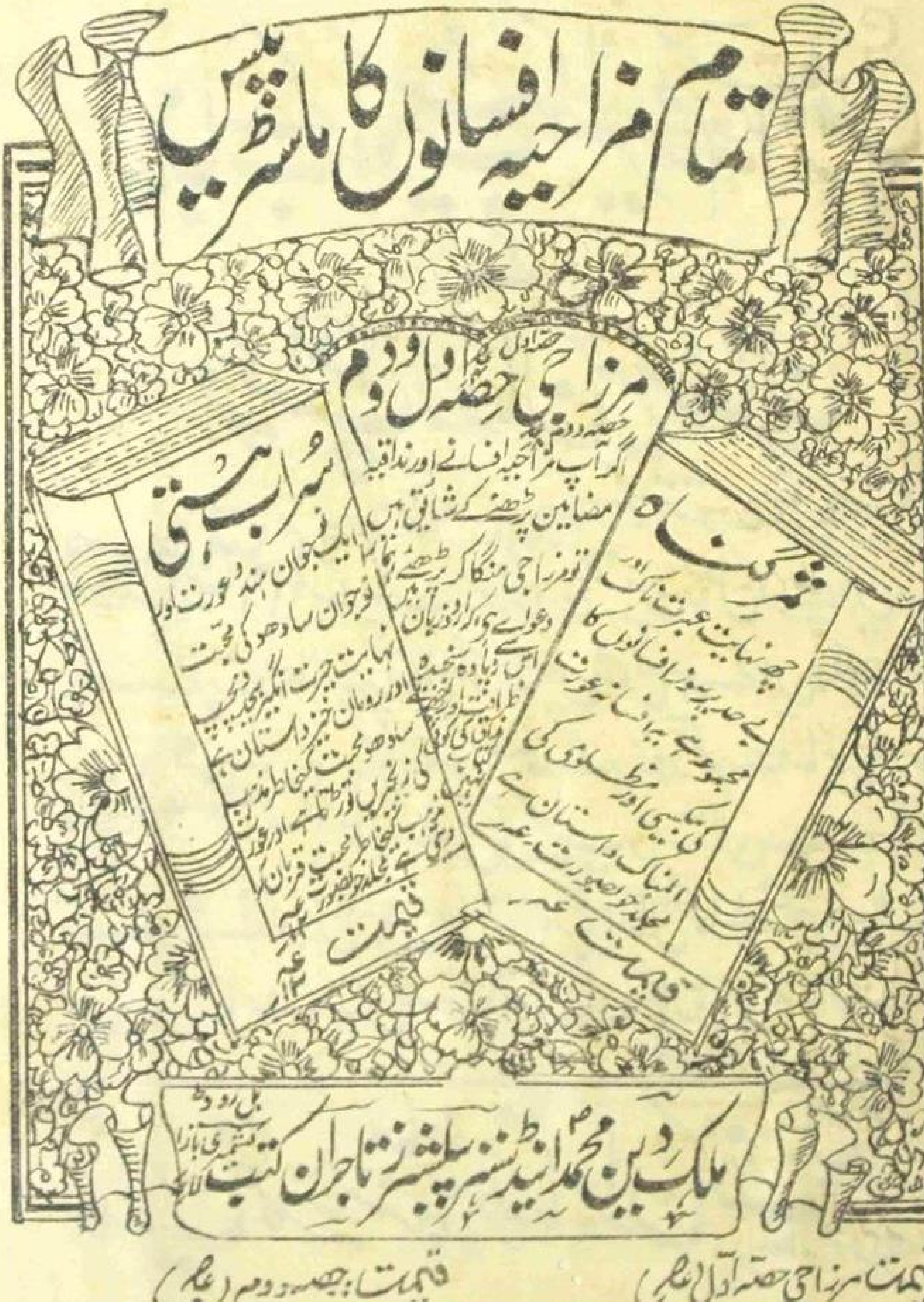

قیمت مرزا جی حصہ اول (عگر)
قیمت بالجھ حصہ دوم (عہ)

پنجاب کے ادیب شہیر ایم۔ اسلم

کے

دلچسپ اور رومان خیز مضامین

مضامینِ اسلم یہ وہ مضامین ہیں جو ملک کے مقتدر رسائل میں شائع ہو کر پبلک سے خراجِ تحسین حاصل کر چکے ہیں اب پبلک کے پرزور مطالبہ پر کتابی صورت میں شائع ہوئے ہیں۔ قیمت عہ

پیغامِ سروش یہ بھی ایم۔ اسلم کے پرزور قلم سے سپاہیوں اور انارکسٹوں کی دلچسپ داستان ہے جسے شروع کر کے چھوڑنے کو دل نہیں چاہتا تاریخی حقائق کو ایسے رنگین ہوشربا میں بیان کرنا صرف میاں اسلم کی جادو نگاری ہی کا کام ہے۔ قیمت عمر

ملک دین محمد اینڈ سنز پبلشرز تاجرانِ کتب بل روڈ
کشمیری بازار